عبداللہ حسین
سات رنگ

عبداللہ حسین

سات رنگ

●

جون ۱۹۸۲ء
سلسلۂ مطبوعات: پانچ

خطاط: جمال گیاوی

ناشر و طابع: عبد المغنی

طباعت: لبرٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دلی۔
سکرین: مسعود اینڈ کمپنی، ۲۱۱۶، کوچہ پنڈت، دلی۔
جلد ساز: یونیورسل بک بائنڈنگ کمپنی، کوچہ ناہر خاں، دریا گنج، نئی دلی۔

تقسیم کار:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ: نئی دلی، دلی، علی گڑھ، بمبئی۔
انجمن ترقی اردو (ہند): "اردو گھر"، راؤز ایونیو، نئی دلی۔
سٹار بک سینٹر: بی ۵/۴، آصف علی روڈ، نئی دلی۔

●

قیمت: چالیس روپے

Telephone : 644571

ڈی ۱۴، کیلاش کالونی، نئی دلی - ۱۱۰۰۴۸

نُور اور عَلِی کے نام

تزئین

●

ڈائرے: سونیارُوپ

●
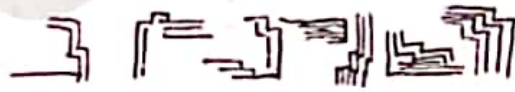
Hans Richter : *Drawing* : *Ink* : *1919*

●

Drawing on page 2 : *in Ink by* Amin al-Basha

●

Jacket Drawing from an Etching by Rashid al-Quraishi

تَرتیب

●

پُھول کا بَدن : نو

مہاجرین : تیئیس
جَلا وَطن : سینتالیس

ندی : اُنسٹھ
سمندر : نواسی

دُھوپ : ایک سو سترہ
رات : ایک سو سینتیس

بے تیشۂ نظر نہ چلو راہِ رفتگاں
ہر نقشِ پا بلند ہے دیوار کی طرح

——— مجروح سلطانپوری

پھول کا بدن

"اور؟" لڑکی نے پوچھا۔
"اونہوں۔"
"ایک پیالی اور۔"
"نہیں، شکریہ۔"
"ایک تو اور۔"
"ارے نہیں بھئی۔ ۔ ۔" اس نے تنگ آکر کہا: "تم جانتی ہو میں زیادہ چائے نہیں پیتا۔"
"نہیں۔"
"نہیں کیا۔"
"میں نہیں جانتی۔"
"کیا؟"
"میں آپ کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔"

"ایں ؟" وہ ہکا بکا رہ گیا۔

وہ اس لڑکی کو ایک مدت سے جانتا تھا۔ وہ اُس کے گھر والوں کو اور شوہر کو اور سب کو اتنی اچھی طرح سے جانتا تھا کہ اُن کے گھر کا ایک فرد تصور کیا جاتا تھا، اور اتنی مدت سے جانتا تھا کہ اُسے ٹھیک سے یاد بھی نہ رہا تھا، شاید اُس وقت سے کہ جب وہ اور اُس کنبے کا بڑا لڑکا سکول میں پڑھا کرتے تھے، اور دونوں کی کسی بات پر لڑائی ہو گئی تھی اور دونوں کو سزا ملی تھی، چھٹی کے بعد تک ایک تختی لکھتا رہا تھا اور دوسرا سکول کے پودوں کو پانی دیتا رہا تھا، اور بعد میں گلے میں بستے لٹکائے دونوں بظاہر ایک دوسرے سے بے خبر آگے پیچھے چلتے گھروں کو لوٹے تھے۔ پھر ایک دن کے بعد دونوں کی کسی بات پر صلح ہو گئی تھی اور دوستی کا آغاز ہوا تھا۔ اُس وقت وہ دوسری جماعت میں پڑھتے تھے، یا شاید اس سے بھی پہلے سے ——— جب ساتھ والے گھر میں نئے لوگ آئے تھے اور وہ دن بھر اُن کے دروازے پر کھڑا مردوں عورتوں اور بچوں کو اندر باہر آتے جاتے اور سامان کو منتقل ہوتے اور دروازے کھڑکیاں چٹاخ پٹاخ کھلتے، بند ہوتے اور گرد کے بادلوں کو اُٹھتے ہوئے دیکھتا رہا تھا؛ وہ صرف دوپہر کا کھانا کھانے کے لیے گھر گیا تھا اور پھر بھاگ کر وہاں آ کھڑا ہوا تھا اور دیکھنے لگا تھا ——— بچوں کی ماں نے ایک بار اُس سے پوچھا تھا کہ وہ کہاں رہتا ہے اور وہ چپ چاپ کھڑا دیکھتا رہا تھا۔ پھر عورت نے اُسے اندر آنے کے لیے کہا تھا اور وہ اس پر بھی ٹس سے مس نہ ہوا تھا اور نہ بولا تھا۔ عورت اس سے اُکتا کر اندر چلی گئی تھی۔ اُس کے بعد وہ کئی روز تک دُور دُور سے بچوں کو دیکھتا اور اُن سے مانوس ہوتا رہا تھا۔ اُسے اچھی طرح سے یاد بھی نہ رہا تھا کہ کب سے ———

"تم جانتی ہو . . ." اُس نے کہا: "اچھی طرح سے جانتی ہو۔"

"نہیں۔"

اور پہلی بار، تقریباً پہلی بار، اُسے اس قدر ضدی، سرکش اور قطعی لہجے میں بات کرتے ہوئے دیکھ کر اُس نے کئی بار آنکھوں کو جھپکا اور پھر انھیں پھیلا کر سامنے بیٹھی ہوئی اس لڑکی کو پہچاننے کی کوشش کی۔

شام ہو رہی تھی اور کسی نے ابھی تک بتی نہ جلائی تھی۔ دھندلکے کی نرم اور معدوم روشنی میں سفید چینی کے چائے کے برتن جھلملا رہے تھے اور وہ اُن پر جھکی ہوئی بیٹھی تھی۔ اُس کا ایک ہاتھ خالی پیالی میں چمچہ گھما رہا تھا اور دوسرا گود میں پڑا تھا اور اس کا سیاہ اور گھنے بالوں والا سر اُس کی نظر کے سامنے تھا۔ اُس کی آنکھوں میں کاجل اور ہونٹوں پر سرخی نہیں تھی ——— یہ سوچ کر کہ وہ اس لڑکی کو اتنے عرصے سے جانتا ہے، اُس کے دل میں ایک بے نام سی افسردگی کا احساس پیدا ہوا۔

"میرا نام نعیم ہے۔" اُس نے کہا۔

"اچ ——— چھا ؟" لڑکی نے چہرہ اُٹھایا جو مجسم تمسخر تھا۔

"تمھارا نام ثروت ہے۔"

"ٹھیک۔"

"پھر ؟"

"پھر کیا۔"

اُس نے کچھ اس طرح سے "پھر" کہا کہ وہ گویا بجلی کا جھٹکا لگنے سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اب ایک نامعلوم، لاچار غصہ اُس کے دماغ کو چڑھنے لگا۔ کمرے میں تاریکی تیزی سے بڑھتی جا رہی تھی۔ کھڑکی کے راستے ایک گزرتی ہوئی موٹر کی روشنیاں ایک لحظے کے لیے اُن کے چہروں پر پڑیں اور غائب ہو گئیں۔

"اٹھ کر بتی جلاؤ۔" اُس نے کہا۔

"نہیں۔"

"بتی جلاؤ۔" اس نے پھر کہا۔

"اندھیرا اچھا ہے۔" لڑکی کی گہری، مختصر ہنسی کی آواز آئی۔

اگر وہ اس لب و لہجے کا، اس رویے کا اُس سے ذرا بھر بھی متوقع ہوتا تو شاید اپنا دماغ نہ کھوتا۔ جب وہ بتی جلانے کے لیے اُٹھا تو گھٹنے کی ٹھوکر سے چائے کی میز اُلٹ گئی۔ بعد میں وہ اسی ایک واقعہ سے ——— یا کسی ایک واقعہ سے ——— یعنی ایک اوندھی پیالی اور تھوڑے سے دودھ اور تھوڑی سی چائے اور تھوڑی سی شکر کو فرش پر بکھرے ہوئے دیکھ کر یا شاید لڑکی کو اسی طرح چمچہ ہاتھ میں لیے خاموش اور خود مختار بیٹھے ہوئے پاکر یا شاید اس سے بھی پہلے، اندھیرے میں گرتے ہوئے برتنوں کے شور کو سن کر ہی ٹھنڈا پڑ گیا۔

"یہ تمھاری غلطی سے ہوا ہے۔" اُس نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اندھیرے میں . . ." وہ بولی: "چیزوں کی شکل بدل جاتی ہے۔"

"کیسے؟"

"نظر کا راستہ رُک جاتا ہے . . ." وہ پھر بولی: "پھر خیال چل نکلتا ہے۔"

"تمھارے سر میں کیا سما گئی ہے؟"

"ایک فائدہ . . ." اس نے کہا: "اس سے اور ہوتا ہے: آنکھوں کو آرام ملتا ہے۔"

"تمھارا دماغ چل گیا ہے۔"

وہ آکر کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔ واقعے کے اچانک پن نے اُسے دفعتاً بہت زیادہ تھکا دیا تھا۔ اتنا عرصہ ہو گیا تھا اور ہمیشہ اُس لڑکی کی موجودگی میں، محض اُس کے کہیں آس پاس ہونے کے خیال سے ہی ہمیشہ اُس کو بڑی سلامتی اور مہربانی اور فراغت کا احساس ہوتا تھا۔ اس لڑکی میں کوئی ایسی جان لیوا کشش نہ تھی جو دُنیا کی ساری اور لڑکیوں میں، دور و نزدیک، جان انجان، اور نام بے نام کی ایکو ایک لڑکی میں تھی، جس کی وجہ سے کہ اُس نے ایک عمر تک ایسے ایسے لا حاصل دُکھ اُٹھائے تھے کہ ایکو ایک لڑکی سے ایک عمر تک وہ بیک وقت خوف زدہ و مسحور رہا تھا، اور ایک وقت آیا تھا کہ اُسے اپنی شخصیت کو ثابت و سالم رکھنا محال ہو گیا تھا اور وہ خدا کی پیدا کی ہوئی ساری مخلوق میں سب سے خوشنما اور عمیق اور مکمل خلق ——— جوان عورت ——— سے بھاگا بھاگا پھرتا تھا۔ اس کو وہ سارا وقت یاد تھا؛ جب تک کہ اس کی شادی نہیں ہو گئی تھی، تب تک اس کو یہ بھی یاد تھا کہ گھوم پھر کر وہ ایک جگہ جہاں امن اور سلامتی اور مہربانی کا احساس ہوتا ہے اور وہ ایک جگہ جہاں وہ اپنی عمر و نظر کی بلوغت اور کھویا ہوا اعتماد دوبارہ حاصل کر سکتا ہے اور مکمل اور بے خطر آزادیٔ نفس کے ساتھ رہ سکتا ہے، اس لڑکی کے آس پاس تھی ——— وہ اس کو ایسی اچھی طرح سے جانتا تھا۔

"آج تم ہر ایک سے لڑنے پر تُلی ہوئی ہو۔" اُس نے کہا۔

"نہیں . . ." وہ بولی: "صرف آپ سے۔"

"تم محمود سے بھی لڑ کر آئی ہو۔"

"محمود میرا شوہر ہے۔"

"پھر؟"

"یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔"

"میں تمھارے ذاتی معاملے میں شامل نہیں ہوں ؟"

"نہیں۔"

"کیا ؟"

"آپ میرے ذاتی معاملے میں شامل نہیں ہیں۔"

"اس ؟"

"ہاں۔"

"اوہ ۔ ۔ ۔" وہ غصہ دباتے ہوئے بولا : "کیا ہی اچھا ہوتا اگر یہ سچ ہوتا۔"

"آپ میری کسی چیز میں شامل نہیں ہیں۔"

"تو پھر مجھ پر ایک مہربانی کرو : اِس بات کا سب لوگوں میں اعلان کر دو۔"

"کیوں ؟"

"میں تمھارا روز روز کا جھگڑا چکاتے ہوئے تنگ آ گیا ہوں۔"

"جھگڑے میں آپ خود پڑے ہیں۔"

"کیسے ؟"

"آپ نے میری شادی کرائی تھی۔"

"تو میں ۔ ۔ ۔ اِس کا قصوروار ہوں ؟"

"آپ اس میں شریک ہیں، بہرحال۔"

"میں قصوروار ہوں ؟" اس نے حیرت سے پھر پوچھا۔

"میں کچھ نہیں جانتی۔"

اتنے تھوڑے سے وقت میں اتنی ساری غیرمتوقع باتیں ایک ساتھ واقع ہوگئی تھیں کہ اُس کے ذہن کا وہ چمچماتا ہوا تیز حصہ جوان کے صدمے کو درج کرتا ہے، ایک دم کُند ہوگیا۔ وہ ساری باتوں کو چھوڑ کر دفعتہً فرش پر پھیلے ہوئے دودھ اور چائے اور شکر کے بارے میں سوچنے لگا۔ بڑی آسانی سے اٹھ کر چائے کے برتن اکٹھا کرتے اور انھیں طشتری میں رکھتے اور اوندھی میز کو کھڑا کرتے ہوئے اس کے اوپر گیلے قالین اور ٹوٹی ہوئی پیالی کا پورا المیہ اپنی تمام تر شدت اور مضحکہ خیزی کے ساتھ واضح ہوگیا۔ یہ لڑکی جو اُس کے سامنے ایسی ٹھوس خودمختاری کے ساتھ بیٹھی تھی، اور جو چاہتی تھی کر رہی تھی، جو چاہتی تھی کہہ رہی تھی ——— وہ ہمیشہ سے کہتی آئی تھی، اور ہمیشہ میں تیس سال سے اُوپر کا عرصہ آتا تھا ——— وہ اُسے خالی چینی کی پیالی کی مانند نازک اور بےزبان اور غیرمحفوظ معلوم ہوئی تھی ؛ وہ اُسے ایک عمر سے جانتا تھا، اور ایک عمر کے اندر وہ سارے زمانے آتے ہیں جو کسی کو جاننے کے لیے ضروری ہوتے ہیں، سب سے بڑا لڑکپن کا زمانہ جب ہمجولیوں کے ساتھ کھیلتے ہیں اور اتنا طول طویل کھیلتے ہیں کہ دیر سویر کی خبر نہیں رہتی اور دُور دراز ایسی ایسی جگہوں پر کھیلتے ہیں جو کسی کے علم میں نہیں ہوتیں اور ایسا ایسا گھر کھیلتے ہیں کہ ایک دوسرے کی بُوباس کے واقف ہو جاتے ہیں ؛ آنے والے سارے زمانوں پر اِس زمانے کی ایسی چھاپ لگ جاتی ہے کہ پھر عمر میں جب بھی کبھی کسی ایسے وقت یا ایسی جگہ میں سے اتفاقیہ گزر ہوتا ہے جو ان جگہوں سے، اُن چہروں سے، اُن ناموں سے بلکہ اُن گمشدہ آوازوں تک سے اور کبھی کبھی تو محض کسی بازو، کسی ہاتھ کے اُس واحد، نامکمل اشارے اور کسی آنکھ کی اُس مخصوص لمحاتی چمک سے ہی ذرہ بھر کا بھی میل کھاتی ہے جن سے کبھی آشنائی رہ چکی ہوتی ہے تو ذہن چشم زدن میں سارا فاصلہ طے کر وہاں جا پہنچتا ہے اور لوٹ

بھی آتا ہے! لڑکپن کے زمانے کا ایک ایک لمحہ عمر بھر کا احاطہ کرتا ہے —— اور وہ اس لڑکی کو اس زمانے سے جانتا تھا۔

"میں تنگ آ چکا ہوں۔" اس نے کہا۔

"کس بات سے؟"

"تمھارے جھگڑوں سے۔"

"آپ سے کس نے کہا تھا . . ."

"کیا؟"

". . . کہ جھگڑے میں پڑیے۔"

"مجھ پہ لازم آتا تھا۔"

"کیسے؟"

"ایسے کہ میں . . . کہ میں تمھارا . . . ہُنہ . . . ہنک!"

"کہیے، کہیے . . . آپ میرے کیا؟"

"میں تمھارے گھر کا ایک فرد ہوں، تقریباً۔"

"میرے گھر کے فرد اور بھی ہیں۔"

"اور اس لیے بھی کہ میں تمھاری شادی کرانے کا ذمہ دار ہوں۔"

"آپ سے کس نے کہا تھا؟"

"ہنک . . . لاحول ولا قوۃ . . . تمھارے گھر والوں نے کہا تھا بھئی۔"

"میں نے تو نہیں کہا تھا۔"

"تم نے . . . ارر . . . تمھیں تو پتا ہی تھا۔"

"آپ نے مجھ سے پوچھا تھا؟"

"اس سے بھلا . . ."

". . . کیا فرق پڑتا ہے؟ ٹھیک ہے نا . . .!"

"تو؟" وہ مری ہوئی آواز میں بولا۔

"تو آپ میرے کسی جھگڑے سے کسی قسم کا کوئی واسطہ نہ رکھیے۔"

اور عمر بھر کے علم کی بنا پر وہ کہہ سکتا تھا کہ اس لڑکی نے آج تک کسی موقعہ پر کبھی شخصی طور پر، ذاتی سطح پر ایسی بات نہیں کی تھی۔

"آپ آپ آپ . . ." اُس نے کہا: "یہ کیا گردان لگا رکھی ہے تم نے۔ سیدھی طرح سے بات کرو۔"

"آپ آپ آپ . . . بالکل ٹھیک ہے . . . آپ۔"

"اووو . . ." اس نے حلق سے گہری کربناک، بیزار کُن آواز پیدا کی۔

"اچھا تم . . ." وہ مسکرائی: "تم . . . ٹھیک ہے؟"

"اوو . . ."

یہ حیرت کی بات تھی، اِس لیے کہ اُس کو وہ وقت یاد تھا: وہ عمر کے اُس دَور میں سے گزر رہا تھا جب وہ ہر مت کا احساس کھو چکا

تھا، اور شاموں کو غیر آباد سڑکوں پر گھنٹوں اکیلا اکیلا پھرتے رہنے کے بعد اُن کے گھر آکر کرسی پر ڈھیر ہو جایا کرتا تھا، کبھی کبھی جب ہمسائیگی کی ——— دلوں کی ہمسائیگی کی ——— خواہش شدید ہو جاتی تھی، اور وہ گھر میں اکیلی ہوا کرتی تھی تو وہ سر اُٹھا کر کوئی نہ کوئی بات کیا کرتا تھا: ثروت! تم کو پتا ہے، میں کہاں کہاں سے ہو کر آیا ہوں؟" یا "یہاں آکر مجھ سے باتیں کرو بھئی . . . میں تھک گیا ہوں" یا "تم ہر وقت کام میں کیوں لگی رہتی ہو، باؤلی!" اور وہ اپنی آہستہ رَو، غیر جانبدار مصروفیت میں لگی اپنی کسی حرکت سے، کسی بات سے فوراً اُس کو اُس پُر امن سطح پر لے آتی تھی جس کا وہ متلاشی ہوتا تھا ——— پھر اس کے بعد وہ وقت جب اُس کی شادی ہوئی تھی اور اُس نے آکر پوچھا تھا: "ثروت، بلقیس تم کو کیسی لگی ہے؟" تو جواب میں وہ بولی تھی: "بڑی اچھی لگی بھائی، بہت اچھی لگی . . . " وہ ایسے لہجے میں بولی تھی جو اُس کو آج تک یاد تھا اور جسے محسوس کر کے اُس کا لہو سرد پڑ جاتا تھا، اس لیے نہیں کہ اُس میں کوئی حسد یا کوئی رنج تھا، اس لیے کہ اُس میں مشین کی سی یکسانیت تھی جو اس کے لیے غیر متوقع تھی ——— پھر اس کے بعد وہ وقت جب اُس کی بیوی نے وفات پائی تھی (ماں کے بعد دُنیا بھر میں صرف بیوی ہی ایک ایسا بشر تھی جس کے وہ کسی حد تک قریب آسکا تھا)؛ وہ اس حادثے میں یکسر کھو کر رہ گیا تھا اور ایک روز اس کے پاس بیٹھا بیٹھا بول اُٹھا تھا: "بی بی، کچھ تم ہی بتاؤ" اور اس نے جواب میں کہا تھا: "صبر کرو" اور وہ ان دو لفظوں کو جو ساری دُنیا نے اس کے سامنے دہرائے تھے اور جن میں ساری دُنیا کی سرد مہری اور لاتعلقی بھری ہوئی تھی، آخر اُس کی زبان سے بھی نکلتے سُن کر وہ سخت رنجیدہ ہو گیا تھا ——— وہ وقت اور اُس سے پہلے اور اس کے بعد کے بہت سے وقت؛ درحقیقت اُس کو بہت سے زمانے یاد تھے جن میں کہ وہ برابر کی شریک تھی۔

"تم سے ایسی باتوں کی توقع نہیں تھی بی بی" اس نے کہا۔

"بی بی . . . بی بی . . ." وہ پھٹ پڑی: "بی بی . . . ؟"

"ایں؟"

"جیسے میں بھیڑ ہوں یا بکری ہوں یا کیا ہوں . . . جس کا کوئی نام نہیں، کوئی کام نہیں . . . جس کا . . ."

"ثروت!"

"ہاں، یہ ٹھیک ہے . . . ثروت . . . یہ میرا نام ہے"

"ثروت!!"

"تم نے عمر بھر مجھے کوئی نام نہیں دیا کبھی . . . میرے وجود تک کو تسلیم نہیں کیا کبھی . . . مجھے کچھ بھی نہیں سمجھا . . . کچھ بھی نہیں . . ."

"کچھ بھی نہیں؟" اُس کا مُنہ کھلا رہ گیا۔

"میرے نام کو تم پکارتے رہے ہو اور برابر بے خبر رہے ہو، برابر"

"کس سے بے خبر رہا ہوں؟"

"مجھ سے . . ." وہ چیخی: "مجھ سے!"

"میں کچھ سمجھا نہیں ثروت"

"تم نے کبھی محسوس نہیں کیا کہ میں بھی کوئی ہوں، تمھاری طرح، دوسروں کی طرح، ایک انسان . . . اور دیکھتی بھالتی ہوں، سوچتی ہوں، محسوس کرتی ہوں، کوئی وجود رکھتی ہوں، جیسے ہر کوئی رکھتا ہے، جیسے تم رکھتے ہو۔"

"مگر ثروت . . . میں ہمیشہ تمھارا . . ."

"ہمیشہ میرا خیال رکھتے رہے ہو؟ ٹھیک ہے۔ ہمیشہ میرے آس پاس رہے ہو؟ ٹھیک ہے۔ مجھ سے اتنے مانوس،

اتنا قریب رہے ہو؟ یہ بھی ٹھیک ہے۔ مگر کتنے بے تعلق رہے ہو!"
"سراسر غلط ہے، سراسر۔ ۔ ۔ تم بے تعلق رہی ہو۔ ۔ ۔"
"میری بدقسمتی یہ ہے نعیم کہ تم مجھے اُس وقت سے جانتے ہو جب میں ایک کرتہ پہن کر ننگے پاؤں گلیوں میں بھاگا کرتی تھی اور تم مجھے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹا کرتے تھے۔ ۔ ۔ تم مجھ سے اتنے مانوس، اتنے غافل تھے۔ ۔ ۔ اور ہمیشہ رہے ہو۔ ۔ ۔ اور میں اسی مانوسیت کے حجاب میں عمر بھر لاتعلق بنی رہی ہوں۔"
"غلطی تمھاری تھی۔"
"غلطی نہیں، مجبوری۔"
"یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ ۔ ۔" اُس نے کہا: "بچپن کی دوستی کا نتیجہ اس طرح کیسے نکال رہی ہو!"
"بچپن کی دشمنی کا تو کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ ۔ ۔ دشمنی نادانی ہوتی ہے، دوستی ظلم ہوتی ہے۔ ۔ ۔ میری طرف دیکھو، اوپر سے نیچے تک دیکھو۔ ۔ ۔ تم نے آج تک نظر بھر کر میری طرف نہیں دیکھا۔ ۔ ۔ میں ایک عورت ہوں، ایک مکمل شخصیت ہوں۔ ۔ ۔ تمھیں کبھی اس کا خیال آیا ہے؟"
"میں کبھی تم سے غافل نہیں رہا۔"
"درست ہے۔ ۔ ۔ تم ہمیشہ میرے بارے میں بڑے باخبر رہے ہو، اسی طرح جیسے اس کرسی یا اس میز یا اس کھجور کے پیڑ کے بارے میں باخبر رہے ہو۔ ۔ ۔ کبھی تم نے آج تک مجھ کو وہ سمجھا ہے جو میں ہوں؟"
"میں نے ہمیشہ تم کو ثروت سمجھا ہے، جاوید کی بہن، ایک نہایت عزیز ہستی، ایک معقول شریف لڑکی۔ ۔ ۔"
"معقول شریف لڑکی۔ ۔ ۔" وہ ہوا میں ہاتھ پھینک کر بولی: "تمھیں پتا ہے اِس کا مطلب؟ جہاں ہم رہتے ہیں وہاں معقول شریف لڑکی اللہ میاں کی گائے ہوتی ہے جس کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ جو حیوان مال ہوتی ہے، جو محض فرض کر لی جاتی ہے، محض قبول کر لی جاتی ہے اور نظر انداز کر دی جاتی ہے اور مستقل نظر انداز کی جاتی ہے، مستقل۔"
"تم خواہ مخواہ مبالغے سے کام لے رہی ہو، ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو۔ ۔ ۔"
"عمر بھر کی پس و پیش کے بعد دل ٹھنڈا نہیں رہتا اور نہ سوچ رہتی ہے۔ ۔ ۔ تم لوگ ہمارے ساتھ ایسا خراب سلوک کرتے ہو۔ ۔ ۔"
"ہم لوگ؟"
"ہاں۔ ۔ ۔" وہ بولی: "تم لوگ۔"
"اوہ ثروت۔ ۔ ۔" اُس نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا: "اس میں میرا کیا قصور!"
"تمھارا قصور۔ ۔ ۔" وہ بولی: "محمود تمھارا دوست تھا اور تم نے میری شادی ٹھہرائی تھی۔ ۔ ۔ تم مجھ سے پوچھ نہیں سکتے تھے؟"
"پوچھنے کے لیے تمھارے گھر والے جو موجود تھے۔"
"گھر والے۔ ۔ ۔" وہ بولی: "گھر والے کیا ہیں۔ ۔ ۔ وہ تو محض گھر والے ہیں۔"
"کیا مطلب؟"
"گھر والے اہم نہیں تھے۔ ۔ ۔ اہم تم تھے۔"
"کیسے؟"

"میرے لیے۔"

"ثروت . . ." وہ جیسے زندگی میں پہلی بار چونک اُٹھا ہو: "مَیں تمھارا مطلب نہیں سمجھا۔"

پھر وہ اُس کی خاموش، بیباک نظروں سے اپنا جواب حاصل کر کے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور ندامت سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

وہ اُٹھ کر کمرے میں پھرنے لگی۔

"نعیم، عورتوں میں بڑا صبر ہوتا ہے اور بڑی شرم ہوتی ہے، اتنی کہ مَیں اب تک آنکھ مِلا کر تم سے بات نہیں کر سکتی تھی . . . لیکن اب وہ وقت آ گیا ہے کہ جب آدمی، عورت ہو کہ مرد، اتنا کچھ بھگت چکا ہوتا ہے کہ نہ شرم رہتی ہے نہ صبر . . . مَیں بتّیس برس کی ہو چکی ہوں اور مَیں نے زندگی کی ساری ڈھکی چھپی شکلوں کو دیکھ لیا ہے۔"

"ثروت!"

"مَیں نے سمجھا تھا کہ دُنیا بہت بڑی ہے؛ اِس میں پیٹ کے مسئلے ہیں اور ہر روز کی زندگی کے جو بہت اہم ہیں . . . مَیں سب کچھ بھول جاؤں گی . . . عورت اپنا سر بلند رکھنے کے لیے آخر دم تک اپنے آپ کو اور دوسروں کو دھوکا دیتی رہتی ہے! یہ مت سمجھو کہ مَیں محمود کو کسی بات کا ملزم ٹھہرا رہی ہوں! میرا شوہر بہت اچھا آدمی ہے! اُس نے کبھی مجھے دُکھ نہیں دیا . . ."

وہ اُٹھ کھڑا ہوا، لیکن پھر بیٹھ گیا۔

وہ کمرے میں پھرتی رہی: "دس سال کا عرصہ گزر گیا ہے اور مَیں آج تک اُس سے کھل کر بات نہیں کر سکی . . . یقین جانو، مَیں نے کوشش کی ہر روز، ہر رات . . ."

"خدا کے لیے چُپ رہو۔"

"ہر رات، ہر ہر لمحے مجھے احساس رہا ہے کہ کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی وقت، کوئی نہ کوئی شے، بہر حال کھوئی گئی ہے، چھُٹ گئی ہے، ضایع ہو گئی ہے . . . اس کی کھٹک میرے دل میں برقرار رہی ہے ہمیشہ ہمیشہ . . . وہ شے جس کے چھٹ جانے سے انسانوں کے درمیان دیانت داری ختم ہو جاتی ہے . . . پھر ایک روز جب سانس بھی سینے میں رُکنے لگتی ہے تو دل میں خیال آتا ہے کہ یہ سب اس قدر فضول ہے، فضول، فضول، لاحاصل . . ."

"ثروت بیگم . . ." اُس نے کہا: "زندگی کی گاڑی کو اب موڑا تو نہیں جا سکتا۔"

"مگر اس دُکھ کو تو ختم کیا جا سکتا ہے۔"

"کیسے؟"

"نعیم . . ." وہ بولی: "میرے حلق میں ایک پھانس ہے۔"

"مگر مَیں کیا کر سکتا ہوں؟"

"مجھے آزادی چاہیے۔"

"کیسے . . ." وہ چیخ کر بولا: "کیسے؟"

پھر اُس کی خاموش بے باک نظروں اور ہوا میں پھیلے ہوئے، بولتے ہوئے، فریاد کرتے ہوئے مایوس، بے حجاب ہاتھوں کو دیکھ کر وہ سُن رہ گیا۔

؛

جب رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تو اُس نے سوچا کہ محبت کی بھی بہت سی قسمیں ہیں: ایک وہ ہے جو ہمیں نادار کرتی ہے —— مگر محبت آخر محبت ہے جو کچھ بھی اور کیسی بھی ہو، آدمی کو اپنے آپ سے الگ کرنے اور کہیں نہ کہیں پہنچانے پر حاوی ہے، بہر حال۔

جب رات ابھی شروع ہی ہوئی تھی تو اُس نے صرف ایک سوال کیا تھا: "تم ہمیشہ ننگے بدن سوتی ہو؟" اور جواب میں وہ آہستہ سے بولی تھی: "شی . . ."، جیسے ماتمی مجلسوں یا مقدس مزاروں پر سوال کرنے والے بچوں کو چپ کرایا جاتا ہے —— اور یوں یہ وہ واحد کلمہ ثابت ہوا تھا جو رات بھر میں اس کے مُنہ سے نکلا تھا، اور اُس نے ذرا حیرت سے سوچا تھا کہ عورت کی بھی کتنی مختلف قسمیں ہوتی ہیں: ایک تو یہ تھی جو آج کے دن تک اُس کے لیے بے جنس و کشش رہی تھی؛ درحقیقت اس بلا کی جاندار اور روشن تھی کہ پل کے پل میں اُس کو کہاں سے کہاں لے گئی تھی —— جب عورت اور محبت کا میل ہوتا ہے تو ایک کرشمے کا ظہور ہوتا ہے جس کے واسطے سے، بلندی کا ہو کہ پستی کا ہو، زندگی کا ایک تجربہ ہوتا ہے جو عظیم اور معرکہ خیز ہوتا ہے، اس لحاظ سے کہ آدمی کو اپنے آپ سے الگ ہو کر زندگی کی بلند سے بلند اور پست سے پست شے کو، ایک لمحے کے لیے ہی سہی، ایک سطح پر، ایک نظر میں دیکھنے اور اس کو خود میں جذب کرنے اور پھر خود کو کائنات میں کھونے اور ساری جاندار اور بے جان چیزوں کے ساتھ ایک ہونے، ایک لمحے کے لیے ہی سہی، ایک ہونے اور اپنے آپ کو عظیم اور قوی اور لافانی ذات واحد خیال کرنے کی اہلیت بخشتا ہے —— اس بات کا اسے علم ہوا تھا۔ وہ یہ سمجھے ہوئے تھا کہ اب تک وہ پیدائش سے لے کر شادی اور شادی سے لے کر موت تک، زندگی کی ساری تاریخ اور ساری اونچ نیچ اور سارے دکھ اور ساری راحت سے آشنا ہو چکا ہے، اور اب کوئی بات، کوئی چیز بھی اُسے چونکا نہیں سکتی —— وہ یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا تھا کہ وہ لمحہ، وہ ایک لمحہ جو اس کے سن بلوغت کو پہنچنے کے بعد ہزاروں بار اُس پر آیا تھا اور کبھی پریشانی، کبھی پشیمانی اور کبھی محض لذت دے کر گزر گیا تھا، اس لمحے میں جب محبت شامل ہوتی ہے، اور عورت کے بدن کی ساری رضامندی شامل ہوتی ہے تو ناداری کا وہ عظیم لمحہ بھی آدمی کو قوت اور اختیار، اور لافانیت۔ کے اُس نشے، اور فنافی الذات کی اُن بلند گہرائیوں تک پہنچانے پر قدرت رکھتا ہے جہاں پہنچ کر وہ سرور اور طاقت کی آگ میں پگھل جاتا ہے اور پھیل کر ساری کائنات کو لپیٹ میں لے لیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اب وہ ہی وہ ہے، اور کچھ نہیں ہے، اور کچھ بھی نہیں ہے! جب بدن بدن سے خطاب کرتا ہے اور ہار جاتا ہے تو لہو لہو سے ہمکلام ہوتا ہے، اور جب لہو سرد پڑ جاتا ہے، محبت جب بھی رہتی ہے، اچھے وقت کی یاد کی طرح جو دراصل اچھے وقت کی نسبت، جس کے واسطے سے کہ وہ ہوتی ہے، زیادہ خوش کن اور پائیدار ہوتی ہے لیکن جس کے وجود کے بغیر جو وجود میں نہیں آسکتی! محبت جب بدن بدن کا مخاطبہ انجام پاتا ہے اور لہو لہو سے مکالمہ ترک کرتا ہے، باوجود اور بدستور رہتی ہے مگر اپنا وجود بدن بدن کے اُس رشتے سے حاصل کرتی ہے جو لہو کی گرمی پر قائم ہوتا ہے اور جس کے واسطے سے باقی سارے رشتے ہوتے ہیں، کہ ایک پھول جو اپنی زمین کی مرطوب حدت پر قائم ہوتا ہے، سب سے فی الواقعہ وجود ہوتا ہے اور گو کہ اس کی خوشبو لطیف تر اور حسین تر اور اعلیٰ تر ہوتی ہے اور حصے میں خانہ بدوش کی سی آزادی اور خود مختاری اور خود کامی اور ہرن کی سی وحشت اور رفتار اور تفاخر لے کر پیدا ہوتی ہے، پھول کے بدن کے واسطے کے سوا کوئی واسطہ دُنیا میں کسی سے اور کوئی وجود دُنیا میں کبھی نہیں رکھتی بہر حال، اس بات کا اس کو علم ہوا تھا —— مگر اب وہ لمحہ گزر چکا تھا اور اب وہ اپنا فاتح اور پُر سکون جسم بستر پر پھیلائے چاروں شانے چت لیٹا چھت کو گھورے جا رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں تاریکی سے مانوس ہو چکی تھیں اور تھوڑے تھوڑے وقفے پر وہ ایک چھپاتی ہوئی بے دھیان نظر اُس پر ڈال لیتا تھا جو اب اُس سے منہ موڑ کر لیٹ گئی تھی اور دیوار کو تکے

جاری تھی، اور اس کا لمبا تاریک بدن جس کو ڈھانپنے کی بھی اُس نے تکلیف نہ کی تھی، مسلسل جھرجھرا رہا تھا اور وہ ہلکی ہلکی گہری اور ملفوف اور نامانوس آوازوں میں ہنسے جا رہی تھی، ہنسے جا رہی تھی، یا شاید روئے جا رہی تھی ——— اس نے کئی بار چاہا کہ اٹھ کر دیکھے، یہ ہنسنے کی آواز تھی یا کہ رونے کی، مگر کوشش کے باوجود وہ ایک بازو، ایک انگلی تک نہ ہلا سکا اور اسی طرح اپنا فاتح پرسکون جسم بستر پر پھیلائے دل میں موت لیے پڑا رہا۔

یوں بتیس برس کی عمر پانے اور اس کے سرد و گرم سے گزرنے کے بعد اس کو ——— وہ جو دیوار کی طرف منہ کیے لیٹی تھی ——— آخر اس بات کی خبر ہوئی کہ دنیا میں آدمی اپنی قسمت کا لکھا یا اپنے کرموں کا پھل نہیں، صرف اپنی پیدائش کا صلہ پاتا ہے؛ جو خواہش پوری ہو جاتی ہے، اور وہ جو حسرت بن جاتی ہے، کوئی بھی ہمیں کچھ نہیں دیتی، صرف غریب کر جاتی ہے؛ دونوں کو ہم ایک ساتھ بھگتتے ہیں، کہ ایک بار دلوں کی ہمسائیگی ختم ہو جاتی ہے تو پھر جسم کی قربانی سے نہیں لوٹتی ——— شاید وہ رو رہی تھی، آخر کار۔

صبح وہ ناشتے کی میز پر اُس کے سامنے اس وقت تک بیٹھا رہا جب تک کہ اس کی ماں نے آکر برتن نہ اٹھا لیے۔ متعدد بار اُس نے بات شروع کرنے کی کوشش کی مگر الفاظ اس کی پکڑ میں نہ آئے۔

"ثروت۔" آخر اُس نے کہا۔

"چلو چلیں . . ." وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"ثروت۔"

"چلو چلیں . . ." وہ بولی: "اُٹھو . . ."

اُس کی ماں کو سلام کر کے اور اُسے ساتھ لے کر وہ باہر نکل آیا۔

"جاوید کا خط آیا ہے . . ." وہ اُسے بتانے لگی: "اگلے ہفتے آ رہا ہے۔ اب کے وہ آماں کو ساتھ لے جائے گا۔ پھر گھر خالی ہو جائے گا۔ شاید بند کر دیا جائے۔ یا کرایے پر دے دیا جائے . . . آج دھوپ کتنی سرد ہے۔"

"ثروت۔"

"وہ دیکھو، دو لڑکیاں گر پڑی ہیں . . . ایک سائیکل پر دو لڑکیاں کیوں چڑھتی ہیں؟"

"ثروت . . ."

"شی . . ."

"ثروت!"

"نہیں نعیم . . ." وہ بے حد تھکے ہوئے لہجے میں بولی: "خدا کے لیے چپ رہو۔"

وہ چپ رہا، مگر برابر اُس کو دیکھے گیا۔

"پیدل چلیں یا بس پر؟" وہ بولی۔

"جیسے تمھاری مرضی۔"

"پیدل چلتے ہیں۔ فاصلہ ہی کتنا ہے۔"

"ہاں۔ فاصلہ ہی کتنا ہے۔"

"بے سود!"

"ہونہ۔۔۔؟"
"سب بے سُود ہے، بے سُود۔"
"ایں؟"
"لاحاصل۔ فضول۔ فضول۔"
"نہیں ثروت، رُکو، میری بات سنو۔۔۔"
"تم لوگ ہمارے ساتھ ایسا سلوک کرتے ہو۔۔" وہ بددلی سے بولی: "میرا گھر آگیا ہے۔"
وہ ٹھٹک کر رُک گیا ——— جب وہ اس کے گھر کے دروازے کی طرف بڑھنے لگا تو وہ پلٹ کر کھڑی ہوگئی: "تم اب جاؤ۔"
"کہاں؟"
"جاؤ۔"
"مگر ثروت۔"
"نہیں نعیم۔۔" وہ بولی: "اب تم جاؤ۔"

گھر کے اندر محمود صوفے پر بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔
وہ کرسی پر بیٹھ گئی، پھر اس نے اپنا سر کُرسی کی پشت پر ٹیک دیا اور آنکھیں بند کرلیں۔
کچھ دیر کے بعد جب وہ دوپہر کے کھانے کی تیاری کر رہی تھی اور اس کا خاوند پاس بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا تو وہ کوشش کر کے مسکرائی اور بولی: "آج دفتر نہیں گئے؟"

مہاجرین

تیس برس قبل ایک حادثہ پیش آیا تھا جس نے آفتاب کی زندگی کو جکڑ کے رکھ دیا تھا۔ یہ کہانی اُس حادثے کی کہانی ہے ——— جہاں تک حادثے کی نوعیت کا تعلق ہے، کہا جاتا ہے کہ کوئی حادثہ بندھی ٹکی حدود کے اندر رواقع نہیں ہوتا، اور نہ ہی ختم ہوتا ہے، بلکہ اس کی جڑیں آگے اور پیچھے، دُور دُور تک ان دیکھے علاقوں میں پھیلی ہوتی ہیں؛ اسی طرح جیسے آدمی کی زندگی وقت کی رسّی کے اندر اس طرح سے بٹی ہوئی ہوتی ہے کہ اس کے سرے نظر نہیں آتے، ہر چند کہ عمر کی حدود کے اندر قرار پاتے ہیں، تاہم آدمی کی ایک عمر بھی ایسی شے ہے جو اس کا کُل سرمایہ ہوتی ہے، اور کبھی کہانی کی بنیاد کسی حادثے کی واقعیت پر بھی رکھی جاسکتی ہے، چنانچہ یہ کہانی بھی آفتاب کی زندگی کے صرف دو دنوں پر مشتمل ہے، گویہ اور بات ہے کہ اِن دو دنوں میں تیس برس کا وقفہ ہے۔

بِیس جُون، ۱۹۴۰ء

دن ڈھلنے لگا تھا مگر تپش کا وہی عالم تھا۔ آسمان جو شاید کسی اور موسم میں شوخ نیلے رنگ کا ہوتا، اس وقت جاڑی کے گرم تختے کی مانند دہک رہا تھا کہ اوپر نظر نہ اُٹھتی تھی۔

شیخ عمر دراز اپنے بیٹے کے ہمراہ ظہر کی نماز پڑھ کے مسجد کی چٹائی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ اُن کے بُوٹ پہلو کے بل تلے سے لا جڑے رکھے تھے؛ اوپر ان کا خاکی سولا ہیٹ بوٹوں کو ڈھانپے ہوئے پڑا تھا۔ شیخ عمر دراز نے جھک کر اپنی دونوں چیزیں اُٹھائیں اور باہر کو چل پڑے۔ لڑکا اپنی چپلی باہر ہی چھوڑ گیا تھا۔ وہ صحن کی حد پر پہنچ کر بیٹھ گیا اور چپلی پہننے لگا۔

باہر نکلنے سے پہلے شیخ عمر دراز نے اپنا بڑا سا چوکور رومال ٹونٹی کے نیچے رکھ کر پانی سے تر کیا اور نچوڑ کر سر پر پھیلا لیا۔ پھر اس کے اُوپر انھوں نے احتیاط سے سولا ہیٹ جمایا۔ سفید رومال چھوٹے تولیے کے سائز کا تھا جس نے گردن کی پشت اور دونوں کانوں کو ڈھک لیا تھا۔ ماتھے پر کپڑا آنکھوں سے اوپر اوپر لہرا رہا تھا۔ ایک نظر دیکھنے پہ معلوم ہوتا تھا جیسے ہیٹ کو جھالر لگی ہو۔

شیخ عمر دراز کا رنگ سُرخ و سفید تھا اور ان کے چہرے کو دیکھ کر ذہن میں وہ پرانی پرانی تصویریں اُبھرتی تھیں جن میں انگریز افسر نیکریں یا برجیس پہنے، سر پہ اسی صورت رومال اوڑھ ہیٹ لگائے، اگرم صحرائی علاقوں یا جنگلوں میں کھڑے ہوتے تھے۔ شیخ عمر دراز کے چہرے پہ تاثر بھی کچھ ایسا ہی تھا جیسا تصویروں میں انگریز افسروں کے چہروں پہ ہوتا تھا —— یعنی انھیں دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ وہ روزمرہ کی دُنیا سے ذرا ہٹ کر واقع ہوئے ہیں، گویا ایک متوازی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

شیخ عمر دراز کی نوعمری کی دشت نوردی نے صرف یہی دو نشانیاں چھوڑی تھیں: ایک جھالر والا ہیٹ، دوسری اُن کے چہرے پر وہ دُور کی جھلک —— چہرے سے نیچے وہ ایک عام آدمی کا نقشہ تھے۔ سفید شلوار قمیض اور بُوٹ۔ صرف سردیوں میں کبھی کبھی وہ خاکی برجیس اور فل بوٹ پہنا کرتے تھے؛ برجیس پہن کر وہ گھوڑے کی سواری کرنے کے بجائے سائیکل پر چڑھ کر اپنے دفتر جایا کرتے تھے، یا شام کو چھڑی ہاتھ میں گھماتے ہوئے اپنی زمین کا پھیرا لگاتے تھے۔

مسجد سے باہر نکلے تو دونوں باپ بیٹے کے منہ پر گرم ہوا کے تھپیڑے آ کر پڑے۔

"آفتاب . . ." شیخ عمر دراز اپنے بیٹے سے بولے: "گھر چلے جاؤ۔ مَیں زمین سے ہو کر آتا ہوں۔"

"بابا اس وقت؟" بیٹے نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ہاں . . ." وہ بولے: "کچھ کام ہے۔"

"مَیں بھی جاؤں گا۔"

"اونہوں۔ لُو چل رہی ہے۔ تم گھر جاؤ۔"

"بابا، مَیں تولیہ لے آتا ہوں . . ." بچّے نے ضد کی: "آپ مجھے ساتھ لے چلیں۔"

چند لمحے بے یقینی سے اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد شیخ عمر دراز راضی ہو گئے۔

"تولیہ گیلا کر کے لانا۔" انھوں نے گھر کی جانب بھاگتے ہوئے بچّے کو آواز دی۔

چند منٹ میں آفتاب گیلے تولیے سے سر اور مُنہ ڈھانپے واپس اُن کے پاس آ پہنچا۔ پھر وہ دونوں وہاں سے چل

Scanned by CamScanner

پڑے ——— گلیوں کی سوکھی سفید دیواریں دھوپ میں تمتما رہی تھیں ، گرم ہوا کہیں سے چکراتی ہوئی آتی اور ان دیواروں سے ٹکرا کر آگ کی طرح اچھلتی ۔ دونوں تیز تیز چلتے ان گلیوں سے نکل گئے ۔ ان کے دلوں میں اس وقت صرف ایک بات کا خیال تھا کہ کس طرح جلد سے جلد وہ شہر سے نکل کر پکی سڑک پہ پہنچ جائیں جہاں سایہ دار درخت تھے ——— پانچ دس منٹ میں وہ شہر کی حدود تک پہنچ چکے تھے ۔

شہر اس وقت سنسان پڑا تھا ۔ یہ شہر گو ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر تھا مگر مختصر سا دیہاتی مزاج کا شہر تھا ۔ چند مقام اس شہر میں ایسے تھے جو اسے ایک قصبے سے ممتاز کرتے تھے : ایک بازار ، ایک ہسپتال ، جامع مسجد و عیدگاہ ، ایک ضلع کچہری ، ایک سنیما ، ہارس شو گراؤنڈ و جلسہ گاہ ، ایک انٹرمیڈیٹ کالج ، دو ہائی سکول ——— شہر کے وسطی مقام سے کسی بھی رخ بیس منٹ تک پیدل چلیں تو شہر کی حد ختم ہو جاتی تھی اور کھلی زمینیں اور کھیت شروع ہو جاتے تھے ۔

جرنیلی سڑک پہ پہنچ کر شیخ عمر دراز اور ان کا بیٹا آسانی سے سانس لینے لگے ۔ سڑک کے دونوں جانب ٹاہلی اور شرینہ کے درخت تھے جن کے گھنے سایے میں ہوا کی حدت حل ہوتی ہوئی معلوم ہوتی تھی ۔

سڑک پر وہ ابھی چند قدم ہی چلے ہوں گے کہ پیچھے سے ایک تانگہ آ کر ان کے پاس رکا ۔

" آؤ شیخ جی ۔ ۔ " تانگے والا اگلی سیٹ پر ہاتھ مار کر اسے صاف کرتے ہوئے بولا : " زمین کی طرف چلے ہو ؟ "

" ہاں قربان ۔ ۔ " شیخ عمر دراز نے جواب دیا : " تم چلو ، ہمیں دو قدم پر ہی تو جانا ہے ۔ "

" دو قدم ہوں یا چار قدم حضور ، یہ گھوڑا تانگہ آپ ہی کا تو ہے ۔ " وہ نیچے اتر کر کھڑا ہو گیا ۔

تانگے میں دو سواریاں بیٹھی تھیں ۔ ایک کسان آگے بیٹھا تھا اور سفید چادر میں لپٹی ہوئی اس کی عورت پیچھے بیٹھی تھی ——— شیخ عمر دراز اگلی سیٹ پر چڑھ کر بیٹھ گئے اور آفتاب خوشی خوشی پیچھے عورت کے ساتھ جا بیٹھا ، عورت ایک کونے میں سمٹ گئی ، تانگے والا ایک پاؤں پائیدان پر اور دوسرا پاؤں اوپر رکھ کر کھڑا ہو گیا ، گھوڑا دوڑ پڑا ۔

" شیخ جی ہمارے مائی باپ ہیں ۔ ۔ " تانگے والا بظاہر کسان سے مخاطب ہو کر بولا : " ان کی مہربانی سے ہماری روزی چلتی ہے ۔ "

دھوپ کی شدت سے پکی سڑک کی سطح جگہ جگہ سے پگھل رہی تھی ، ان بڑے بڑے گداز دھبوں میں سے تانگے کے پہیے کول تار کے نشان لے کر نکلتے اور سڑک پر لکیریں ڈالتے جاتے تھے ۔

" ڈپٹی صاحب کے ہیڈ کلرک ہیں شیخ جی ۔ " تانگے والا پھر بولا ۔

کسان نے مرعوب ہو کر ایک نظر اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے عجیب و غریب آدمی پر ڈالی اور تہمد سمیٹ کر ذرا پرے ہو بیٹھا ۔

" بڑی ظالم گرمی پڑ رہی ہے شیخ جی ۔ ۔ " تانگے والے نے بات جاری رکھی : " بے زبان کی جان ہے ، مجھے اپنے بچوں سے پیارا ہے ، مگر پیٹ کا جہنم سب سے بڑا جہنم ہوتا ہے جی ۔ "

شیخ عمر دراز نے سر ہلایا : " یہ تو سچ ہے قربان ۔ "

جرنیلی سڑک پر دو فرلانگ کے فاصلے پر جا کر تانگہ رک گیا ۔ شیخ عمر دراز اور ان کا بیٹا تانگے سے اتر پڑے ۔ یہاں سے سڑک چھوڑ کر انھیں پگڈنڈیوں اور کھیتوں کی منڈیروں پر چلتے ہوئے اپنی زمین تک جانا تھا ۔

شیخ عمر دراز نے گھوڑے کی پشت پر تھاپ دی : " بڑا عمدہ جانور ہے قربان ۔ ۔ " وہ بولے ، اور کئی لمحوں تک گھوڑے کے بدن کو دیکھتے رہے اور اس پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرتے رہے ۔

" میرے اختیار میں ہو تو اسے دروازے ہی پہ کھڑا رکھوں شیخ جی ۔ ۔ " قربان فخر سے بولا : " مگر کیا کروں ،

پیٹ کا جہنم ہے۔" اس نے ہاتھ اُٹھا کر سلام کیا اور گھوڑے کو پچکار کر دوڑا دیا۔

"بابا۔۔" پگڈنڈی پر چلتے ہوئے آفتاب نے پوچھا: "یہ تانگہ آپ کا ہے؟"

شیخ عمر دراز ہنسے: "وہ ایسے ہی بات کر رہا تھا۔۔ میں نے ابھی اگلے ہی روز اسے پولیس سے چھڑوایا تھا۔"

"سپاہی سے؟"

"ہاں۔"

"اس نے کسی کو مارا تھا؟"

"نہیں۔ اپنے گھوڑے سے باتیں کر رہا تھا بیوقوف۔"

"گھوڑے سے باتیں کر رہا تھا؟"

"ہاں۔ گھوڑے سے کہہ رہا تھا، پُتر ذرا ٹگ اِیداں چِداں ہٹلر وگدا اے۔۔" وہ ہنس کر بولے۔

"اور اسے سپاہی پکڑ کر لے گیا۔"

"ہاں۔ جنگ ہو رہی ہے نا۔۔! ہٹلر ہمارا دشمن ہے۔"

"بابا، ہم جنگ جیت جائیں گے؟"

"پتا نہیں۔ آثار تو اچھے نہیں۔"

پگڈنڈیوں پر وہ دھوپ سے دم لینے کے لیے کسی کیکر یا پرانے پیپل کے سائے میں چند منٹ کو رُک جاتے، پھر چل پڑتے —— گیہوں کی فصل کٹ چکی تھی اور خشکی سے تڑختے ہوئے سفید کھیت کے کھیت دُور دُور تک پھیلے پڑے تھے؛ سوکھی زمین پر گرم ہوا کے بگولے جگہ بہ جگہ گیہوں کے بچے کھچے تنکے اُڑا رہے تھے؛ کہیں کہیں سبز چارے کا کوئی ایک آدھ کھیت کھڑا زمین کی آبادی کا پتا دیتا تھا —— اب کسانوں نے بادل کی اُمید میں آسمان کی جانب دیکھنا شروع کر دیا تھا۔

گرمیوں کی دوپہروں میں صرف دو آوازیں ایسی تھیں جو آفتاب کے دل کو اچھی لگتی تھیں۔ ایک اونچی اُڑتی ہوئی چیل کی آواز اور دوسری گھگو کی آواز۔ گھگو کی خواب آلود آواز کو سُن کر اس کا دل کرتا تھا کہ وہ کہیں آرام سے بیٹھ جائے اور اسے سُنتا رہے؛ اس میں سُنسان دوپہر کا مزا تھا اور اس آواز سے اس کے بدن کا تعلق تھا —— اس کے برعکس آسمان سے چیل کی چلچلاتی ہوئی آواز سُن کر اس کا دماغ بھٹکنے لگتا تھا؛ اُسے دُور دُور کے خیال آتے تھے۔

"بابا۔۔" اس نے پوچھا: "دُعا کو اتنی جلدی کیوں ختم کر دیتے ہیں۔۔۔؟ بس اِدھر ہاتھ اُٹھاتے ہیں، اُدھر منہ پر پھیرتے ہیں۔۔۔"

"اتنی ہی کافی ہوتی ہے۔"

"اتنی جلدی آپ کیا مانگتے ہیں؟"

"استغفار۔"

"استغفار کیا ہوتی ہے؟"

"معافی۔"

"کس کی معافی۔"

"گناہوں کی۔"

"آپ گناہ کرتے ہیں؟"
"بھئی جان بوجھ کر تو نہیں کرتا، ہو جاتے ہیں۔"
"کیسے ہو جاتے ہیں۔"
"کبھی کسی کو تکلیف پہنچ جاتی ہے، کسی کی بُرائی منہ سے نکل جاتی ہے۔"
"آپ کو پتا نہیں چلتا؟"
"کبھی چل جاتا ہے، کبھی نہیں چلتا۔"
"کیسے؟"
"بھئی، آدمی غلطیوں کا پُتلا ہے۔" شیخ عمردراز نے کہا۔
"اماں بھی گناہ کرتی ہیں؟"
"مجھ سے کم ہی کرتی ہوں گی۔"
"وہ تو بڑی لمبی دعا مانگتی ہیں۔"
"اُن کی عادت ہے۔"
"دعا مانگنے کی عادت اچھی ہوتی ہے؟"
شیخ عمردراز کچھ دیر چپ رہے، پھر سُست لہجے میں بولے: "اچھی ہی ہوتی ہے۔"
"آپ صرف معافی مانگتے ہیں؟" بچّے نے بات جاری رکھی۔
"ہاں۔"
"اماں کیا مانگتی ہیں؟"
"اُن سے جا کر پوچھو۔" شیخ عمردراز اپنے بیٹے کی طرف دیکھ کر مسکرائے: "تم تو بڑی جرح کرتے ہو یار . . . بڑے ہو کر وکیل بنو گے؟"
اِس پر بچّے کا ذہن کسی اور طرف کو نکل گیا: بڑا ہو کر وہ کیا بنے گا؟
"بابا . . ." اس نے پوچھا: "آپ بمبئی بھاگ گئے تھے؟"
"کب؟" شیخ عمردراز نے چونک کر اپنے بیٹے کی طرف دیکھا۔
"جب آپ چھوٹے تھے . . ." آفتاب فاتحانہ انداز میں بولا: "مجھے اماں نے بتایا تھا۔"
کچھ دیر کے بعد شیخ عمردراز کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی: "ہاں۔"
"آپ اُس وقت چھوٹے تھے؟" آفتاب نے پوچھا۔
"میں اُس وقت جوان تھا۔"
"جوان کتنے سال کا ہوتا ہے؟"
"بیس بائیس سال کا۔"
"اور نوجوان؟"
"اٹھارہ بیس سال کا۔"
"بیس سال کا جوان ہوتا ہے یا نوجوان؟"

"تم ضرور وکیل بنو گے۔" شیخ عمر دراز نے دوبارہ مسکرا کر کہا۔

"آپ ایکٹر بننے گئے تھے؟"

پہلی بار شیخ عمر دراز کا رنگ ہلکا سا بدلا، گویا اُن کے بیٹے نے اُس نہیں سی آن دیکھی، مگر سنسان جھلّی میں ایک چھید کر دیا ہو جس کے اُس طرف وہ رہتے تھے، مگر یہ رنگ پریشانی کا رنگ نہ تھا، بلکہ اس رنگ میں کسی ایسے دُور کے جذبے کی جھلک تھی جو اچانک قریب آگیا ہو۔

بچّے نے اپنی بات کا جواب نہ پاکر باپ کی جانب مُنہ اُٹھایا مگر آسمان کی آہنی چمک نے اُس کی نظر پھیر دی: "اماں نے مجھے بتایا تھا۔ ۔" اُس نے کہا: "آپ ایکٹر بننے گئے تھے؟"

"ہاں۔"

"کیسے؟"

"ایک فلم میں کام کیا تھا۔"

"فلم یہاں آئی تھی؟"

"اونہوں۔ ۔ ۔ اُس وقت صرف دو چار بڑے بڑے شہروں میں سنیما ہوتا تھا۔"

"کیا کام کیا تھا؟"

"سپاہی بنا تھا۔"

"پولیس کا؟"

"نہیں فوج کا۔"

"آپ کی جنگ ہوئی تھی؟"

"بہت بڑی جنگ ہوئی تھی۔ ۔ ۔ انگریزوں اور مسلمانوں کی۔"

"کہاں پر؟"

"پہاڑیوں پر اور ریگستانوں میں۔ ۔ ۔"

"ریگستان میں پہاڑیاں ہوتی ہیں؟"

"کئی ریگستانوں میں ہوتی ہیں۔ لڑائی کے لیے ایسا علاقہ بہترین ہوتا ہے۔ ۔ ۔ میرے پاس سفید گھوڑا تھا۔"

آفتاب نے محسوس کیا کہ اُس کا باپ اب محض اُس کی باتوں کا جواب دینے کے بجائے اپنی باتیں کرنے لگا ہے۔ اس کا دل خوشی سے پھُول اُٹھا۔ آسمان کی تیزی کی وجہ سے وہ نظر اُٹھا کر اپنے باپ کی طرف نہ دیکھ سکتا تھا، مگر اُسے احساس تھا کہ اُس کا باپ بھی اُس کی طرح خوش ہے۔ اسے یہ بھی پوچھنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی کہ اُس کا باپ "جنگ" میں کس کی طرف تھا! اس کے دل میں یقین تھا کہ وہ انگریز بنا تھا۔

"کون جیتا تھا؟" اُس نے پوچھا۔

"ہم جیتے تھے، مگر مسلمانوں نے بھی بڑی بہادری دکھائی تھی۔ ۔ ۔ بڑی زبردست کہانی تھی! لاکھوں روپے خرچ ہوئے تھے! اُس زمانے کے لاکھوں آج کل کے کروڑوں کے برابر ہیں! پانی کی طرح روپیہ بہایا گیا تھا! ہمارے لباس ولایت سے بن کر آئے تھے! ایک سو بیس گھوڑے خریدے گئے تھے، جو بعد میں بیچ دیے گئے! ایک سے ایک بہترین گھوڑا تھا! ہر ایک گھوڑے کا ایک ایک سائیس مقرر تھا! جو سفید گھوڑا میرے پاس تھا، ویسا اصیل جانور میں نے آج تک نہیں دیکھا! پہلے دن میں نے اُس کے اوپر

ران رکھی تو اس نے مجھے ایسے اُٹھایا جیسے بچپن سے میرا پالا ہوا ہو! ایک مہینہ وہ میرے پاس رہا اور مہینہ بھر کسی اور نے اُس کی پیٹھ پہ ہاتھ نہیں رکھا۔ ۔ ۔ تیس دن تک ۔ ۔ ۔" شیخ عمر دراز نے رُک کر اپنی بات کا مزا لیا: "تیس دن تک میں اُس کا واحد مالک تھا۔"

آفتاب کا دماغ اب بھٹکنے سے رُک گیا تھا! اب وہ اپنے ذہن کی آنکھ سے اس سارے منظر کا تصور کر رہا تھا: "بندوقوں سے لڑائی ہوئی تھی؟" اس نے بیتابی سے پوچھا۔

"پہلے بندوقوں سے، پھر جب دشمن آمنے سامنے آ گئے تو ہم نے بندوقیں پھینک کر تلواریں کھینچ لیں۔"

آفتاب کو خبر بھی نہ ہوئی تھی کہ کب وہ باپ بیٹا چلتے چلتے ٹھہر گئے تھے۔ صحرا کا اور پہاڑیوں کا اور گھڑ سوار انگریزوں اور بہادر مسلمانوں کے درمیان گھمسان کی جنگ کا تصور کرتے کرتے بے اختیار اُس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کھپچی کو اپنے سامنے اُٹھا کر دو بار تلوار کی مانند پھرتی سے ہوا میں جنبش دی۔ شیخ عمر دراز نے ہاتھ بڑھا کر شیشم کی کھپچی اپنے بیٹے کے ہاتھ سے اُچک لی۔ آفتاب نے چہرہ اُٹھا کر اپنے باپ کی جانب دیکھا۔ اب آسمان کی چمک اُس کی نظر کے آگے کچھ بھی نہ تھی۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے اس کے باپ کا تمتماتا ہوا، تیکھے نقوش والا چہرہ تھا جس کا رنگ اب بدل چکا تھا، جیسے کہ شیشم کی پتلی سی چھڑی اس کے ہاتھ میں آتے ہی تیز دھار تلوار بن گئی ہو جس کی نوک نے اس ہوا کی سی جھلی کو پھاڑ کے رکھ دیا ہو جس نے اس کے باپ اور اس کے درمیان ایک فاصلہ ڈال رکھا تھا۔

وہ ایک پست قد ٹنڈ منڈ درخت کے قریب کھڑے تھے جس کی چند موٹی موٹی سیاہ شاخیں ہوا میں اِدھر اُدھر پھیلی تھیں۔ کیکر کا یہ درخت کیڑا لگنے سے سوکھ چکا تھا۔

"سمجھو کہ جیسے یہ گھوڑا ہے۔ ۔ ۔" اس کا باپ چھلانگ لگا کر ایک شاخ کے اوپر سوار ہو گیا۔ اُس نے اپنا بایاں ہاتھ ہوا میں اُٹھا کر گھوڑے کی خیالی باگوں کو تھاما، اور دوسرے ہاتھ سے اپنے سامنے اور دائیں اور بائیں تیزی سے تلوار چلانے لگا۔ اُس کی آنکھوں میں بلا کی تندی اور چمک تھی، گویا وہ میدانِ جنگ میں گھرا دشمن سپاہیوں کو مار مار گرا رہا ہو: "اب میرا گھوڑا زخمی ہو کر گر جاتا ہے۔" اس کا باپ چیخا، اور چھلانگ لگا کر زمین پر آ رہا۔ مگر اُس کی چوکسی اور بازوؤں کی حرکت میں کوئی رُوک نہ آئی۔

اب یہ ایک عجیب منظر تھا۔ چلچلاتی ہوئی دوپہر میں ایک منڈے ہوئے خشک کھیت کے بیچ جھالر والا ٹوپ لگائے ایک شخص، بازو اور ٹانگیں پھیلائے، انتہائی تندی سے ٹاپ ٹاپ کر ہوا میں ایک پتلی سی چھڑی چلائے جا رہا تھا اور خشک مٹی اُس کے پاؤں میں گردن کر اُٹھ رہی تھی ——— دو کھیت پرے ایک بھینس کو ہانکتے ہوئے چند سیاہ بدن بچے رُک کر اس تماشے کو دیکھنے لگے تھے، مگر اُس ایک بچے کے واسطے جو اس شخص کے پاس کھڑا تھا، اس منظر میں کوئی تضحیک نہ تھی۔

وہ بچہ اپنے آپ سے بے خبر، انہماک اور تعجب کے ساتھ اپنے باپ کو دیکھ رہا تھا جو اب اپنے دم توڑتے ہوئے گھوڑے کے پاس کھڑا ایک ایک سیکنڈ پر دائیں، اور بائیں، اور آگے اور پیچھے جھپٹ جھپٹ کر چابک دستی سے اپنی چمکتی ہوئی تیز دھار تلوار سے دشمن کے سپاہیوں کو ڈھیر کرتا جا رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں دفعتاً ایک حیوانی تیزی اور بدن میں پھرتی آ گئی تھی اور تلوار کے وار ہوا میں شائیں شائیں کر رہے تھے ——— آفتاب کا تولیہ سر سے ڈھلک کر کندھے پر لٹک رہا تھا۔ اُس لمحے میں نہ آسمان کی چمک اُس کی آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی، نہ دھوپ کی تباہ کن گرمی اس کے بدن کو لگ رہی تھی۔ یہ لمحہ ایک خاص انسانی اور حیوانی جذبے کے امتزاج کا ایسا لمحہ تھا جس کے اندر ایک بچہ ایک آدمی میں ——— کوئی بھی بچہ کسی بھی آدمی میں، خواہ وہ اُس کے بیج سے ہو یا نہ ہو مگر جو اُسے دُنیا و مافیہا سے بے خبر کر دے ——— اپنے باپ کی

پہچان کرتا ہے۔ جتنی تیزی سے یہ لمحے آئے تھے، اتنی تیزی سے گزر بھی گئے۔

شیخ عمر دراز نے اچانک رُک کر پتلی شاخ کی چھڑی اپنے بیٹے کے ہاتھ میں پکڑائی اور ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ان کے چہرے پر پسینے کے قطرے بہہ رہے تھے۔ انھوں نے ایک ہاتھ سے ٹوپ اُٹھایا اور دوسرے ہاتھ سے رومال کے ساتھ پسینہ پونچھا، پھر احتیاط سے رومال اپنی جگہ پر رکھ کر ٹوپ اوپر جمایا اور چل پڑے۔

آفتاب کے ہاتھ میں شیشم کی وہ پتلی سی شاخ اب محض ایک کھپچی بن کر رہ گئی تھی جس کا باریک سا سِرا ابھی ٹوٹ گیا تھا، مگر اس دس سالہ بچے نے چند لمحوں میں ایک ایسی خوشنما اور وسیع و عریض دُنیا کی جھلک دیکھ لی تھی جہاں دن آگ کی طرح دہکتا تھا اور رات کو سانس رُکتی تھی۔ اس کا دل ایک پرند کی مانند تھا اور اُڑ رہا تھا۔

دس ایکڑ چاہی زمین کے رقبے میں ایک جانب کنواں تھا جو گھنے درختوں سے ڈھکا ہوا تھا ——— آفتاب نے سارے درخت گن رکھے تھے اور گو اُسے علم تھا کہ درخت اتنی تیزی سے نہیں اُگتے کہ چند روز میں ان کی تعداد بدل جائے، پھر بھی وہ ہر بار ایک ایک درخت کو گنا کرتا تھا۔ اٹھارہ دھریک کے، چار بڑے شرین، ایک جامن کا اور دو ٹاہلی کے درخت تھے۔

دھوپ ان درختوں کے نیچے زمین تک نہ پہنچ پاتی تھی ——— ان کے سائے میں کھاٹ پر بیٹھ کر اُن دونوں نے نمک والی لسّی کے کٹورے پیے، پھر آفتاب اُٹھ کر درخت گننے لگا۔ وہ ایک ایک درخت کے پاس جا کر اس کے تنے کو چھوتا اور آگے بڑھ جاتا۔ عموماً وہ ایک درخت کے دائیں طرف سے اور دوسرے کے بائیں سے ہو کر نکلتا، جس سے کہ اس کا راستہ سانپ کی طرح بل کھاتا ہوا چلتا۔ اس طور پہ درختوں کے بیچ چلنے میں اُس کو مزہ آتا تھا۔ بعض اوقات وہ آخری درخت پہ پہنچ کر مُڑتا اور اُسی طرح ایک ایک درخت کو ہاتھ لگاتا ہوا واپس پہلے درخت پر پہنچ جاتا، مگر گنتی کو نہ توڑتا۔ پھر پہلے درخت پہ پہنچ کر پچاس کو دو سے تقسیم کر دیتا۔ اس سے اُسے احساس ہوتا کہ اُس کا چکر مکمل ہو گیا ہے اور حساب درست ہے۔ ایسا کرنے سے اس کو یہ بھی تسلی ہو جاتی کہ سارے درخت اب محفوظ ہو گئے ہیں اور اسی طرح ہرے بھرے رہیں گے۔

کاشت کار حقّہ ہاتھ میں لیے اپنے کچے کوٹھے سے نکل کر کھاٹ کے پاس زمین پر آ بیٹھا تھا اور فصلوں کے بارے میں باتیں کر رہا تھا۔ شیخ عمر دراز کا چہرہ اب معمول پہ آ گیا تھا۔ وہ کھاٹ پہ سیدھے لیٹے تھے اور دونوں ہاتھ باندھ کر سر کے نیچے رکھتے، اوپر درخت کے اندر دیکھ رہے تھے۔ اُن کے جواب دینے کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ حسبِ معمول وہ کاشت کار کی بات کچھ سُن رہے ہیں، کچھ نہیں سُن رہے۔ کاشت کار اس کا عادی ہو چکا تھا، چنانچہ وہ اپنی باتیں کیے جا رہا تھا۔

اپنے باپ کے چہرے پر وہ نیم گم اور پُرسکون جھلک دیکھ کر آفتاب کو اپنے دل میں مضبوطی اور اُنس کا احساس ہوا، جیسے کوئی راز وہاں نہاں ہو گیا ہو۔ وہ گھٹنے زمین پہ اور کہنیاں کنویں کی موٹی اور پست دیوار پہ رکھے کنویں کے اوپر جھکا دور نیچے پانی کی سفید تھالی میں اپنے سر کا عکس دیکھتا رہا۔ پانی کی سطح پر دھریک کے زرد پتے تیر رہے تھے اور آفتاب کے نتھنوں میں کنویں کی مخصوص گیلی گیلی خنک اور کہنہ بُو چڑھ رہی تھی۔ یہ بُو ایک ایسی بُو تھی جو کسی اور شے سے نہیں آتی تھی اور اس میں کسی گئے گزرے ہوئے وقت کا احساس تھا۔ یہ کنواں اُس کے دادا نے بنایا تھا۔ وہ مختلف قسم کی موٹی اور پتلی پتلی آوازیں نکال کر کنویں کے اندر اُن کی گہری اور ملفوف بازگشت کو سنتا رہا، گویا زمین کے اندر سے اُس کھوئے ہوئے وقت کو پکار کر نکال رہا ہو۔

جب کنواں چل رہا ہوتا تو وہ ہمیشہ گادھی پر بیٹھ کر بیلوں کو چلایا کرتا تھا حتیٰ کہ اس کا سر چکر کھانے لگتا ——— بیل سائے میں خاموش کھڑے چارہ کھا رہے تھے۔ وہ کنویں سے اُٹھ کر بیلوں کے پاس جا کھڑا ہوا۔ کنویں کی ٹھنڈک

پہنچانے والی خوشبو جس کو وہ اپنے دادا کی شکل سے منسوب کرتا تھا، ابھی تک اُس کے بدن میں موجود تھی۔ اُس کے بدن میں اپنے باپ کی ایک پوشیدہ شکل بھی تھی جو پھیلتی جا رہی تھی، جیسے روشنائی کا ایک ننھا سا قطرہ سیاہی چوس پہ ٹپک پڑا ہو۔ پہلی بار اُس بچّے کے اندر جو ابھی مشکل سے دس برس کا ہوا تھا، پشتوں کے وقت کی گزران ہوئی تھی اور اُس کے دل میں سیر گی کی کیفیت تھی ——— اُس کی نظر ایک پلّے پہ پڑی جو پیچھے سے نکل کر اُس کی ٹانگوں کے پاس آ کھڑا ہوا تھا۔ پلّا سُنہری رنگ کا تھا اور اتنا چھوٹا تھا کہ کھڑا کھڑا لڑکھڑا رہا تھا۔ آفتاب اسے اُٹھانے کو جھکا تو پلّا ننھی سی چیخ مار کر پلٹا اور پھر تڑ تی ہوئی چال سے کوٹھے کی دیوار کے عقب میں غائب ہو گیا۔ آفتاب اُس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ جیسے ہی وہ دیوار کے عقب میں پہنچا، اس نے دیکھا کہ سامنے ایک گڑھے کے اندر مزارعوں کی کتیا پلّوں کو لیے لیٹی تھی۔ کتیا آفتاب کو پہچانتی تھی چنانچہ اس نے فقط ایک بار کان کھڑے کر کے اسے دیکھا اور آرام سے اپنے بڑے بڑے لٹکتے ہوئے تھن لیے لیٹی پلّوں کو دودھ پلاتی رہی ——— آفتاب نے پچھلے ہفتے کتیا کا لٹکتا ہوا پیٹ دیکھا تھا مگر اُسے خیال بھی نہیں تھا کہ وہ بچّے دینے والی ہے۔ وہ کتیا کے گڑھے کے پاس پاؤں کے بل بیٹھ گیا اور مسحور آنکھوں سے پلّوں کو دیکھنے لگا ——— چار پلّے نظر آ رہے تھے۔ تین کالے اور سفید رنگ کے تھے جو آنکھیں میچے تھنوں پہ منہ مار رہے تھے۔ چوتھا سنہرے رنگ کا تھا جو گڑھے سے باہر گھوم پھر کر واپس آیا تھا، اور سب سے زیادہ ہوشیار معلوم ہوتا تھا۔ یہ پلّا اب تھنوں کو چھوڑ کر اپنی ماں کے پیٹ پر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا ——— مزارع کے نوجوان بیٹے نے آفتاب کا اشتیاق دیکھ کر سنہری پلّا اٹھایا اور اس کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ پلّا ملائم ملائم سی چیخیں مارنے لگا۔ کتیا سر اٹھا کر ہلکا سا غرائی، پھر خاموش ہو رہی۔ آفتاب پلّے کو سینے سے لگائے لگائے اپنے باپ کے پاس لے آیا۔

"بابا! اسے گھر لے جاؤں؟" آفتاب نے باپ سے پوچھا۔

شیخ عمر دراز نے ادھ کھلی آنکھوں سے پچنچتے ہوئے پلّے کو دیکھا، پھر بولے: "دودھ پیتا ہے . . . بعد میں لے جانا۔"

آفتاب پلّے کو اُٹھائے اُٹھائے واپس چلا آیا۔ کھاٹ پر شیخ عمر دراز دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھے رکھے کچھ دیر کو سو گئے۔ مزارعہ زمین پر بیٹھا حقہ گڑگڑاتا ہوا باتیں کرتا رہا۔ آفتاب پلّوں کے گڑھے کے پاس دیوار کے سائے میں پاؤں کے بل بیٹھا، گھٹنوں پہ ہاتھ رکھے اور ہاتھوں پہ ٹھوڑی جمائے سنہری پلّے کو دیکھتا رہا۔

واپسی پر آفتاب کے دل میں کئی خیال آئے۔ اُسے خیال آیا کہ بابا سے کہے کہ انھوں نے عصر کی نماز نہیں پڑھی، مگر یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ شیخ عمر دراز کی جب مرضی ہوتی نماز پڑھتے، جب نہ ہوتی مگن رہتے۔ عجیب بات تھی کہ جب وہ نماز کو قضا کر جاتے تو انھیں نماز کے ضایع ہونے کا احساس نہ ہوتا۔ اس کے برعکس جب اماں نماز قضا کرتیں تو سب کو پتا چل جاتا کہ اُن کی نماز چھوٹ گئی ہے۔ بہت بعد میں، جب وہ بڑا ہوا تو اُسے اس بات کی سمجھ آئی کہ نماز کی کیفیت دراصل مگن ہونے کی کیفیت ہوتی ہے۔

سُورج ڈھل رہا تھا، دھوپ کی تیزی جاتی رہی تھی۔ وہ چارے کے سبز کھیتوں کے پاس سے گزرتے تو دفعتاً ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا آتا ——— کئی بار آفتاب کو خیال آیا کہ وہ پوچھے، اس فلم میں میمیں ننگی تھیں؟ مگر اس بات پر منہ کھولنے کی اُس کی ہمت نہ ہوئی۔ اس کے دل میں ایک اَن ٹوٹ احساس تھا کہ یہ بات اب ایک راز بن کر ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی ہے جس کا صرف اسی کو علم ہے، اور اگر اس نے دوبارہ کبھی اس بات کو چھیڑا تو اس میں فرق آ جائے گا۔ اُس نے کئی بار اپنے باپ کی طرف دیکھا۔ اُس کے باپ کا چہرہ اُسی طرح ٹھہرا ہوا، پُرسکون اور مانوس تھا ——— جب تک وہ دونوں کھلی جگہوں میں درختوں کے نیچے نیچے چلتے رہے، انھیں گرمی کا احساس نہ ہوا، مگر جیسے ہی وہ شہر کی حدود میں داخل ہوئے،

تپش اور گرد و غبار نے انھیں اپنے گھیرے میں لے لیا ـــــــ شہر میں حرکت آگئی تھی، لوگ اپنے گھروں سے نکل آئے تھے، گلیوں میں اور دکانوں پر تازہ تازہ نہائے اور بال سنوارے ہوئے لوگ ململ کے کرتے پہنے چل پھر رہے تھے، سرکلر روڈ پر تانگے دوڑے جارہے تھے، ایک پرانی مسافر بس دھول اڑاتی ہوئی گزر گئی، چند سائیکل سوار بس کے آگے تتر بتر ہوگئے ـــــــ تپی ہوئی گرد کے ذرے آفتاب کے جسم کو چبھو رہے تھے۔ ایک جگہ پر ایک ماشکی سڑک کے کنارے ترکاؤ کر رہا تھا۔ شیخ عمر دراز نے ریڑھی سے اپنے بیٹے کو ایک قلفی خرید کر دی۔

"کتوں کو تمھاری اماں پسند نہیں کرتیں۔ ۔ ۔" وہ نرمی سے بولے: "تمھیں پتا ہی ہے، وہ انھیں ناپاک سمجھتی ہیں۔ ۔ ۔ تم پلے کا ذکر نہ کرنا، میں بات کروں گا۔ ۔ ۔ چلو چودھری نذیر سے ملتے ہوئے جاتے ہیں۔ ۔ ۔" وہ گھر کا راستہ چھوڑ کر ایک دوسری گلی میں مڑ گئے۔

چودھری نذیر، جو شیخ عمر دراز کے بچپن کے دوست تھے، نبیان اور سفید چادر باندھے ہوئے گھر سے نکلے۔

آفتاب ان سے ہمیشہ ڈرتا تھا کیونکہ وہ ہائی سکول میں سیکنڈ ہیڈ ماسٹر تھے اور بچوں کے ساتھ نہایت سنجیدگی سے بات کرتے تھے، وہ شیخ عمر دراز کے ساتھ، جنھیں وہ کبھی "شیخ جی" اور کبھی "عمر" کہہ کر بلاتے تھے، خوب ہنس ہنس کر اور کبھی ہاتھ پہ ہاتھ مار کر باتیں کرتے تھے ـــــــ چودھری نذیر نے ان دونوں کو بیٹھک میں بٹھایا اور برف والا شربت پلایا۔ پھر وہ چھت والے پنکھے کی ڈوری ہاتھ میں لے کر زور زور سے اسے کھینچنے اور اپنا کالا ساعینک والا چہرہ آگے بڑھا کر رازداری سے مگر اونچی آواز میں باتیں کرنے لگے۔ ان کا یہ لہجہ صرف شیخ عمر دراز کے لیے مخصوص تھا۔

آفتاب نے اپنے باپ کو چودھری نذیر کے ساتھ سب سے زیادہ باتیں کرتے ہوئے دیکھا تھا، کبھی کبھی وہ کھل کر ہنس بھی پڑتے تھے ـــــــ آفتاب کا دل اب گھبرانے لگا تھا۔ ٹھنڈے شربت کا گلاس پیتے ہی بند کمرے میں بیٹھے بیٹھے اس کے سارے جسم سے پسینہ بہنے لگا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ بھاگ کر گھر پہنچ جائے اور سارے کپڑے اتار کر نلکے کے نیچے بیٹھ جائے۔

"فائیل کا نمبر لکھ لو۔ ۔ ۔" اس کے باپ نے چودھری نذیر سے کہا: "شاید پھر میرے ذہن سے نکل جائے۔"

چودھری نذیر نے حیرت سے اس کے باپ کو دیکھا: "عمر، تم تو زندگی میں کبھی کوئی بات نہیں بھولے۔ میری فائیل کا نمبر بھول جاؤ گے؟"

شیخ عمر دراز آہستہ سے ہنسے: "پھر بھی۔ ۔ ۔" وہ بولے: "تلاش کرنے میں آسانی رہتی ہے۔"

چودھری نذیر اچانک خاموش ہو کر شیخ عمر دراز کے چہرے کو دیکھنے لگے۔ شیخ عمر دراز نے چودھری نذیر کو اس طرح دیکھتے ہوئے پا کر منہ پھیر لیا اور کھلے دروازے کی جانب دیکھنے لگے۔ چودھری نذیر نے ہاتھ بڑھا کر اپنے دوست کے ہاتھ پر رکھا اور تفکر سے بولے: "عمر، تمھاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔ ۔ ۔!"

"ہاں۔ ۔ ۔" شیخ عمر دراز ہنسے: "بالکل ٹھیک ہے۔"

گرمی آفتاب کے بدن کو کھائے جارہی تھی۔ اسے چودھری نذیر پر اب غصہ آرہا تھا کہ وہ خواہ مخواہ اس کے باپ سے باتیں کیے جارہے ہیں اور حال پوچھے جارہے ہیں ـــــــ آخر جب وہ وہاں سے اٹھ کر اپنے گھر کو چلے تو اس کا دل اور بھی زیادہ گھبرانے لگا جیسے کہ چودھری نذیر کا ڈر اس کے دل میں راہ پا گیا ہو، اور دو کر چھوٹے بڑے ڈر پیدا کر رہا ہو۔ اب اس کا جی کر رہا تھا کہ وہ گھر نہ جائے۔ اماں اس وقت نماز کی چوکی پر بیٹھی ہوں گی، اس نے خیال کیا، بیدی گھڑے بھر رہی ہوگی ـــــــ اس خیال سے بھی اس کا دل نہ ٹھہرا۔ اسے اپنی ماں کا خیال آئے جارہا تھا: "تمھارے ابا۔ ۔ ۔"

وہ کہا کرتی تھیں: "اگر جوانی میں وقت ضایع نہ کرتے تو اس وقت مجسٹریٹ ہوتے۔ ۔ ۔" پھر وہ کہتی تھیں: "ان کا دماغ اچھا ہے، مگر دھیان نہیں دیتے۔ زمین سے ایک پیسہ نہیں آتا۔ ۔ ۔ سب مزارعے کھا جاتے ہیں۔ ۔ ۔"

اُس کی اماں بڑی حلیم طبع عورت تھیں۔ اُسے اپنی اماں سے بے حد پیار تھا —— اِس وقت ان گلیوں کی گرمی اُس کا دل میں رہی تھی۔ اُس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ اور اُس کا باپ، دونوں واپس شہر سے باہر نکل جائیں، درختوں کے نیچے چلتے چلتے چارے کے کھیتوں تک پہنچیں اور پھر وہاں سے کنوئیں کی طرف چلے جائیں —— ایک بار اس کا جی بڑے زور سے چاہا کہ وہ پوچھے، "ابا، آپ بمبئی سے کیوں چلے آئے تھے؟" اس نے منہ اٹھایا مگر اپنے باپ کے چہرے پر ٹھہری ہوئی متانت کو دیکھ کر خاموش رہا۔

گھر کے اندر ہو بہو وہی سماں تھا جس کا خیال آفتاب نے کیا تھا —— چھوٹے سے پکے صحن میں اماں نماز کی چوکی پہ بیٹھی تسبیح رول رہی تھیں اور ہولے ہولے ہلتی جاتی تھیں۔ بیدی نے صحن میں ترکاؤ کر دیا تھا جس سے بھیگی ہوئی گرم اینٹوں کی خوشبو آ رہی تھی۔ اب وہ نلکے پر گھڑے بھر رہی تھی۔

آفتاب اندر داخل ہوتے ہی سیدھا جا کر اپنی ماں کے پاس چوکی پر بیٹھ گیا۔ اُس کی ماں نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اپنے ساتھ لگا لیا —— شیخ عمر دراز نے صحن میں قدم رکھ کر السلام علیکم کہا۔ یہ ان کا اصول تھا۔ وہ جتنی بار گھر میں آتے، السلام علیکم کرتے۔ ان کی بیوی نے ایک سرسری نظر اُن پہ ڈالی اور سر کی ہلکی سی جنبش سے جواب دیا —— وہ تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ شیخ عمر دراز چند سیکنڈ تک صحن کے وسط میں کھڑے ادھر اُدھر دیکھتے رہے۔ پھر خاموشی سے بیٹھک میں چلے گئے۔

ان کے جاتے ہی آفتاب نے اٹھ کر ایک ایک کر کے سارے کپڑے اُتار پھینکے اور نلکے کے نیچے جا بیٹھا۔ ٹھنڈے یخ پانی کی دھار بدن پر پڑی تو وہ ہلکی ہلکی چیخیں مارنے لگا اور پھر جھرجھرانے لگا —— لڑکی اُس کی مزے کی چیخیں سُن کر ہنستی اور نلکا چلاتی جا رہی تھی۔ ایک آدھ منٹ میں اس کی جھرجھری ختم ہو گئی۔ اس نے اپنا سر گیلا کیا، پھر منہ اٹھا کر پانی کی دھار کے آگے رکھا اور چند گھونٹ ٹھنڈے پانی کے پیے جس سے اُسے ہلکا اچھو لگا۔ اُس نے سر نیہوڑا کر دھار کے نیچے رکھ دیا اور آنکھیں بند کر کے سارے بدن پر بہتے ہوئے ٹھنڈے یخ پانی کا مزا لینے لگا۔ اُس کے دل کی گھبراہٹ اب ختم ہو چکی تھی۔ اُسے بھوک لگ رہی تھی۔ اسے پتا تھا کہ جب وہ بدن خشک کر کے کپڑے پہن لے گا تو اماں اٹھ کر روٹیاں پکائیں گی۔ پھر وہ سب صحن میں بیٹھ کر کھانا کھائیں گے۔ اب وہ خوش تھا۔

بیٹھک میں اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا —— شیخ عمر دراز شام کو دروازہ اور کھڑکیاں کھول دیتے تھے۔ آج وہ بند کمرے میں بید کی آرام کرسی پر بیٹھے تھے۔ آج انھوں نے کوئی کام حسبِ معمول نہ کیا تھا؛ نہ ہیٹ اُتار کر میز پر رکھا نہ بوٹ اتارے، نہ ہی کونے میں میز پر پڑا ہوا بجلی کا پنکھا چلایا؛ پسینے کے قطرے اُن کے ہیٹ کی جھالر کے نیچے سے نکل کر ماتھے پر بہہ رہے تھے اور ابرو پہ اٹکے تھے —— کئی منٹ تک وہ اسی طرح خاموش بیٹھے رہے، جیسے گرمی میں چل چل کر تھک گئے ہوں؛ پھر جیسے اچانک انھیں کچھ یاد آ گیا ہو، انھوں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا ہیٹ سر سے اُٹھایا اور احتیاط سے میز پر رکھ دیا؛ کپڑے سے سر اور ماتھے کا پسینہ پونچھا اور کپڑا کرسی کے بازو پر لٹکا دیا؛ پھر جھک کر بوٹ اتارنے کے بجائے وہ کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے؛ اندر والے دروازے کے پاس جا کر انھوں نے دروازہ بھیڑا اور نہایت آہستگی سے چٹخنی چڑھا دی؛ پھر کپڑوں والی الماری کھول کر انھوں نے اندر سے اپنی دونالی بندوق نکالی اور اُس میں دو کارتوس بھرے؛ کارتوس بھر کر انھوں نے بندوق کا دستہ زمین پر ٹکایا اور جھک کر کان نالیوں کے گول سیاہ سوراخوں سے لگا دیا، جیسے کوئی آواز سننے کی کوشش کر رہے ہوں؛ پھر انھوں

نے بازو لمبا کر کے انگلیاں لبلبی میں داخل کیں اور ایک زوردار جھٹکے سے دونوں لبلبیاں دبا دیں . . .

بیس جون، ۱۹۷۰ء

دوپہر سے ذرا پہلے شہر کے ریلوے سٹیشن پر ایک لمبے قد کا اجنبی گاڑی سے اُترا۔ اُس کے ہمراہ ایک نو دس سال کا بچہ تھا۔ بچے کی شکل اور چال ڈھال اس سے مشابہت رکھتی تھی۔ دونوں باپ بیٹا تھے۔ اُس شخص کا نام آفتاب عمر تھا اور وہ لاہور کا ایک وکیل تھا۔ وہ صرف ایک مقصد لے کر اُس شہر میں آیا تھا۔

سورج سر پر چمک رہا تھا اور پلیٹ فارم کی دہکتی ہوئی اینٹوں سے ٹکرا کر آگ بنتی جاتی تھی —— آفتاب عمر نے دھوپ سے بچنے کے لیے چھاتا کھولا اور اپنے آپ کو اور اپنے بیٹے کو اُس کے سایے میں رکھنے کی کوشش کرتا ہوا تیز تیز پلیٹ فارم کی لمبائی کو طے کرنے لگا —— پلیٹ فارم کے برآمدے میں پہنچ کر وہ ٹھہر گیا۔ اُس نے اپنا اٹیچی کیس مسافر بنچ پر رکھا اور پتلون کی جیب سے رومال نکال کر چہرے اور گردن کا پسینہ خشک کیا۔ پھر اُس نے اسی رومال کے ساتھ اپنے بیٹے کا پسینہ پونچھنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ بچے نے ایک جنبش سے سر پیچھے ہٹا لیا اور اپنا رومال نکال کر اُس کے ساتھ پسینہ خشک کرنے لگا۔ دونوں نے اپنے اپنے رومال پھیلا کر ان پر پسینے اور گرد کی سیاہ لکیروں کو دیکھا اور رومال جیب میں ڈال لیے۔ آفتاب نے دھوپ کی تیزی کے سامنے آنکھیں سکیڑ کر ایک نظر طویل پلیٹ فارم پر ڈالی: "جب میں یہاں سے گیا تھا . . ." وہ اپنے بیٹے سے بولا: "یہ پلیٹ فارم یہاں نہیں تھا۔"

"گاڑی کھڑی نہیں ہوتی تھی؟" بچے نے پوچھا۔

"ہوتی تھی۔ سٹیشن تھا مگر پلیٹ فارم نہیں تھا۔"

"گاڑی کہاں کھڑی ہوتی تھی؟"

"زمین پر۔"

بچہ حیرت سے پلیٹ فارم کو دیکھنے لگا: "پلیٹ فارم کب بنا تھا؟" اُس نے پوچھا۔

"کچھ سال ہوئے۔"

"آپ نے پہلے نہیں دیکھا؟"

"نہیں۔"

بیس سال پہلے ریلوے سٹیشن کے باہر پیپل کا ایک درخت تھا، دھوپ تھی اور کچی زمین —— اب سٹیشن کی عمارت کے سامنے کی وسیع جگہ پکی تھی اور چاروں طرف بڑے بڑے شیشم کے درختوں کا گھیرا تھا؛ درختوں کے سایے میں تانگے ہی تانگے کھڑے تھے اور زمین شیشم کے پیلے پیلے نُور والے پھولوں سے ڈھکی تھی؛ ایک طرف کاروں کے لیے جگہ مخصوص تھی جہاں سات آٹھ پرائیویٹ کاریں کھڑی تھیں؛ ایک کار کے سوا باقی سب کاروں میں سامان رکھا جا رہا تھا؛ سفر سے آنے والے اور ان کے استقبالی کھڑے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے اور اخباروں رسالوں سے پنکھا کرتے جاتے تھے؛ کاروں کے ساتھ سکوٹروں اور سائیکلوں کا سٹینڈ تھا —— سٹیشن کا نقشہ ہی بدل چکا تھا۔

"آؤ باؤجی، آپ کا تانگہ۔ ۔ ۔"

"میاں صاحب، ادھر آؤ۔ ۔ ۔ سالم تانگہ چاہیے؟"

"باؤ صاحب تیار کھڑا ہے۔"

"جا اوئے۔ ۔ ۔ میاں صاحب کو سالم تانگہ چاہیے۔ ۔ ۔ آؤ جی ادھر، سامان دے دو۔ ۔ ۔"

آفتاب نے تانگے والوں کے جمگھٹے میں ایک ایک چہرے کو غور سے دیکھا، مگر کسی کو پہچان نہ پایا۔

"کسی اچھے ہوٹل میں لے چلو۔" تانگے میں بیٹھ کر اُس نے کہا۔

"ریواز ہوٹل بہترین ہے جی۔ ۔ ۔ صاف ستھرا ہے، کچہری سے قریب ہے۔ ۔ ۔ گلنار بھی اچھا ہے مگر بدنام ہے۔ ۔ ۔ شریف آدمی کا اُدھر کوئی کام نہیں۔ ۔ ۔ میاں صاحب باہر سے آئے ہو؟"

سٹیشن کی سڑک اُسی طرح ٹوٹی پھوٹی اور کھنڈے دار تھی، مگر سڑک کی دونوں جانب نئی دُکانیں بن گئی تھیں ——— دوپہر کا وقت ہو چلا تھا اور لُو چلنی شروع ہو گئی تھی، مگر ہر طرف سر ہی سر نظر آتے تھے؛ سڑک پر کاروں، سکوٹروں، تانگوں اور سائیکلوں کا رش لگا تھا ——— آفتاب نے قمیص کی جیب سے کالی عینک نکال کر لگالی اور ٹھنڈے شیشوں کے پیچھے آنکھوں پر زور دے کر ہر گزرنے والے کو دیکھنے لگا۔ بیس منٹ کے سفر میں اُس کو ایک بھی جانا پہچانا چہرہ نظر نہ آیا۔ اُسے یقین نہیں آتا تھا کہ اس شہر میں اُس نے اپنی زندگی کے پہلے بیس برس گزارے تھے؛ بیس سال پہلے جب وہ یہاں سے گیا تھا تو اُس وقت کے نئے نئے ڈگری کالج سے اُس نے بی اے پاس کیا تھا؛ اس شہر میں اس کے سینکڑوں جاننے والے تھے ——— وہ سب اب کہاں چلے گئے ہیں؟ اُس نے سوچا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ جیسے اُس وقت کی ساری آبادی کو کمیشت اٹھا کر کہیں اور لے جایا گیا ہو اور اس کی جگہ کسی اور آبادی کو لا کر یہاں بسا دیا گیا ہو۔

ریواز ہوٹل سے وہ واقف تھا ——— پُرانی، چھوٹے سائز کی بنگلہ نما بلڈنگ غائب ہو چکی تھی؛ اس کی جگہ کانچنی رنگ کی چار منزلہ ڈبہ سی عمارت کھڑی تھی جس کی کھڑکیوں پر سیمنٹ کی پتلی پتلی اُبھری ہوئی پتیوں والی جالیاں بنی تھیں ——— تیسری منزل پر اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہی آفتاب کی ناک میں قدیم بند جگہوں کی سیلی بو داخل ہوئی۔ اُس نے کھڑکی کھول دی ——— کمرے ایسے رُخ پہ بنے ہوئے تھے کہ اُن میں سے ہوا کا گزر نہ ہوتا تھا۔ لُو کے اس موسم میں آفتاب نے فنِ تعمیر کی اس فاش غلطی پر خدا کا شکر ادا کیا ——— ہوٹل کا ملازم ایک دو بار بجلی جلا اور بجھا چکا تھا اور اب چھت والے بجلی کے پنکھے کو چلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ پنکھے کے ریگولیٹر پر مکھیوں کی بیٹ کے بے شمار داغ تھے اور اس کا کنکشن کچھ ڈھیلا تھا۔

"کھانا صاب؟" اُس نے پوچھا۔

"ابھی نیچے آکر کھائیں گے۔ ۔ ۔" آفتاب نے کہا: "ٹھنڈا پانی ہو گا؟"

"ابھی لایا صاب۔"

"مَیں تو نہانے لگا ہوں۔" آفتاب قمیص اُتارتے ہوئے بیٹے سے بولا۔

"ابو پہلے مَیں نہالوں؟"

"جانگیہ پہن لو، دونوں نہا لیتے ہیں۔" آفتاب نے کہا۔

اُس نے اٹیچی کیس کھول کر تولیہ، صابن، کنگھی، پاؤڈر کا ڈبہ اور دو صاف جانگیے، ایک بڑا ایک چھوٹا، نکالے اور سب چیزوں کو ایک چھوٹے سے ڈھیر کی شکل میں بستر پر رکھ دیا ——— کمرہ ماڈرن طرز پہ آراستہ تھا؛ سامنے کی

دیوار کے ساتھ دو سنگل بستر الگ الگ چارپائیوں پر لگے تھے جن پر سفید چادریں بچھی تھیں؛ بیچ میں ایک میز رکھی تھی؛ غسلخانے میں ایک شاور نصب تھا، شاید پانی وہاں تک نہ چڑھتا تھا؛ ٹونٹی سے کمزور سی دھار نکلتی تھی جس کے نیچے بالٹی اور تام چینی کا مگ پڑا تھا ——— آفتاب ایک ایک شے کو رک رک کر غور سے دیکھتا رہا، جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو، پھر وہ واپس آ کر بستر پر بیٹھ گیا ——— اس کا بیٹا جانگیہ پہنے کمرے کے بیچ میں کھڑا پنکھے کی ہوا کھا رہا تھا۔

"ابو آپ کا گھر کدھر تھا؟" اس کے بیٹے نے پوچھا۔

"اُدھر . . ." آفتاب نے کمرے میں ایک طرف کو اشارہ کر کے کہا۔

"اب اُس میں کون رہتا ہے؟"

"پتا نہیں، اب کون رہتا ہو گا . . . مَیں نے بیچ دیا تھا۔"

ہوٹل کا ملازم ایلومونیم کے جگ میں برف کا پانی لے کر آیا تو باپ بیٹے نے ایک ایک گلاس ٹھنڈے پانی کا پیا اور نہانے چلے گئے۔

کھانے کے ہال کا فرش چپس کا تھا جس پر ٹپکے ہوئے کھانے کے نشان نظر آ رہے تھے؛ دروازوں اور کھڑکیوں کے آگے پردے گرے ہوئے تھے مگر میزوں اور کرسیوں اور کھانے کی پلیٹوں پر اور بازوؤں اور مستقل چلتے ہوئے جبڑوں پر مکھیوں کی بھرمار اسی طرح تھی ——— آفتاب نے نیم اندھیرے ہال میں اس طرح قدم دھرا جیسے کوئی اداکار پہلی بار کسی نامانوس اسٹیج پر آ رہا ہو۔ دروازے میں ایک لمحے کو رک کر اس نے چاروں طرف دیکھا، جیسے ٹھٹک گیا ہو۔ اس لمحے اس کے دل کے اندر ایک وسیع و عریض تنہائی کا عالم تھا ——— وہ دونوں جا کر ایک خالی میز کے گرد آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ لاشعوری طور پر اب آفتاب کی نظر جوان چہروں کو چھوڑ کر ادھیڑ عمر چہروں پر اٹک رہی تھی، گویا وہ ان میں اپنا عکس تلاش کر رہا ہو۔ ان چہروں میں کسی ایک کی بھی پہچان نہ کر کے اُسے مایوسی کے بجائے ایک طرح کے اطمینان کا احساس ہوا، جیسے کوئی بوجھ اس کے دل سے اتر گیا ہو۔

"ابو، کہانی سنائیں۔" اس کے بیٹے نے کھانا کھاتے ہوئے اسے اپنا وعدہ یاد دلایا۔

"ابھی نہیں۔" وہ بولا۔

"کب؟"

"جب گھومنے جائیں گے۔"

"چار بجے؟"

"ہاں . . ." وہ بولا: "چار پانچ بجے، ذرا سورج نیچے ہو جائے۔"

کھانے کے بعد اس کا بیٹا پنکھے کے نیچے بستر پہ لیٹا ایک کومک پڑھتا رہا، پھر کروٹ بدل کر سو گیا۔ آفتاب نے سونے کی کوشش کی مگر اُسے نیند نہ آئی۔ وہ اٹھ کر کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔

یہ شہر کا سب سے گنجان چوراہا تھا اور دن کا سب سے گنجان وقت۔ لوگ دفتروں سے واپس آ رہے تھے، اور لڑکے لڑکیاں سکولوں کالجوں سے چھوٹ رہے تھے۔ ٹریفک رکا کھڑا تھا: بیس بیس تانگے، کئی سکوٹر، سائیکل اور دو تین کاریں ——— ان بیس برسوں میں اس چوراہے کا نقشہ نہ بدلا تھا۔ جوتوں کی تین دکانیں جن میں ایک "باٹا" کی تھی، ایک درزی، دندان ساز، سٹیشنری، عینکوں کی اور پان سگریٹ والے کی دکان۔ ان دکانوں کے رنگ تک وہی تھے ——— وہی سڑکیں تھیں۔ لڑکیاں تانگوں میں بھری سکول سے واپس آ رہی تھیں؛ زیادہ تر لڑکیاں اب بے نقاب تھیں؛ اس نے سنا تھا کہ لڑکیوں کا کالج کھل گیا ہے ——— یہ اس کا شہر تھا۔ سکول اور کالج جاتے آتے ہوئے سالہا سال تک

۲

اِس چوراہے سے اُس کا گزر ہوا تھا۔ سینکڑوں بار اُس نے اور مصطفےٰ نے سیاہ برقعوں والی گورنمنٹ سکول کی چلبلی لڑکیوں کا تعاقب کیا تھا —— یہاں سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر شہر کے اندر اُس کا گھر تھا، جہاں وہ پیدا ہوا تھا؛ آج بھی اگر وہ ان ہی منزلوں کی سیڑھیاں اُتر کر چوراہے میں جا کھڑا ہو تو آنکھیں بند کر کے اپنے گھر پہنچ سکتا تھا، یا کسی بھی سمت کو جا سکتا تھا، جیسے وہ کبھی یہاں سے گیا ہی نہ ہو —— اُس کے شہر اور اُس کے درمیان صرف پینتالیس سیڑھیوں کا فاصلہ تھا —— بے اختیار اُس کا جی چاہا کہ وہ سیڑھیاں پھلانگتا ہوا اُتر کر چوراہے میں جا کھڑا ہو۔ کالی عینک کو آنکھوں سے اُتار دے، لوگوں کو پہچان کر اُن سے ہاتھ ملائے، اُن سے باتیں کرے، پھر اپنے گھر کی طرف چل دے، یا مصطفےٰ کے گھر کی طرف —— مصطفےٰ کا والد شاید ابھی زندہ ہو، اُس نے سوچا —— ایک لحظے کو آفتاب نے کالی عینک اُتاری تو دھوپ بُری طرح اس کی آنکھوں کو لگی۔ اُس نے دوبارہ شیشے آنکھوں پہ چڑھا لیے۔ ٹریفک اب چھٹنے لگا تھا۔ دکانیں دوپہر کے وقفے کے لیے ایک ایک کر کے بند ہو رہی تھیں —— ایک گھنٹے کے اندر اندر یہ چوراہا سنسان ہو جائے گا، اُس نے سوچا —— اس شہر کی کوئی شے اب اُس کی ملکیت میں نہیں تھی۔ اُنیس برس کی عمر میں اس نے بی اے پاس کیا تھا؛ لاہور سیکرٹریٹ میں اُسے ملازمت مل گئی تھی؛ جب اگلے برس اُس کی اماں اچانک بیمار پڑ کے فوت ہو گئیں تو وہ سب کچھ بیچ باچ کر لاہور منتقل ہو گیا تھا؛ وہاں اُس نے شہر سے باہر ماڈل ٹاؤن میں مکان خرید لیا تھا جس میں وہ آج تک رہتا آ رہا تھا؛ اُس نے لاء کی ڈگری لے کر ملازمت چھوڑ دی تھی، اور وکالت کرنے لگا تھا؛ ہر سال وہ ارادہ کرتا تھا کہ اپنے شہر جائے، اپنے دوستوں سے ملے؛ اس کے دوست کبھی کبھار اُس سے ملنے یا کوئی کام نکلوانے آتے رہتے تھے؛ اُن کی شادیاں ہوئیں، بچے ہوئے؛ پھر مصطفےٰ سن پینسٹھ کی جنگ میں ہلاک ہو گیا؛ وہ افسوس کے لیے اس کے گھر تک نہیں جا سکا، صرف خط لکھ کر چپ ہو رہا —— اور جب اقبال بیمار پڑ گیا تو اس نے اسے لاہور بلوا لیا اور بل طارق میو ہسپتال میں داخل کروا دیا؛ مگر ان بیس برسوں میں وہ ایک بار بھی ساٹھ ستر میل کا یہ فاصلہ طے نہ کر پایا تھا —— اب وہ کیسے اُس چوراہے میں جا کر کھڑا ہو؟ ہوٹل کے اس ایک کمرے نے یہ حقیقت اس پر ظاہر کر دی تھی کہ وہ اس شہر سے جا چکا تھا۔

"ابو . . ." اُس کے بیٹے کی سوئی ہوئی آواز آئی۔

آفتاب نے مُڑ کر دیکھا: "جاگ گئے ہو؟"

"عمران کے ابو نے نئی کرسی خریدی ہے۔"

"اچھا؟ کیسی کرسی ہے؟"

"وہ گھومتی ہے۔"

"اچھا۔"

ابھی اس بات کو چوبیس گھنٹے بھی نہیں گزرے تھے۔ کل شام فاروق اور عمران اُن کے باغیچے میں کھیل رہے تھے۔ آفتاب نہا دھو کر باہر نکل آیا تھا اور کرسی پہ بیٹھا ایک کیس کی بریف کا مطالعہ کر رہا تھا۔ سورج ابھی ابھی غروب ہوا تھا۔ نسرین اُس کے سامنے کرسی پہ بیٹھی ایک رسالہ پڑھ رہی تھی۔ آفتاب نے پاؤں چپلی سے نکال کر آہستہ سے زمین پر رکھ دیے۔ گھاس کی نرم نرم ٹھنڈک اُس کے تلووں کو آرام پہنچانے لگی۔ پڑھتے پڑھتے اس نے بے خیالی سے سر اُٹھا کر دیکھا تو اس کی نظر اپنے بیٹے پر پڑی —— اس ایک لمحے کی یہ ساری بات تھی۔

اُس کا دماغ وقت کے ایک نقطے پر منجمد ہو کر رہ گیا تھا —— اس نقطے کے اندر بہت سی باتیں ایک ساتھ تیزی سے ایک دوسری کے گرد گھومنے لگیں —— آج اُنیس جون ہے۔ کل بیس ہو گی۔ فاروق، میرا

بیٹا دس سال کا ہے۔ میں خود چالیس سال کو پہنچ چکا ہوں۔ تیس سال پہلے میں دس سال کا تھا۔ میرا باپ چالیس سال کا تھا ——— خیال کے اس نقطے کی گردش کے اندر ان متوازن عناصر کا یکجا ہو جانا ایک سحر کے مانند تھا جو کچھ دیر کے لیے اس کے اوپر طاری ہو گیا۔ اُس کی گود میں پڑے ہوئے کاغذات اور اُن پر تحریر داستان اور سامنے بیٹھی ہوئی اس کی بیوی، سب کچھ اُس کے دماغ سے خارج ہو چکا تھا ——— اسے محسوس ہوا کہ اس نقطے کی گردش کا ایک محور ہے جس میں ایک ایسی قوت ہے کہ وہ بے ساختہ اس کی جانب کھنچا چلا جا رہا ہے ——— آہستہ آہستہ اُس پہ یہ بات کھلی کہ یہ محور اُس کا شہر تھا۔

وہیں بیٹھے بیٹھے، بغیر سوچے آفتاب نے اپنے دل میں یہاں آنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے اپنی بیوی سے بات کی۔ اس کی بیوی کو اس بات کی سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ خود تو بیٹھے بیٹھے تیار ہو گیا ہے، مگر اس گرمی میں فاروق کا ہمراہ جانا کیوں ضروری ہے، مگر پھر وہ اس خیال سے خاموش ہو گئی کہ وہاں پر آفتاب کے ماں باپ کی قبریں تھیں، اور وہ کبھی وہاں نہیں گیا تھا۔

آفتاب نے اپنے اسسٹنٹ کو بلا بھیجا، اور اسے بیس جون کی عدالتی حاضریوں کے بارے میں ہدایات دیں۔

فاروق کو اُس نے اپنا شہر دکھانے اور وہاں پہنچ کر ایک بڑی دلچسپ کہانی سُنانے کا وعدہ کر کے تیار کر لیا۔

رات بھر وہ ٹھیک سے سو نہ سکا۔ اُس کا دماغ اُس نقطے پر مرکوز رہا، جیسے وقت ٹھہر گیا ہو، جیسے جیسے رات گزرتی گئی اُس کے دل میں یہ خیال پکا ہوتا گیا کہ یہ نقطہ ایک راز کا حامل ہے، اور ہو نہ ہو یہ راز وہ قدیم گرہ ہے جس نے تیس برس سے اُس کے دماغ کے ایک حصے کو مفلوج کر رکھا ہے ——— شاید اُس گرہ کے کھلنے کا وقت آگیا تھا!

"میں وہاں بیٹھا تھا۔" فاروق نے بستر پر لیٹے لیٹے کہا۔

"ہونہہ!"

"کرسی پر۔"

"اچھا . . . ؟" آفتاب نے بے خیالی سے کہا: "گھومتی ہے؟"

"ہاں، گول گول . . ." فاروق ہاتھ اٹھا کر ہوا میں گھماتے ہوئے بولا: "گول گول گول . . . ابو؟"

"ہوں۔"

"کیا وقت ہوا ہے؟"

"چار بجے ہیں۔"

"اب چلیں؟" بچہ کہانی سننے کے لیے بیتاب تھا۔

"ہاں . . ." آفتاب نے کہا: "چلو چلیں۔"

عصر میں کچھ وقت رہتا تھا ——— شہر ابھی سُنسان پڑا تھا، گو کہیں کہیں پر زندگی کے آثار نمودار ہونے لگے تھے، بازار میں دُکانیں کھل رہی تھیں اور کسی کسی حصے میں ترکاؤ کیا جا رہا تھا، گاہک ابھی گھروں سے نہ نکلے تھے، لیکن دُکانداروں کے پاس روزمرہ کے بیٹھنے والے دوست احباب آآ کر جمع ہو رہے تھے۔

سر پہ چھاتا تانے سایے کے اندر اندر چلتے ہوئے باپ اور بیٹا بازار میں پہنچ گئے ——— بازار میں پہنچ کر پہلی بار آفتاب کو کچھ چہروں کی پہچان ہوئی، مگر یہ پہچان کوئی اصل پہچان نہ تھی، بلکہ ایسی تھی جیسے درختوں یا مکانوں کی ہوتی ہے . . . دکانداروں کے قدیم چہرے تھے جنھیں وہ ہمیشہ ہمیشہ سے وہیں بیٹھے ہوئے دیکھتا آیا تھا، کچھ کی داڑھیاں سفید ہو چکی تھیں،

کچھ تقریباً ویسے ہی تھے۔ کسی نے آفتاب کی طرف توجہ نہ دی ——— آفتاب کالی عینک اور چھاتے میں چھپا چھپا بازار سے گزر گیا۔

وہ سرکلر روڈ کی جانب مڑا تو اس نے دیکھا، وہاں کونے میں منڈا کباب والا اپنا کام شروع کرنے کی تیاری کر رہا ہے۔ ڈربہ سی دکان کے تھڑے پر مٹی کی بنی ہوئی چھوٹی سی مستطیل بھٹی پڑی تھی۔ بھٹی میں اس نے کوئلے بھر دیے تھے مگر ابھی آگ نہیں لگائی تھی۔ منڈا تھڑے پہ بیٹھا ایک میلے سے گیلے چیتھڑے کے ساتھ اپنی پندرہ بیس سلاخیں ایک ایک کر کے صاف کر رہا تھا۔ بھٹی کے پاس ایک میلی سی کٹی پھٹی پنکھی پڑی تھی جسے وہ کوئلے دہکانے کے لیے استعمال کیا کرتا تھا۔ شاید یہ وہی پنکھی تھی جو بیس برس پہلے اس کے پاس ہوا کرتی تھی ——— ابھی کچھ دیر میں، آفتاب نے سوچا، بھٹی سے دھواں اٹھنے لگے گا اور پیٹ بھروں کو بھوک لگ جائے گی ——— شام کی نماز سے پہلے ہی یہاں لوگوں کا جمگھٹ پڑ جاتا تھا جو عشاء تک چھٹتا نہ تھا۔ جیسے ہی عشاء کی اذان ہوتی، منڈا اپنی سلاخوں کو قیمے کی خالی کنالی میں دھو دھا کر ایک طرف رکھ دیتا۔ بھٹی کو نالی میں انڈیل کر خالی کرتا تو راکھ میں ملے ہوئے چند سرخ کوئلے سوں سوں کر کے بجھ جاتے۔ پھر وہ بھٹی کو اٹھا کر اندر دکان میں جا رکھتا اور دکان بند کر کے گھر کی راہ لیتا ——— اس کا بایاں ہاتھ سلامت تھا اور دایاں کہنی سے ذرا نیچے تک کٹا ہوا تھا۔ مگر وہ اپنا سارا کام شروع سے آخر تک اکیلا کرتا تھا ——— جب سے آفتاب نے ہوش سنبھالا تھا، منڈا کبابی ایک ڈربہ نما دکان میں ایک چھوٹی تختی کے سائز کی بھٹی اور اپنے ایک ہاتھ کے ساتھ کام کرتا آ رہا تھا اور شہر بھر میں مشہور تھا ——— آفتاب نے سوچا، اگر وہ اپنی عینک اتار کر اس کے پاس جا کھڑا ہو اور اس سے بات کرے تو وہ ضرور اس کو پہچان لے گا ——— بچپن سے لے کر جوانی تک کے سارے عرصے میں ہر تیسرے چوتھے روز شام کو آفتاب اس دکان کے گرد لگے ہوئے جمگھٹ میں جا کھڑا ہوتا تھا اور اپنی باری کا انتظار کرنے لگتا تھا۔ پھر انتظار کے بعد جب اس کی باری آتی تھی تو اخباری کاغذ کے اوپر ترختے ہوئے گرم گرم کباب اور پیاز کی تیز چٹنی ہاتھ پہ رکھے، زبان کے نیچے سے ابل کر نکلتے ہوئے بھوک کے لعاب کو نگلتا ہوا وہ گھر کی طرف دوڑ پڑتا تھا ——— دکان کے پاس سے نکلتے ہوئے آفتاب نے مڑ کر دیکھا: منڈا اسی طرح سیخیں صاف کر رہا تھا۔

چند منٹ کے اندر وہ سرکلر روڈ پہ پہنچ چکے تھے ——— سڑک پر اب تانگے اور سائیکل سوار نظر آنے لگے تھے۔ دھول ابھی اٹھنی شروع نہیں ہوئی تھی۔

کچھ دور تک سرکلر روڈ پر چلنے کے بعد دونوں باپ بیٹا سڑک کے ساتھ ساتھ مڑنے کے بجائے سیدھے ایک ایسے راستے پر نکل گئے جو شہر کے وسطی حصے کو جرنیلی سڑک سے ملاتا تھا۔ آدھے میل کا یہ رستہ غیر آباد ہوا کرتا تھا، اب یہ پکی سڑک کی شکل اختیار کر چکا تھا جس کے دونوں جانب چھوٹی بڑی فیکٹریاں ہی فیکٹریاں تھیں۔ بیچ بیچ میں بڑی بڑی کوٹھیاں تھیں۔ یہ آبادی بالکل نئی تھی۔ ان فیکٹریوں اور کوٹھیوں کے ساتھ ساتھ گندے بدبودار پانی کے جوہڑ پیدا ہو چکے تھے جن کی سطح مچھروں سے سیاہ ہو رہی تھی ——— آفتاب تیز تیز چلتا ہوا اس علاقے سے نکل گیا۔

وہ جرنیلی سڑک پہ چڑھے تو دفعتاً آفتاب کو یوں محسوس ہوا جیسے وقت پلٹ کر کھڑا ہو گیا ہو۔ اس وقت کے اندر دنیا جوں کی توں قائم تھی، اور وہ اس دنیا کا سدا بہار بچہ پھر اس جگہ پر کھیلنے آیا تھا ——— شہروں اور عمارتوں کو چھوڑ کر اب زمین کی باری آئی تھی اور زمین اسی طرح قدیم اور جانی پہچانی تھی۔ سڑک کے دونوں جانب جہاں تک نظر جاتی تھی، وہی شیشم کے درخت کھڑے جھومتے تھے جن کی چھاؤں میں لو کی جلن گھلتی جاتی تھی۔

آفتاب نے چھاتا بند کر کے لپیٹ لیا اور کالی عینک اتار کر جیب میں ڈال لی۔ اب دھوپ اس کی آنکھوں کو تکلیف نہ دے رہی تھی۔

سڑک سے اُتر کر کھیتوں کا وہی نقشہ تھا: گیہوں کی فصل کاٹی جا چکی تھی۔ فصل کی چھوڑی ہوئی ننگی اور خشک زمین اُجاڑ پڑی تھی۔ اس کھردری زمین کی سطح پر چوہوں کے بے شمار بلوں کے سیاہ سوراخ تھے۔ ان سوراخوں کے مُنہ پر تازہ کھودی ہوئی بادامی مٹی کے چھوٹے چھوٹے ڈھیر پڑے تھے جن کے آس پاس کٹی ہوئی فصل کے بچے کھچے خشک تنکے بکھرے ہوئے تھے ——— آفتاب کو یاد آیا کہ یہ سوراخ بہت ڈراونے ہوتے تھے کیونکہ ان میں سانپ ہوا کرتے تھے۔ اب اُسے پتا تھا کہ یہ چوہوں کے بل ہیں مگر ان سوراخوں میں خوف ابھی موجود تھا ——— اُس نے اپنے بیٹے کو ان سوراخوں سے بچ کر چلنے کی ہدایت کی ——— ایک چارے کے کھیت کے کنارے سے گزرتے ہوئے جھک کر اس نے فصل کا ایک لمبا سا سبز پتہ توڑا اور اسے دانتوں میں لے کر چبانے لگا۔

ٹنڈ منڈ درخت والے کھیت میں وہ مرا ہوا قدیم درخت اسی طرح کھڑا تھا ——— آفتاب اُس سے چند قدم کے فاصلے پر مبہوت کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔ اُسے یقین نہیں آتا تھا کہ وہ درخت اُسی طرح اس کے سامنے کھڑا ہے۔ وہ اپنے دل میں سوچتا ہوا آیا تھا کہ درخت والی جگہ شاید اُسے تلاش کرنی پڑے گی ——— وہ درخت دیکھنا چاہتا تھا اور وہیں پہ رُک کر وہ فاروق کو اپنا قصہ سنانا چاہتا تھا۔ مگر جیسے ہی وہ جھاڑیوں کی ایک لمبی باڑ کو پار کر کے دوسری طرف نکلا تو سامنے وہ درخت اُسی کا اُسی طرح کھڑا تھا۔

آفتاب آہستہ آہستہ چلتا ہوا اُس کے پاس جا کھڑا ہوا۔ اس نے ہاتھ اُٹھا کر آہستہ سے درخت کی ایک ٹیڑھی مڑی ہوئی سیاہ شاخ کو چھوا، گویا ڈر رہا ہو کہ ہاتھ لگانے سے درخت کا درخت دھڑام سے نیچے آ گرے گا۔ درخت مضبوطی سے اپنی جگہ پر زمین میں گڑا کھڑا رہا۔ اُس کا ایک ایک ریشہ خشک اور مردہ ہو چکا تھا، مگر اس کی سختی میں، اُس کی کربناک تند اُٹھان میں، اُس کی زمین کی جکڑ میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ اس کی چھال کی اُبھری ہوئی لکیریں تک وہی تھیں، گویا وہ درخت اپنی موت کے ایک لمحے میں منجمد ہو کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے زمین کا ایک نشان بن گیا ہو ——— صرف اُس سے چند گز کے فاصلے پر شیشم کا ایک مہیب درخت نمودار ہو چکا تھا۔

آفتاب کو یہ درخت یاد نہیں تھا۔ تیس سال پہلے کے واقعے کے بعد اُس کا ادھر آنا چھوٹ گیا تھا۔ اس کی ماں نے زمین ٹھیکے پر دے دی تھی۔ پھر جب آفتاب جوان ہوا تھا تو چند بار اس کا ادھر آنا ہوا تھا، مگر اس وقت تک ڈسٹرکٹ بورڈ کی ایک کچی سڑک بن گئی تھی جو ان کے کنوئیں کے پاس سے نکلتی ہوئی احمد پور شریف تک جاتی تھی۔ وہ سائیکل پر اُس سڑک سے آیا جایا کرتا تھا۔

آفتاب نے سر اُٹھا کر شیشم کے گھنے درخت کی شاخوں میں دیکھا۔

"ابو میں تھک گیا ہوں۔" فاروق نے اپنے باپ سے کہا۔

آفتاب نے رومال نکال کر اپنے بیٹے کا چہرہ خشک کیا۔ "بس اب تھوڑی دُور رہ گیا ہے۔ . ." وہ فاروق کے بالوں میں انگلیاں پھیرتا ہوا بولا: "وہ دیکھو سامنے دکھائی دے رہا ہے۔"

"کہاں؟"

آفتاب نے ہاتھ سے اشارہ کیا: "وہ درختوں کا جھُنڈ دیکھ رہے ہو؟"

"ہاں۔"

"اس کے اندر کنواں ہے . . ." وہ بولا: "اس کے اردگرد کھیت ہیں۔ یہ ہماری زمین تھی۔"

"ابو . . ." فاروق نے کہا: "میں نہیں جاتا۔ میں تھک گیا ہوں۔"

"وہاں بڑی اچھی چھاؤں ہوگی . . ." آفتاب بولا: "یہ سامنے ہی تو ہے۔"

"اونہہ ہنہ ۔ ۔ ۔" بچہ ٹھنک کر بولا: "مجھے دھوپ لگ رہی ہے، میں نہیں جاتا۔" وہ جا کر شیشم کے نیچے بیٹھ گیا۔

آفتاب نے ایک طویل نظر اس مانوس سیاہ جھنڈ پہ ڈالی جو سامنے دو فرلانگ کے فاصلے پر وہیں کا وہیں موجود تھا۔ جلتی ہوئی دھوپ میں کھڑے کھڑے آفتاب نے اپنے گالوں پہ اس جھنڈ کی ٹھنڈی چھاؤں کو محسوس کیا؛ چھاؤں کا یہ لمس اتنا مانوس تھا اور اتنے قریب سے آیا تھا کہ گویا اس بات کو ابھی بیس دن بھی نہ گزرے ہوں جب وہ ان درختوں کے سایے میں بیٹھا سستا رہا تھا ——— اس کا حلق خشک ہو رہا تھا؛ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ وہاں جا کر ٹھنڈی لسی کا بھرا ہوا کٹورہ پیے ——— اب یہاں پر کون لوگ رہتے ہوں گے ؟ آفتاب نے حیرت سے سوچا۔

"ابو واپس چلیں۔" اس کے بیٹے نے کہا۔

چھاؤں کا وہ جھونکا پلک جھپکنے میں گزر گیا ——— آفتاب جا کر اپنے بیٹے کے پاس شیشم کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا: "ذرا دم لے کر چلتے ہیں۔" وہ بولا۔

"ابو، کہانی کب سنائیں گے۔" فاروق اکتائے ہوئے لہجے میں بولا، جیسے صبر کر کر کے تھک گیا ہو۔

آفتاب نے نظر اٹھا کر دھوپ میں دور دور تک دیکھا۔ سامنے وہ ننگا درخت اپنی ٹیڑھی میڑھی شکل لیے بے جنبش کھڑا تھا، جیسے کسی ڈراؤنے خواب کی شکل ہو۔

آفتاب نے جیب سے کالی عینک نکال کر آنکھوں پر لگالی، پھر وہ اپنے بیٹے کو کہانی سنانے لگا۔

دھیمی، ٹھہری ہوئی آواز میں آفتاب نے اپنے بیٹے کو تیس سال پہلے کا وہ قصہ سنایا جس نے اس کی زندگی کو جکڑ کے رکھ دیا تھا؛ گو یہ قصہ اول سے آخر تک جوں کا توں محفوظ تھا، مگر شروع شروع میں آفتاب کو بولتے ہیں وقت محسوس ہوئی؛ اُسے ایسا لگا کہ جیسے کوئی شے زمین میں گہری دفن ہے اور وہ کھود کھود کر اسے نکال رہا ہے، کچھ دیر تک وہ رک رک کر بولتا رہا۔ جیسے واقعات کو چن چن کر ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ رکھتا جا رہا ہو۔ مگر کوئی کڑی نہ ملتی ہو؛ پھر گویا اس کی آواز سے واقعات کے ان ٹکڑوں میں جان پڑنے لگی: جیسے جیسے وہ بولتا گیا، یہ پتلی پتلی لکیریں زمین پر پڑی پڑی سرسرانے لگیں اور پھر ایک دوسری کے گرد کنڈلی مار کر زنجیر کی شکل بنتی گئیں ——— آہستہ آہستہ آفتاب اس زنجیر میں بندھتا گیا اور اس کے خیال میں روانی آتی گئی؛ اس نے الفاظ کو اپنے منہ سے ننھے ننھے تیز پرندوں کی مانند پھر سے اڑ کر نکلتے ہوئے اور آواز کے رستے انھیں وقت کے ایک نقطے میں گم ہوتے ہوئے دیکھا ——— اس تپش آلود دوپہر میں درخت کے نیچے بیٹھے بیٹھے آفتاب نے اپنی عمر کی طویل ادھی سرنگ کو سکڑتے ہوئے دیکھا حتی کہ دور سے اس کا روشن سرا اس کی آنکھوں کے قریب آکر رک گیا اور اس نے ایک ایک بات کو، ایک ایک لمحے کو اپنی جلد کے اوپر سرسراتے ہوئے اس طرح محسوس کیا جیسے تیس برس کی کوئی حقیقت نہ ہو ——— جیسے وقت کی اور عمر کی اور آدمی کے بدن تک کی کوئی حقیقت نہ ہو بلکہ صرف ایک شے پر دنیا کا وجود قائم ہوا، وہ آدمی کے دل کی یاد ہو جو نسل در نسل دنیا کو باندھتی ہو۔ اس نے زمین سے نظر اٹھا کر اپنے بیٹے کے منہ بھک تپے سر کو دیکھا اور ہاتھ بڑھا کر اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا، جیسے زنجیر کا سرا اس کو منتقل کر رہا ہو ——— وہ اپنی کہانی کے اختتام کو آ پہنچا تھا۔

اس کہانی میں آفتاب نے صرف ایک بات کی تبدیلی کی تھی ——— اس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ جس شخص کے ساتھ وہ تیس برس پہلے آج کے روز شہر سے باہر گھومنے گیا تھا اور جس نے گھر واپس آکر کچھ کہے سنے اور ظاہر کیے بغیر اپنے آپ کو گولی مار لی تھی، وہ اس کا باپ تھا۔ یہ بات بتانے کی اس میں ہمت نہ تھی ——— اس نے کہا تھا کہ وہ

شخص اُن کا ایک ہمسایہ تھا۔

کہانی ختم ہوئی تو دونوں اُٹھ کھڑے ہوئے۔

واپسی پر دھوپ میں چلتے ہوئے آفتاب نے نہ کالی عینک نکال کر لگائی، نہ چھاتا کھولا۔ وہ سورج کی تپش سے بے نیاز ہو کر چلا جا رہا تھا۔ اس کا دل خالی ہو چکا تھا، مگر اس کا جسم ہلکا پھلکا اور مضبوط تھا۔ اُس کے ذہن میں اس وقت کوئی سوچ نہ تھی، مگر اس کے بدن میں ایک احساس تھا کہ اُس کے لڑکپن کا یہ شہر اس کا شہر تھا؛ یہ کھیت اور یہ درخت، یہ سڑکیں جن پر اب تانگے اور موٹریں دھول اُڑا رہی تھیں اور بازار جن میں اب تلفی اور فالودے کی ریڑھیاں بھی تھیں، اور موتیے کے ہار بیچنے والے نکل آئے تھے، یہ گلیاں جن میں عورتیں اپنے دروازوں کے بیچ دہلیزوں اور تھڑوں پہ بیٹھی پنکھیاں جھل رہی تھیں اور گرمی سے منہ کھولے سانس لیتی ہوئی باتیں کر رہی تھیں، اور بچے گرمی سے بے پروا مٹی میں گرتے پڑتے ہوئے کھیل رہے تھے، یہ گھر جن کے اندر کورے گھڑوں اور پیتل کے ٹھنڈے کٹوروں کے بجنے کی آوازیں آ رہی تھیں اور کسی کسی صحن سے لہسن اور پیاز کے بگھار کی تیز خوشبو نکل کر چاروں طرف پھیلتی جا رہی تھی؛ آفتاب کے بدن میں یہ ایک انمٹ احساس تھا کہ یہ ساری جگہیں اُس کی جگہیں تھیں —— بیس برس ہوئے، وہ اپنا شہر چھوڑ کر چلا گیا تھا مگر ان بیس برسوں میں جہاں جہاں بھی وہ رہا تھا، لاہور میں جہاں اس کا مکان تھا اور اُن شہروں میں جہاں کام کی خاطر اس نے کچھ وقت گزارا تھا اور دوسری جگہوں میں جہاں سفر کرتے ہوئے اس کا گزر ہوا تھا۔ یہ کیفیت کبھی اس پہ طاری نہ ہوئی تھی جو کیفیت اب اُس پہ طاری تھی؛ یہ کیفیت جو بدن کی بے خبری کی کیفیت تھی —— تیس برس تک اس کا دل شل رہا تھا مگر بدن ایک ایک لمحہ ایک بے نام اور بے نشان ڈر سے پھڑکتا رہا تھا، جیسے کسی آن کوئی عقب سے جھپٹ کر اسے دبوچ لے گا؛ اب یہاں جسم بے بوجھ تھا اور پٹھے آرام سے پڑے سستاتے تھے جیسے ان کو اپنی کوئی خبر نہ ہو؛ صرف دل ایک باخبر جگہ تھی —— پہلی بار زندگی میں آفتاب کو علم ہوا کہ وہ دو لفظ جو بارہا اس نے لوگوں کی زبانی سنے تھے: "میرا شہر"، ان دو لفظوں کے اصل معنی کیا تھے۔

ہوٹل کے آگے ایک مختصر سے باغیچے میں آفتاب اور فاروق آمنے سامنے کرسیوں پہ بیٹھے کوکا کولا پی رہے تھے؛ بوتلیں میز پر رکھی تھیں؛ برف کی لگی ہوئی بوتلوں پر دونوں باپ بیٹے کی انگلیوں کے نشان تھے؛ ان نشانوں سے اوپر شیشے پر بخارات کی تہہ جو اب ترخنے لگی تھی؛ اس کی صاف تنی ہوئی سطح پر جگہ جگہ جھول پڑ چکے تھے جو پانی کے ننھے ننھے قطروں کی شکل میں ڈھلک ڈھلک کر ٹیڑھے میڑھے راستے بناتے جا رہے تھے۔

شام پڑ رہی تھی۔ باغیچے کے گرداگرد تین تین فٹ کی دیوار تھی جس کے پرے سڑک پر تانگوں، موٹروں اور پیدل چلنے والوں کا دوسرا ریلا شروع ہو رہا تھا —— رات کی گاڑیوں کا وقت ہونے والا تھا اور تانگے والے سٹیشن کی ہانک لگا رہے تھے۔ شام کی سیر کے لیے لوگ نہا دھو کر، بالوں میں کنگھی کیے، سفید ململ کے کرتے پہنے سڑک پر آ نکلے تھے۔

فاروق اُٹھ کر دیوار کے قریب رکھی ہوئی ایک کرسی پر جا بیٹھا؛ اس نے کرسی سے ٹیک لگائی اور ٹانگیں باغیچے کی دیوار پر رکھ کر اپنا کومک پڑھنے لگا۔

چند منٹ کے بعد آفتاب نے اپنی بوتل اُٹھائی اور فاروق کے ساتھ والی کرسی پر جا بیٹھا: "کہانی اچھی لگی ہے؟" آفتاب نے پہلی بار اپنے بیٹے سے پوچھا۔

فاروق نے حلق سے نہ ہنسی نہ ہنسی کی بے معلوم سی آواز نکالی اور گھٹتے ہوئے اجالے میں کومک پڑھنے کی

کوشش کرتا رہا۔

ہوٹل کے برآمدے میں ایک چھوٹا سا ننگا بلب جل رہا تھا جس کی ناکافی روشنی اُن تک پہنچ رہی تھی —— آخر فاروق نے تھک کر نظر کو پلک سے اٹھایا: "ابو . . ." اس نے اچانک پوچھا: "آپ یہ کہانی لکھیں گے؟"

"شاید لکھوں۔" کچھ دیر رک کر آفتاب نے جواب دیا۔

"ابو . . ." فاروق پھر بولا: "اگر آپ کہانیاں نہ لکھیں تو سب سے بڑے وکیل بن جائیں؟"

آفتاب ہنس پڑا: "یہ تم سے کس نے کہا ہے؟"

"امی نے۔"

"وہ کیا کہتی ہیں؟"

"کہتی ہیں، اگر ابو کہانیاں لکھنے میں وقت ضایع نہ کریں تو سب سے بڑے وکیل بن جائیں۔"

آفتاب ہنس کر خاموش ہو رہا۔

"فاروق . . ." آخر آفتاب نے کہنیاں میز پر رکھ کر اپنے بیٹے کو مخاطب کیا: "میں یہ کہانی لکھوں؟"

فاروق نے پھر عدم دلچسپی کی ننھی سی آواز نکالی اور سڑک کو دیکھتا رہا۔

"پھر ایک بات بتاؤ۔" آفتاب نے بات جاری رکھی۔

"کیا؟"

"انھوں نے اپنے آپ کو گولی کیوں ماری تھی؟"

"پتا نہیں۔"

"نہیں بھئی، سوچ کر بتاؤ . . ." آفتاب نے اصرار کیا: "تم بتاؤ گے تو پھر کہانی لکھوں گا۔"

"کیوں؟"

"یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔"

فاروق چند سیکنڈ تک حیرانی سے اپنے باپ کے چہرے کو دیکھتا رہا، پھر ہولے سے منہ موڑ کر سڑک کو دیکھنے لگا، جیسے سوچ میں ہو۔ کچھ دیر تک دونوں باپ بیٹا چپ چاپ بیٹھے رہے —— آفتاب کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اُس نے اپنا بوجھ کہنیوں پہ ڈالا اور میز پر جھک گیا۔ اس کے بدن کا خدشہ لوٹ کر آ رہا تھا۔

اچانک فاروق نے پلٹ کر اپنے باپ کے چہرے کی طرف دیکھا —— فاروق کی آنکھوں میں چمک تھی: "شاید انھیں گھوڑے اچھے لگتے تھے۔" وہ بولا۔

آفتاب کی نظروں کے سامنے کی دُھند چھٹنے لگی؛ روشنی کا ایک مہین سا نقطہ اُس دھند میں پیدا ہوا اور آہستہ آہستہ پھیلنے لگا؛ اس شفاف دائرے کے اندر ایک فقرہ سیخ پا تھا؛ سورج کی روشنی اُس کے سفید بدن پر اِس تیزی سے چمک رہی تھی کہ نظر نہ ٹھہرتی تھی، اور تنے ہوئے جسم کا ایک ایک پٹھہ نمایاں تھا، جیسے پتھر سے کاٹا گیا ہو گھوڑے کی پشت پر ایک شہسوار اس کی باگیں تھامے جم کر بیٹھا تھا۔ سوار انگریزی فوج کے سپاہیوں کی سفید وردی اور ہیٹ پہنے تھا اور اس کے ہاتھ میں ننگی تلوار تھی جو آسمان کی جانب اٹھی ہوئی تھی۔ گھوڑا اور سوار اس طور ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے جیسے یک بدن ہوں، اور ایک ٹاپ میں زمین کو پھلانگ جائیں گے —— شام کے اندھیرے میں آفتاب کہنیوں کے بل جھکا، آنکھیں پھیلائے، اس حسن اور توازن کی چمک دار تصویر کو دیکھتا رہا، حتیٰ کہ دُھند کا حلقہ پھر اُس کی

نظر کے گرد تنگ ہونے لگا۔ وہ منظر جس تیزی سے ظاہر ہوا تھا، اسی تیزی سے غائب ہوگیا، مگر اس منظر کے ایک لمحے میں آفتاب کو اس بات کا علم ہوا کہ وہ اس کے باپ کی زندگی کا نفیس ترین لمحہ تھا۔

رات پڑ رہی تھی۔ ایک لحظے کی چمک اب گزر چکی تھی۔ اس اندھیرے میں اب ایک بات اور اس کے مقابل آ کھڑی ہوئی تھی ——— وہ شفاف لمحہ اپنے پیچھے اپنا سایہ چھوڑ گیا تھا، گویا ایک بات ظاہر ہوگئی ہو اور ایک پوشیدہ! یہ شہر، آفتاب سوچ رہا تھا، جہاں میرے باپ نے اپنی عمر گزاری تھی، میرے دل سے اتر گیا تھا؛ اور میں جو اس شہر کو چھوڑ گیا تھا، یہاں آکر دوبارہ زندہ ہوگیا ہوں۔ اس کے دل کی ایک الجھن دور ہوگئی تھی، تاہم ایک وہیں پہ موجود تھی ——— صرف ایک بات کا اُسے قطعی طور پہ علم تھا، کہ وہ اس شہر کا باسی ہے اور ہمیشہ رہے گا۔

اب رات پڑ گئی تھی۔ سڑک کی بتیاں روشن ہوگئی تھیں۔ سامنے والے کھمبے کے بلب کی روشنی باغیچے میں پڑ رہی تھی ——— اس مدھم روشنی میں فاروق ٹانگیں دیوار پہ رکھے پھر اپنے کومک کے ورق الٹ رہا تھا:
"ابو . . ." اچانک فاروق بولا: "میں بڑا ہو کر امریکہ جاؤں گا۔"

آفتاب نے چونک کر اپنے بیٹے کی طرف دیکھا۔ بچے کی آنکھوں میں چمک تھی۔

آفتاب آنکھیں پھیلائے اُسے دیکھتا رہا: "اچھا؟" اس نے بے خیالی سے کہا۔

"میں بڑا ہو کر ڈاکٹر بنوں گا اور امریکہ جاؤں گا۔" بچے نے کہا۔

اُس کی گود میں کومک کھلا پڑا تھا جس کے صفحے پر ایک دیو قامت سیاہ آدمی ایک چوڑی سی سڑک پار کر رہا تھا اور اُس کے پاؤں کے ارد گرد لمبی لمبی کاریں آ جا رہی تھیں ——— فاروق منہ موڑ کر سڑک کو دیکھنے لگا تھا، مگر اُس کی آنکھوں میں ایک دُور کی جھلک تھی۔

کچھ دیر کے بعد آفتاب کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس نے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا، جیسے کوئی بات کرنے والا ہو، پھر اُسے وہیں چھوڑ کر ہوٹل کی عمارت کے اندر چلا گیا ——— ہوٹل کے ہال میں چند لحظے تک رُک کر وہ اِدھر اُدھر دیکھتا رہا، پھر آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

چند منٹ کے بعد جب فاروق نے جا کر اپنے کمرے کا دروازہ کھولا تو اندر اندھیرا تھا۔ اُس نے اچک کر بتی جلا دی۔ اُس کا باپ اُسی طرح کپڑے اور بوٹ جرابیں پہنے اپنی چارپائی پر سیدھا لیٹا تھا۔ اُس کے دونوں ہاتھ ایک دوسرے سے ملے آرام سے اُس کے سینے پر رکھے تھے اور اُس کا چہرہ پسینے سے تر تھا ——— کمرے میں سخت گرمی تھی۔

"ابو . . ." فاروق بولا: "پنکھا چلا دوں؟" آفتاب کے جسم میں کوئی حرکت نہ ہوئی۔ فاروق چل کر اُس کے پاس جا کھڑا ہوا: "ابو۔" اس نے آہستہ سے پکارا۔

آفتاب نے آنکھیں کھول دیں اور چھت کو گھورنے لگا، گویا پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔

"چلا دو۔" اُس نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔

"ابو، مجھے بھوک لگی ہے۔"

آفتاب اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے غسل خانے میں جا کر منہ پہ ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے اور تولیے سے چہرہ خشک کیا۔ پھر وہ اپنے بیٹے کو لے کر کمرے سے نکل گیا۔

"ابو واپس کب جائیں گے؟" فاروق نے پوچھا۔

"صبح سویرے . . .!" وہ دونوں سیڑھیاں اُتر کر کھانا کھانے کے لیے چلے گئے۔

جلاوطن

I stood upon a high place,
And saw, below, many devils
Running, leaping,
And carousing in sin.
One looked up, grinning,
And said: COMRADE! BROTHER!

—*Stephen Crane*

اُن دنوں میں ہم اپنا اپنا کھانا ساتھ لے کر جاتے تھے اور دوپہر کے وقفے میں سب ایک ساتھ بیٹھ کر کھاتے تھے۔ دفتر میں مجھ سمیت کل سات آدمی تھے: تین کلرک، ایک ڈسپیچر، ایک ٹائپسٹ، ایک چپراسی اور سب کے اوپر ایک ہیڈ کلرک۔ چنانچہ جب بارہ کا گھنٹہ بجتا تو ہم کام چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوتے اور دو میزوں کو جوڑ کر اپنے اپنے کھانے کے ڈبے اُن پر لا رکھتے۔ پھر ہم پانچوں اپنی اپنی کرسیاں اٹھا کر اُن کے گرد لے آتے اور بیٹھ کر کھانا شروع کرتے۔ جتنی دیر تک ہم کھاتے رہتے چپراسی پاس کھڑا مستعدی سے ہر ایک کو پانی پہنچاتا رہتا۔ وہ چپراسی مجھے اب تک یاد ہے۔ کلرک کے عہدے سے ترقی کرتے کرتے میں ڈپٹی سیکرٹری بن گیا ہوں اور اس دوران میں کوئی دو درجن چپراسیوں سے میرا واسطہ پڑ چکا ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ ایسا ذہین چپراسی میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اُس کو ہمارے بارے میں قطعی طور پر علم تھا کہ کون کون کھانے کے دوران میں کس کس وقت پر پانی پینے کا عادی تھا۔ مثلاً یہ کہ ٹائپسٹ اوسطاً ہر پانچ لقموں کے بعد آدھا گلاس پانی پیتا تھا اور یہ کہ ڈسپیچر ایک گلاس کھانا شروع کرنے سے پہلے اور ایک کھانا ختم کرنے کے بعد چڑھاتا تھا وغیرہ وغیرہ۔ چنانچہ وہ یہ ظاہر کیے بغیر کہ ہمارا بغور مطالعہ کر رہا ہے، باری باری ہر ایک کے پاس اس کے مقررہ وقت پر بغیر مانگے ہوئے پانی کا گلاس

لے کر پہنچ جایا کرتا۔ اپنے اس معمول پر وہ اس سختی سے عمل کرتا کہ اگر کوئی بلا توقع اُس سے پانی مانگ بیٹھتا تو وہ اس کی طرف، اور پھر باری باری سب کی طرف، اس اچنبھے سے دیکھتا کہ مانگنے والا پانی پیے بغیر نادم ہو کر بات کو رفع دفع کرنے کی کوشش کرنے لگتا۔ اُس کی قابلیت کا یہ عالم تھا کہ گو میں نیا نیا دفتر میں نوکر ہوا تھا مگر چند ہی روز میں وہ میری اس عادت سے کہ میں کھانے کے ساتھ کبھی پانی نہیں پیتا بخوبی واقف ہو چکا تھا اور جب تک میں کھاتا رہتا میرے نزدیک بھی نہ پھٹکتا تھا ——— وہ ہماری عادتوں کے مطابق کام کرتا تھا یا کہ ہم اُس کے کام کے مطابق اپنی عادات وضع کرتے تھے، اس بات کا میں کبھی فیصلہ نہ کر سکا۔ جب ہم کھانا ختم کر لیتے تو وہ سب ڈبوں کو بند کرتا، ان کو اٹھا کر کونے میں رکھتا، میزوں کو جھاڑن سے صاف کرتا اور پھر باہر برآمدے میں جا کر اسٹول پر بیٹھ جاتا۔ وہاں بیٹھ کر وہ اپنا کھانا کھاتا۔ وہ اپنا کھانا خوب چبا چبا کر کھاتا اور ہر لقمے کے بعد جھاڑن سے مُنہ پونچھ لیتا۔ مختصر یہ کہ مجموعی طور پر ہمارا چپراسی ایک قابلِ ذکر شخص تھا۔

ایک اور قابلِ ذکر بات جو میں چھوڑ گیا ہوں، مندرجہ ذیل مکالمہ ہے جو کھانے کے دوران ہمارے درمیان ادا ہوتا۔

"دیکھو بھئی دیکھو۔ ۔ ۔" کوئی کہتا۔

سب آنکھوں کے کونوں میں سے ایک طرف کو دیکھتے۔

"ہی ہی ہی۔ ۔ ۔" کوئی دبی دبی ہنسی ہنستا۔

"ہی ہی ہی۔ ۔ ۔" سب ایک ساتھ ہنستے۔ پھر کچھ دیر تک جبڑوں کی چپ چپ اور برتنوں کی کند آوازیں اوپر آ جاتیں۔

"ارے ہاں یار، کبھی تو بلاؤ بیچارے کو۔" پھر کوئی کہتا۔

"ہاں یار۔ ۔ ۔ کسی روز یہ بھی تو کر کے دیکھیں۔"

"جانے دے یار، ایسا آدمی ہے کباڑیا۔ ۔ ۔"

"بھئی بلانے کو تو کبھی نہ کبھی بلا ہی دیکھیں مگر یہ نظارہ پھر کہاں ملے گا۔ بیکار میں روز کا شغل گنوا دیں۔"

"اور جو بیکار میں روز کی بلا گلے پڑ گئی تو؟"

"ناں بھائی ناں۔ ۔ ۔" کوئی کانوں کو ہاتھ لگاتا: "یہ بلا ہم گلے نہیں لیتے۔ وہ اسی انتظار میں ہے کہ کوئی جھوٹ موٹ ہی مدعو کرے۔ ذرا اس کی شکل دیکھو۔"

پھر سب کنکھیوں سے اُدھر دیکھتے۔

"ہی ہی ہی۔ ۔ ۔"

"بیچارہ۔ ۔ ۔"

"یار ایک بات بتاؤ۔ ۔ ۔" کوئی حیرت سے پوچھتا: "یہ اتنی دولت کو لے کر کہاں جائے گا۔ نہ کوئی آگے۔ نہ کوئی پیچھے۔ نہ رن نہ کن اور سالا کھاتا پیتا بھی نہیں!"

"ارے بعضوں کی قسمت میں ہی کچھ نہیں ہوتا۔ جنم جنم کے۔ ۔ ۔"

"ارے رے رے دیکھو دیکھو دیکھو۔ ۔ ۔"

"اُفوہ۔ ۔ ۔ اُفوہ۔"

پھر چڑیوں کی چپ چپ اور دبی دبی ہنسی کی آوازیں اور پانی کی غٹ غٹ ——— اور وہ ایک دیوار کے پاس بیٹھا بیچارگی سے ہنہ ہنہ کیا کرتا۔

"یار چندہ کر کے اس کے لیے الگ کھانا منگوا دیا کریں، ہیں؟" کوئی تجویز کرتا۔

"اور وہ وصیت میں تمھارے لیے بہت کچھ چھوڑ جائے گا نا، واللہ۔"

"ہاہاہا۔ ۔ ۔ واللہ"

"دیکھو دیکھو۔ ارے حد کرتے ہو یار۔ اب تو دیکھنے والا ہے۔"

"ہی ہی ہی ۔ ۔ ۔"

یہ ہمارا ہیڈ کلرک تھا جس کے بارے میں، تھوڑے بہت ادل بدل کے ساتھ، یہ مکالمہ قریب قریب ہر روز دہرایا جاتا اور جس میں کلرکوں کے طبقے کی وہ ساری کوششیں شامل ہوتیں جن سے کہ وہ اپنے افسروں میں تضحیک کا پہلو نکال کر اپنی بہت سی نا آسودہ خواہشوں کی تسکین کا سامان کرتے ہیں۔ اُس کی تھیلیوں والی آنکھیں اور راکھ کے رنگ کا مرجھایا ہوا چہرہ ایک ایسے شخص کا چہرہ تھا جو وقت سے پہلے بوڑھا ہو چکا تھا۔ اُس کے سر پر برف کی طرح سفید گھنے بال تھے جو اس چہرے پر ایک خاص قسم کا، کسی حد تک پریشان کن اثر پیدا کرتے تھے۔ اس کا جسم مدقوق تھا اور ہاتھوں اور گردن اور بازوؤں پر میلے نیلے رنگ کی رگیں اُبھری رہتی تھیں۔ اوّل تو وہ بات ہی بہت کم کرتا، اور جب بولتا تو ایسی آواز میں جو بہت دور کسی بند گنبد میں سے آتی ہوئی سنائی دیتی۔ سب سے پہلا خیال جو سننے والے کو ہوتا وہ یہ تھا کہ یہ آواز اصلی نہیں نقلی ہے، یا اس کی اپنی نہیں بلکہ مستعار لی ہوئی ہے یا یہ کہ اس آواز کو مار مار کر ادھ موا کر دیا گیا ہے یا کیا، بہر حال کچھ نہ کچھ ضرور ہے جو کسی نہ کسی طور اونچا ہے نیچا ہے یا ٹیڑھا ہے مگر بے ڈھب ہے اور اس چہرے سے یا اس آدمی سے یا آس پاس کی کسی شے سے میل نہیں کھاتا اور دوسرے آدمی کو بے چین کرتا ہے، خواہ مخواہ۔ ایسا اُس کی آواز کا اثر تھا اور ایسا اُس کے بات کرنے کا طریقہ تھا۔ جیسے کوئی بات ہے جو اس کے دل پر آتی ہے اور چلی جاتی ہے، آتی ہے اور چلی جاتی ہے یا رُک جاتی ہے یا روک دی جاتی ہے یا بالکل ختم ہو جاتی ہے، اور وہ رُک رُک کر، سوچ سوچ کر، جھجک جھجک کر اور گلے پر ہاتھ پھیر پھیر کر اپنا مطلب بیان کرتا تو کرتا یا آدھی بولی بات کر کے رہ جاتا اور دمے کے مریض کی طرح تیز تیز سانس لینے لگتا اور تھک کر کرسی کی پشت پر ٹیک لگا لیتا۔ اور نظریں پھیر لیتا۔ بعد میں تو میں اس کا عادی ہو گیا مگر جب میں نے پہلے پہل دفتر جانا شروع کیا تو یہ سوچ سوچ کر اکثر حیران ہوا کرتا کہ دنیا میں ایسے بھی لوگ ہیں جو محض ہم کلام ہو کر ہی اپنے مخاطب کے جسم میں سرد خون کی لہر دوڑا سکتے ہیں۔

وہ کبھی دوپہر کے وقفے میں کھانا نہ کھاتا تھا۔ سچ پوچھا جائے تو وہ کبھی دفتر کے اوقات میں کھاتا ہوا دیکھا نہ گیا تھا، اور دفتر کے باہر تو اس کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا کیونکہ کسی کو پتا نہ تھا کہ وہ کہاں پر رہتا ہے یا فارغ وقت میں کیا کرتا ہے۔ دوپہر کے وقت وہ صرف چائے کی ایک پیالی پیتا تھا جسے وہ چپراسی کے ہاتھ بارہ کا گھنٹہ بجنے سے پانچ منٹ پہلے منگواتا اور اچھی طرح ٹھنڈی کر کے پیتا۔ اس کا چائے پینے کا طریق بھی اس کے بات کرنے کے طریق سے مختلف نہ تھا، بلکہ کچھ اور بھی زیادہ انوکھا تھا، اس لیے کہ اس وقت اس کی شخصیت کا ایک اور قابلِ ذکر پہلو نمایاں ہو جاتا۔ بلا ناغہ یہ ہوتا کہ ہم سب لوگ کھانا کھا رہے ہیں اور وہ چائے کی پیالی آگے دھرے ہماری طرف ندیدے پن سے دیکھ رہا ہے، بس دیکھ رہا ہے، چائے کی پیالی کو اٹھاتا ہے اور کبھی اُسے سونگھ کر اور کبھی اُس میں اپنا عکس دیکھ کر اور کبھی اُسے لبوں سے چھو کر اور کبھی محض گھما کر واپس رکھ دیتا ہے اور دوبارہ ہمیں اور ہمارے کھانے کو ندیدی نظروں

ے ایک ٹک دیکھ رہا ہے۔ اُس وقت اس کے فاقہ زدہ چہرے پر ایک عجیب ناقابلِ بیان گرسنگی اور حسرت ہوتی جو اور قلمبند کیے گئے ہمارے مکالمے کی تشریح کرتی ہے۔ پھر جب ہم منہ چھپا کر ہنس رہے ہوتے یا پانی پی رہے ہوتے تو وہ جلدی سے پیالی کو اُٹھا کر چائے حلق میں اُنڈیل لیتا۔

ان ساری باتوں کے علاوہ —— اور ان کے باوجود —— اس میں ایک چیز تھی جو عموماً بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہے اور جس نے کہ اس کو، دُنیاوی لحاظ سے مکمل طور پر ناکام ہونے سے بچا رکھا تھا۔ یہ چیز اس کی ذاتی خود مختاری اور اس کی شخصیت کا وقار تھا۔ یہ بڑی عجیب بات ہے کہ ایک ایسی چیز جیسی کہ یہ ہے، اس شخص میں موجود ہو جس کا تفصیلاً ذکر میں نے اوپر کیا ہے، لیکن یہ حقیقت تھی کہ جب تک وہ ہم لوگوں کو دُور دُور سے دیکھتا رہتا اس کی آنکھوں میں حسرت اور بیچارگی اور کم مائیگی کی کیفیت رہتی مگر جونہی وہ اپنے کام کی طرف متوجہ ہوتا اس میں غرق ہو جاتا، اس کے ساتھ ایک ہو جاتا اور قلم کو ہاتھ میں گھماتے ہوئے اور اس کے دوسرے سرے سے کبھی ماتھے کو اور کبھی میز کو بجاتے ہوئے وہ کسی بہت بڑے اخبار کے بہت بڑے مدیر کی طرح لگتا جو کوئی عظیم اداریہ لکھ رہا ہو، اور اس وقت جب کاغذات پر نظریں جمائے جمائے جو وہ کوئی ہدایات ہمیں ان کے بارے میں دیتا ان میں تحکمانہ کھنک ہوتی اور جس خود مختاری سے وہ کام میں مدد کرنے کی ہماری ہر پیشکش کو رد کر دیتا وہ حیرت انگیز ہوتی۔ وہ قلم کا دھنی تھا اور جس ڈرافٹ کو وہ ایک مرتبہ تیار کر لیتا پھر سٹینو سے لے کر سیکرٹری تک کوئی اسے نہ بدل سکتا نہ اس کا جواب دے سکتا۔ اپنی میز اور فائلوں کی مختلف الماریوں کے درمیان اس کا دبلا پتلا، اپنے آپ میں کھویا ہوا جسم جنگل کے جانور کی ایسی آسانی، پھرتی اور وقار کے ساتھ حرکت کرتا۔ کاغذوں، فائلوں، میزوں، کرسیوں اور الماریوں کے ساتھ اس کا تعلق اس قدر آسان اور قدرتی سطح پر تھا کہ اس میں خوبیٔ کار کے علاوہ خود بخود ایک گریس پیدا ہو گئی تھی جو ہمیں اس کی عزت کرنے اور کسی حد تک اس سے ڈرنے پر مجبور کرتی تھی۔ یہی چیز تھی جس نے مجھے، کہ نیا نیا کلرک بنا تھا اور ابھی اس طبقے کی اس مخصوص ذہنیت سے بچا ہوا تھا جو کہ اسے کسی بھی نئے ذہنی تجربے یا تجسس کے قابل نہیں رہنے دیتی، اس سے بے لاگ دلچسپی لینے پر مجبور کیا۔ گو مجھے چند روز کے بعد ہی اس دفتر کی نوکری چھوڑنا پڑی اور اس کی شخصیت کے معمے کو حل کرنے کی خواہش کو میں دل ہی دل میں لے کر چلا آیا اور یوں یہ بات میری ان متعدد خالصتاً ذہنی ناآسودگیوں میں شامل ہو گئی جن سے ایک سوچنے والے انسان کو قدم قدم پر سابقہ پڑتا ہے۔

لیکن ان چند دنوں میں ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے بعد میں —— بہت بعد میں —— اس گتھی کے سلجھانے میں میری مدد کی۔ یہ واقعہ میرا اُس کے ہمراہ اس کے گھر جانے اور ایک گھنٹہ اس کی صحبت میں گزارنے کا تھا۔ یہ یوں ہوا کہ ہمارا چپراسی چھٹی پر تھا اور ہیڈ کلرک کو معمول سے زیادہ فائلیں گھر لے جانے کی ضرورت پیش آگئی اور چونکہ ایک خاص مقدار سے زیادہ کا بوجھ اُس کا ناتواں جسم اُٹھانے کے قابل نہیں تھا چنانچہ اُس نے مجھ کو، کہ سب سے جونیئر تھا، فائلیں اٹھا کر ساتھ چلنے کا حکم دیا۔

اس کا گھر نسبتاً غیر آباد علاقے میں واقع تھا جہاں تک پہنچنے کے لیے ہمیں شہر بھر کا چکر کاٹنا پڑا۔ میں گو کہ جوان آدمی تھا اس کی رفتار کا مقابلہ نہ کر سکا اور وہاں تک پہنچتے پہنچتے ہانپ گیا۔ جب میں نے سانس برابر کرنے کے لیے فائلوں کا بوجھ اس کی سیڑھیوں پر پٹکا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کا دم اتنا بھی نہ پھولا تھا جتنا کہ پل کے پل کو کسی سے آنکھ ملا کر بات کرنے سے پھول جایا کرتا ہے۔ جب ہم تالا کھول کر اندر داخل ہوئے تو اُس نے بڑی آہستگی سے دروازہ بھیڑ کر اندر سے کنڈی لگا دی۔ مکان میں پہنچتے ہی سب سے پہلے جس چیز پر میری نظر پڑی وہ جانور تھے۔ ڈیوڑھی

سے لے کر صحن اور اُس سے آگے برآمدوں اور سیڑھیوں اور چوباروں تک سارا مکان پالتو چوپایوں اور پرندوں سے اٹا پڑا تھا۔ سب سے پہلے دو درمیانے قد کے بلڈاگوں نے بھاگتے ہوئے آکر ہمارا استقبال کیا اور اگلی ٹانگیں اُس کی رانوں پر رکھ کر کھڑے ہو گئے۔ پھر برآمدے میں لٹکے ہوئے پنجرے میں سے طوطے نے "خوش آمدید" کہا۔ پھر ساتھ کے پنجرے سے مینا کچھ بولی جو میری سمجھ میں نہ آیا۔ پھر کھاٹ پر سے ایک ننھا سا سفید کتا جس کا چہرہ بالوں میں چھپا ہوا تھا، جمائی لے کر اٹھا اور بڑی نفاست سے قدم رکھتا ہوا آکر اس کے پاؤں میں لوٹنے لگا۔ برآمدے کے کونے میں ایک بڑے سے پنجرے میں رنگ برنگی چونچوں اور رنگ برنگے پروں والی ننھی ننھی بیسیوں چڑیاں تھیں جو ہمیں دیکھ کر پاگلوں کی طرح ہر ایک سمت میں اُڑنے اور گرنے اور پنجرے کے تاروں سے لٹکنے اور لبا لب شور مچانے لگیں۔ دوسرے کونے میں ایک اُس سے ذرا چھوٹا پنجرہ دھرا تھا جس میں بند ایک پالتو نیولا اپنی تھوتھنی اُٹھا کر تیزی سے اوپر نیچے چکر لگانے لگا جب کمرے کا دروازہ کھول کر ہم اندر داخل ہوئے تو سیاہ اور سفید بلیوں کا ایک جوڑا میز پر سے کود کر میاؤں میاؤں کرتا ہوا بڑھا اور پاس آکر اُس کی ٹانگوں سے جسم رگڑنے لگا۔ وہ ہر ایک کو اُس کے مزاج کے مطابق چھیڑتا، تھپکتا، کان مروڑتا، پاؤں میں دباتا، ہاتھوں میں اُٹھاتا یا دور سے ہاتھ ہلاتا، مسکراتا اور انھیں ان کے عجیب و غریب ناموں سے پکارتا ہوا سیدھا ڈرائنگ روم میں پہنچا۔

"بیٹھو . . . ." اس نے مڑ کر دیکھے بغیر کہا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ پھر وہ کوئی اور بات کیے بغیر فائلوں کے ساتھ مصروف ہو گیا۔ آدھی درجن چوپائے اُس کے ارد گرد ننگے فرش پر اور کرسیوں پر بیٹھے تھے اور وہ، بالکل ایسے جیسے دفتر میں کام کیا کرتا تھا، قلم کے دوسرے سرے سے کبھی ماتھے اور کبھی میز کو بجاتا ہوا کام میں گم تھا۔ صرف دو باتیں ایسی تھیں جنھوں نے کہ مجھے ذرا سا پریشان کر دیا۔ ایک تو یہ کہ کام کے دوران وہ برابر وقفے وقفے پر اپنے پالتوؤں کے نام لے لے کر باتیں کرتا جا رہا تھا، بڑی آسانی سے، قدرتی طور پر، جیسے لوگوں سے باتیں کی جاتی ہیں۔ اُن کے حال احوال پوچھ رہا تھا، ان کی ذرا ذرا سی کوتاہیوں اور بدتمیزیوں پر سرزنش کر رہا تھا اور بیچ بیچ میں ہاتھ بڑھا کر کسی ایک کو چھو بھی لیتا تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ ظاہری طور پر اُس نے مجھے بالکل نظر انداز کر دیا تھا۔

آخر میں تنگ آکر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس پر بھی اُس نے ادھر توجہ نہ دی تو میں پیٹھ پر ہاتھ باندھ کر بے مقصد کمرے میں پھرنے لگا۔ کمرے میں سوائے ایک درجن میز کرسیوں کے، جو ادھر اُدھر بکھری ہوئی تھیں، اور کچھ نہ تھا۔ صرف مغربی دیوار پر تین تصویریں لٹک رہی تھیں جن پر گرد کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ میں نے کنکھیوں سے گھر کے مالک کو دیکھا اور آہستہ سے پھونک مار کر ان کی گرد اُڑائی۔ پہلی تصویر ایک سیب کے سے گالوں اور چمکتی ہوئی آنکھوں والے صحت مند نوعمر لڑکے کی تھی جو سکاؤٹوں کی وردی پہنے ایک پہاڑی نالے کے کنارے کھڑا ہنس رہا تھا۔ اس کے چہرے پر نوعمری کے زمانے کا جمال تھا اور آنکھوں میں ستارے سے چمک رہے تھے اور اس کی مسکراہٹ میں ایک ایسی کشش تھی جس نے مجھے کتنی ہی دیر تک اس کو دیکھتے رہنے پر مجبور کر دیا۔ دوسری تصویر ایک نوجوان آدمی کی تھی جو سیاہ گاؤن پہنے ڈگری ہاتھ میں پکڑے بڑے اعتماد سے کھڑا تھا۔ سب سے گہرا تاثر جو اس کے چہرے پہ تھا اس کی پُرعزم نگاہوں کا تھا۔ وہ ایسے نوجوانوں میں سے تھا جو ستاروں پہ کمند ڈالتے ہیں۔ تیسری تصویر چند فوجیوں کی تھی جو جنگی لباس میں ملبوس کسی نامعلوم مقام پر ایک فوجی گاڑی کے پاس کھڑے تھے۔ بائیں طرف کو گروپ سے ذرا ہٹ کر ڈھلتی ہوئی عمر کا ایک شخص، جو بہر حال گروپ میں شامل تھا، رائفل کی ٹیک لیے تھکے ہوئے انداز میں کھڑا تھا۔ اُس کے چہرے سے انتہائی اکتاہٹ اور درماندگی مترشح تھی۔ اُس کی ہلکی ہلکی مشابہت اُس شخص سے تھی جو اس وقت

اس کمرے میں فائلوں پر جھکا ہوا تھا۔ ایک عجیب بات یہ تھی کہ تینوں تصویروں پر سوائے سن اور تاریخ کے اور کچھ بھی نہ لکھا تھا۔ پہلی اور دوسری تصویر میں تیرہ سال کا فرق تھا، دوسری اور تیسری میں صرف چھ سال کا تھا۔ تصویروں کو دیکھتے دیکھتے مجھے اچانک خیال ہوا کہ ہیڈ کلرک بڑی دیر سے مجھے دیکھ رہا ہے۔ جب میں مڑا تو وہ اسی طرح کام میں مصروف تھا۔ میں واپس اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گیا۔ کمرے کا فرش اور فرنیچر صاف شفاف تھا لیکن چاروں طرف ایک ایسی سرد اور نامانوس بو پھیلی ہوئی تھی جیسی خانقاہوں میں، یا پرانے کنوؤں میں ہوتی ہے۔ اس بو سے، اور پالتو جانوروں کی اجنبی اجنبی نگاہوں سے مجھ کو اندازہ ہوا کہ اس گھر میں گھر کے مالک کے علاوہ کسی دوسرے شخص کا گزر کم ہی ہوتا ہے۔

آخر تقریباً آدھ گھنٹے کے بعد اس نے تقریباً ایک درجن فائلوں سے نپٹ کر انہیں تہہ کیا اور ماتھے پر ہاتھ پھیر کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"آؤ چائے بنائیں . . ." وہ باہر جاتے ہوئے بولا۔

برآمدے میں رک کر اس نے طوطے کی کسی بات کا جواب دیا۔ پھر میں اس کے پیچھے پیچھے باورچی خانے میں داخل ہوا۔

"بیٹھو۔" اس نے کہا۔

سارے گھر میں یہی ایک جگہ تھی جہاں کا فرش گندا تھا۔ سب سے پہلے اس نے کونے میں سے برش اٹھا کر صفائی کی۔ اس دوران میں وہ برابر اپنے کتوں اور بلیوں کو جو ہمارے ساتھ ساتھ باورچی خانے میں چلے آئے تھے، دھیمے لہجے میں ڈانٹتا ڈپٹتا اور مختلف ہدایات دیتا رہا۔ پھر سٹوو جلا کر اس پر پانی رکھنے کے بعد اس نے شیلف پر سے چائے کا سامان اور برتن اتارنے شروع کیے۔ کمرے کے وسط میں ایک چھوٹی سی میز رکھی تھی، اس پر اس نے نفاست سے دو پیالیاں، چمچے اور چینی دان رکھے۔ کرسی صرف ایک تھی چنانچہ وہ بڑے کمرے سے جا کر ایک اور کرسی اٹھا لایا۔ پانی ابل گیا تو اس نے چائے دم کی، دودھ گرم کر کے برتن میں ڈالا اور پھر میز پر بیٹھ کر چائے بنانے لگا۔ اس سارے عرصے میں میں تقریباً مسحور بیٹھا اسے دیکھتا رہا تھا۔ وہ گھر کے کام میں بھی اسی طرح غرق تھا جیسے دفتر کے کام میں ہوا کرتا تھا اور یہ کام بھی وہ اسی طرح اپنے نپے تلے انداز میں اسی یقین اور خوبی اور خود مختاری اور صفائی سے کر رہا تھا جیسے کہ وہ کام، اور یہاں بھی وہ اپنے کتوں، بلیوں، طوطوں اور کھانے کے برتنوں کے درمیان اسی جنگل کے جانور کی ایسی آسانی اور پھرتی اور گریس کے ساتھ حرکت کر رہا تھا جیسے دفتر میں میزوں، کرسیوں اور فائلوں کی الماریوں کے درمیان کیا کرتا تھا۔ ہماری کرسیاں آمنے سامنے نہ تھیں۔ اپنی کرسی اس نے اس طرح رکھی تھی کہ میرا رخ شمال کی جانب تھا اور اس کا مغرب کی طرف۔ ہم نے خاموشی سے بیٹھ کر ایک ایک پیالی چائے پی۔

چائے پینے کے بعد اس نے شیلف پر سے ایک بہت بڑا کھلے منہ والا برتن جس میں ڈبل روٹی اور تندوری روٹی کے ٹکڑے بھگوئے ہوئے تھے اتار کر تینوں کتوں کے آگے رکھا۔ پھر ایک بڑے سے کٹورے میں دودھ ڈال کر بلیوں کو دیا۔ پھر اس نے ڈبے میں سے معجون نما ایک چیز نکالی اور اس کے دو حصے کر کے طوطے اور مینا کے پنجروں میں ڈالی۔ اس کے بعد اس نے چڑیوں کے پنجرے میں باجرے کے دانے پھینکے اور پانی کی پیالیوں کو بھرا۔ پھر اس نے نیولے کا پنجرہ کھول کر اس کو باہر نکالا، پنجرے کے اوپر سے ایک چھوٹے سے چمڑے کے پٹے کو اٹھا کر اس کی گردن میں ڈالا، اس میں پتلی سی زنجیر پھنسائی اور زنجیر کے سرے کو پکڑ کر سیڑھیوں کی جانب چل پڑا۔ نیولا کبھی

اس کے ساتھ ساتھ چلتا، کبھی چھلانگ لگا کر اُس کے جسم پر چڑھنے لگتا اور کندھے پر جا کر بیٹھ جاتا۔ ہم آگے پیچھے سیڑھیاں چڑھتے چوبارے پر نکل آئے۔

یہاں پر عجیب منظر تھا: چاروں طرف کبوتروں کی کابکیں ہی کابکیں تھیں جو ایک دوسرے کے اوپر رکھی چھت کو پہنچ رہی تھیں۔ جہاں کھلی چھت تھی وہاں اونچی اونچی مچانیں کبوتروں کے لیے لگی تھیں۔ کبوتروں کی خشک بیٹوں سے فرش بدرنگ ہو رہا تھا اور کابکوں کے اندر وہ غٹرغوں اور چوں چوں کا شور مچا رہے تھے اور ان کی بُو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ ایک ایک کر کے اُس نے کابکوں کے دروازے اُٹھانے شروع کیے اور کبوتر پھڑ پھڑا کر نکلنے لگے۔ چند ایک تو نکلتے ہی اس کے کندھوں پر اور سر پر بیٹھ گئے۔ باقی اُڑ کر مچانوں اور دیواروں پر جا بیٹھے۔ کچھ فرش پر بیٹھ کر پروں میں چونچیں پھیرنے لگے۔ ساری کابکیں کھول کر جب وہ لوٹا تو تقریباً ڈیڑھ سو کبوتر ہر قسم کے اور ہر رنگ کے ہمارے اردگرد موجود تھے۔

پھر اس نے ان کے پانی کے برتن بھرے اور ان کو دانہ پھینکنا شروع کیا۔ مچانوں اور دیواروں اور اس کے کندھوں پر بیٹھے ہوئے کبوتر غوطہ لگا کر دانے پر ٹوٹ پڑے۔ اب یہ منظر تھا کہ رنگ رنگ اور نسل نسل کے ڈیڑھ سو کبوتر مستقل غٹرغوں کرتے اور ایک دوسرے کو چونچیں مارتے ہوئے دانہ چگ رہے تھے اور وہ ان میں کھویا ہوا درمیان میں کھڑا تھا اور اس کے ہونٹوں پر بے نام سی مسکراہٹ تھی اور نیولا اس کے کندھے پر بیٹھا ہوا تھا۔

کتنا ہی وقت گزر گیا اور وہ اسی طرح کھڑا رہا۔ میں ایک بار کھنکارا، پھر دوسری بار، پھر تیسری بار۔ آخر مجھ سے نہ رہا گیا۔

"میں اب جاؤں؟" میں نے پوچھا۔

اس نے چونک کر سر اُٹھایا اور میری طرف دیکھ کر فوراً منہ پھیر لیا۔ جیسے کہ میری موجودگی کی اطلاع پا کر اس کو اچانک صدمہ ہوا ہو۔

"یہ کبوتر..." اس نے سنبھلتے ہوئے کہا: "تمھیں پسند ہیں؟"

"ہاں۔"

اس نے جھک کر بادامی رنگ کے سروں والے نہایت خوبصورت کبوتروں کا ایک جوڑا اُٹھایا۔

"یہ تم لے لو۔" اس نے کبوتر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ن . . . نہیں۔" میں نے کہا: "میرا یہ مطلب نہیں تھا۔"

اس نے آہستہ سے کبوتر چھوڑ دیے جو گرتے ہی دوبارہ دانہ چگنے لگے۔

"اتنے جانور . . . آپ نے کیوں رکھے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"جانور؟" وہ بے خیالی سے بولا: "ہاں، اچھے ہوتے ہیں۔"

"اچھے ہوتے ہیں؟" میں نے دہرایا۔

"ہاں۔"

میں آہستہ سے ہنسا۔ اس نے چونک کر سر اُٹھایا۔ میں پریشان ہو گیا۔

"ان کا فائدہ؟" میں گھبرا کر پوچھ بیٹھا۔

"فائدہ؟" وہ پہلی بار ہنسا، گہرا اور مختصر۔ پھر اس نے جھک کر سفید کبوتروں کا ایک جوڑا اُٹھایا اور انھیں چہرے کے قریب لا کر پیار سے بولا: "جب چاہو، انھیں پال سکتے ہو۔ چھو سکتے ہو۔" پھر اُس نے کبوتر میری

طرف بڑھائے: "یہ لے لو۔"

میں خاموش کھڑا رہا۔

"لے لو۔۔۔" اس نے کہا: "یا کوئی اور لے لو۔ جو بھی تمھیں پسند آئیں۔ یا طوطا لے لو۔ یا مینا۔ یا کتا لینا چاہتے ہو؟ چھوٹا کتا تم کو پسند ہے؟ وہ لے لو۔"

میں ہچکچاتا ہوا خاموش کھڑا رہا۔ اس نے پہلی بار سیدھا میری آنکھوں میں دیکھا اور آہستہ سے بولا: "لے لو!" پھر اس سے پہلے کہ میں اپنی جگہ سے ہلتا اس میں ایک عجیب تبدیلی رونما ہوئی۔ اس کی نظریں واضح طور پر لڑکھڑائیں، اور پھر جیسے ٹوٹ گئیں۔ اس نے جلدی سے کبوتر پھینکے اور ہچکچاتا ہوا نیچے اُتر گیا۔ جب میں کمرے میں داخل ہوا تو وہ اُن ایک درجن فائلوں کو جن سے وہ نپٹ چکا تھا، جلد جلد باندھ رہا تھا۔ پھر اس نے اُن کا بنڈل میری طرف بڑھایا اور رُک رُک کر، گلے کی رگوں پر ہاتھ پھیر پھیر کر چند الفاظ میں مجھے سمجھایا کہ میں ان کو گھر لے جاؤں اور اگلی صبح دفتر لے آؤں۔ پھر وہ کرسی پر بیٹھ گیا اور ہانپنے لگا۔ میں نے فائلیں بغل میں دبائیں اور چپکے سے چلا آیا۔

اگلی صبح اس نے کوئی ایسی بات یا ایسی حرکت نہ کی جس سے ظاہر ہوتا کہ ہم میں کوئی صحبت رہ چکی ہے۔ دوپہر سے پھر وہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ جبڑوں کی چپ چپ اور دھیمی دھیمی باتیں اور دبی دبی ہنسی اور پانی کی غٹ غٹ ——— اور وہ بیچارہ دیوار کے پاس بیٹھا ہمیں تکا کرتا۔

چند روز کے بعد میں نے بہتر ملازمت مل جانے کی بنا پر دفتر سے استعفیٰ دے دیا۔

کئی برس گزر گئے اور میں اس واقعے کو تقریباً بھول گیا، مگر پھر ایک بار مجھے ایک سرکاری کام کے سلسلے میں تہران جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں میرا قیام چند روز سے زیادہ کا نہ تھا مگر اپنی بیوی کے اصرار پر مجھے اس کو بھی ساتھ لے جانا پڑا۔ وہاں پر ایک روز ایک ریستوراں میں کھانا کھاتے ہوئے ہم نے ایک بہت بوڑھے شخص کو دیکھا جو عجیب حسرت بھری نظروں سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ کچھ کھائے پیئے بغیر اُٹھ کھڑا ہوا اور چھڑی ٹیکتا اور مُڑ مُڑ کر ہماری طرف دیکھتا ہوا باہر نکل گیا۔ اُس کے جانے کے بعد ہم نے ریستوراں کے ایک بیرے سے، جس سے اس نے چند باتیں کی تھیں، اس کے بارے میں دریافت کیا تو پتا چلا کہ وہ شہر لاہور کا رہنے والا ہے، اپنی جوانی میں وہاں آیا تھا اور پھر واپس نہیں گیا تھا، اُس نے وہیں پر شادی کر لی تھی اور اب تہران کے متموّل تاجروں میں شمار کیا جاتا ہے۔

اس پر مجھے یہ واقعہ یاد آ گیا جو اوائلِ عمر میں مجھے پیش آیا تھا، اور چشم زدن میں ——— یوں کہ جیسے ہم طوفانی رات میں کہیں جا رہے ہوں اور ایک جگہ ایک سیاہ شبیہ کو دیکھ کر رُک جائیں اور کھڑے رہیں اور دل میں ڈرتے رہیں کہ یکبارگی بجلی چمکے اور ہم پر انکشاف ہو کہ ارے یہ تو ایک جھاڑی تھی اور ہم بے خوفی سے گزر جائیں۔ یوں چشم زدن میں مجھ پر ساری بات واضح ہو گئی اور یہ معمہ جس کو میں بظاہر بھول چکا تھا اور جو دراصل برابر میرے ذہن کے کسی تاریک گوشے میں اٹکا رہا تھا اور برابر غیر محسوس طور پر میری ذہنی ناآسودگی میں اضافہ کرتا رہا تھا دفعتاً جیسے نکل کر باہر آ گیا اور جیسے بڑی صفائی سے حل ہو گیا اور میں نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر ٹانگیں پھیلا کر بڑی طمانیت سے مسکرا کر اپنی بیوی کو دیکھا جو ابھی تک کھانے میں مصروف تھی اور میری آسودگی سے تقریباً بے خبر تھی۔ اس وقت جو چند لمحے مجھ کو خالی ملے، اُن میں میں نے ذرا حیرت سے سوچا کہ کیسی عجیب بات ہے کہ بعض دفعہ ایک چھوٹی سی بات کے جاننے میں ایک

عمر لگ جاتی ہے، کہ جلا وطن اپنے قبیلے کی کشش سے کبھی چھٹکارا نہیں پا سکتا چاہے وہ اپنے قبیلے سے مایوس ہی کیوں نہ ہو چکا ہو —— کیسی عجیب بات ہے۔

جب ہم بل ادا کر کے باہر نکلے تو میری بیوی ابھی تک اس بات سے بے خبر تھی کہ آج میں اس برسہا برس پرانے واقعے کو قطعی طور پر اپنے پیچھے اس ریستوراں میں چھوڑے جا رہا تھا جس میں ابھی ابھی ہم نے کھانا کھایا تھا اور جہاں ابھی تک دوپہر کو دیر سے کھانا کھانے والے اکا دکا لوگ بیٹھے تھے اور جہاں سے کچھ دیر ہوئی کہ وہ بڈھا ہم وطن اٹھ کر گیا تھا جو میرے لیے طوفانی رات میں بجلی کا چمکارا ثابت ہوا تھا، اور کہ اب میرے لیے اس بات کا کلی طور پر بھول جانا کس قدر آسان ہو چکا تھا۔

ندی

ابھی ابھی بائرن کا خط آیا ہے اور مجھے ساری بات یاد آگئی ہے ——— دو برس پہلے کی بات جواب بھولتی جا رہی ہے۔

وقت کا ظلم اس طرح سے ہمارے ذہن کی تسخیر کرتا ہے اور اس طرح دل کی منزل کا پتا گم ہوتا ہے کہ ڈھونڈے نہیں ملتا۔ یہ منزلوں کا کوچ ہے جو فراموشی کی طرف رواں ہے اور یہ ہماری یاد کی رحم دلی ہے کہ منزل منزل پر ہمارا ساتھ چھوڑتی رہتی ہے۔ سارے وقتوں کی یاد کو لے کر ہم نہ چل سکتے ہیں نہ مستقبل کے اندھیروں میں شریک ہی ہو سکتے ہیں۔

یہ خزاں کی بڑی پُرامن اور شفاف سہ پہر ہے اور میں اپنے گھر کے سامنے ندی کے پُل پر بیٹھا ہوں۔ گھر کے برآمدے میں مجھے وہ میز نظر آرہی ہے جس پر صبح کی ڈاک سے آئے ہوئے تمام خط کھلے پڑے ہیں سوائے اس ایک خط کے جو میں نے تہہ کر کے قمیض کی جیب میں رکھ لیا ہے اور بار بار سینے پر ہاتھ پھیر کر قمیض کے اندر نفیس کاغذ کی کھڑکھڑاہٹ کو محسوس کر رہا ہوں اور اسے دوبارہ پڑھنا چاہتا ہوں مگر نہیں پڑھ سکتا کیونکہ خزاں کی زرد دھوپ میں بڑا امن ہے، اور پانی کے بہنے میں اور دُور دور تک ندی میں خشک پتے گراتے ہوئے زرد درختوں میں اور درختوں کے بیچ تھمی ہوئی ہوا میں اور نیچے زرد رنگ کے کھیت میں ہل چلاتے ہوئے کسان میں ایک ایسا پُرسکوت، پُرامن سحر ہے جو صرف خزاں کے موسم میں ہوتا ہے اور سہ پہر کے وقت میں ہوتا ہے اور جس میں کسی بدامنی، کسی خلل اندازی کی ذرہ بھر

گنجائش نہیں ہے۔ وہ کون تھا جس نے کہا تھا کہ دُنیا کا سب سے رقت انگیز، سب سے دل گداز منظر کسان کے زمین میں ہل چلانے کا ہے۔ غالباً کوئی مصوّر تھا۔ میں ایک بار پھر خط کو سینے کی جیب میں محسوس کرتا ہوں۔ میرے عین نیچے پانی میں دُور دراز کے منظر، گمشدہ محبوب چہرے بہتے ہوئے گزر رہے ہیں۔ وقت کا تلاطم تھمتا جا رہا ہے۔ ندی، میری عزیز دوست، اب میں تم سے مخاطب ہوتا ہوں۔

مغربی کینیڈا کی اس چھوٹی سی پہاڑی یونیورسٹی میں پہنچے ہوئے مجھے دوسرا دن تھا۔ سارا وقت بارش ہوتی رہی تھی۔ سہ پہر کے وقت ذرا کی ذرا کو بارش تھمی اور بادل پھٹ گئے۔ میں اکتا کر اپنے کمرے سے نکل آیا۔ دُھلی دھلائی ہوئی سیمنٹ کی کشادہ سڑکوں پر کہیں کہیں موٹر گاڑیاں کھڑی تھیں جن کی چھتوں پر میپل کے زرد اور قرمزی پتے گرے ہوئے تھے۔ ایک چھوٹی سی کار کے انجن پر چند لڑکے جھکے ہوئے تھے۔ انھوں نے سر اُٹھا کر اپنے مخصوص دوستانہ لہجے میں ہلو کیا۔ آگے لڑکیوں کا ہوسٹل تھا۔ سیڑھیوں پر کھڑی ہوئی چند لڑکیوں نے مجھے ناقدانہ نظروں سے دیکھا۔ آگے یونیورسٹی کا گرجا تھا جس میں سے نکلتے ہوئے نوجوان پادری نے مُسکرا کر مجھے سلام کیا۔ اس کے پیچھے پیچھے ڈائننگ ہال کا بُڈھا بیرا جم دودھ کی ایک خالی بوتل ہاتھ میں لٹکائے چلا آتا تھا۔ اس نے پائپ مُنہ سے نکالے بغیر میرا حال پوچھا اور گزر گیا۔ کیمپس پر دِن کے علاوہ یہی ایک شخص تھا جس سے اب تک میری واقفیت ہو سکی تھی۔ سردی ایک لخت بڑھ گئی تھی۔ ہوا کے زور سے میپل اور پائن کے درختوں پر رُکے ہوئے بارش کے قطرے ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔ میں نے سردی سے بچنے کے لیے کوٹ کا کالر اُٹھایا اور کومن رُوم کی طرف چلا گیا جو شام تک کھلا رہتا تھا۔

کمرے میں کوئی نہ تھا۔ کھڑکیاں بند تھیں اور باہر بارش پھر شروع ہو گئی تھی۔ میں سبز رنگ کے بے آواز قالین پر اِدھر اُدھر پھرتا اور کتابوں پر نظر ڈالتا رہا۔ میزوں پر اخبار اور رسالے بکھرے پڑے تھے ——— ہال میں کتابوں الماریوں، میزوں اور کرسیوں کی مخصوص بُو رکی ہوئی تھی۔ جیبوں سے ہاتھ نکالے بغیر میں نے چند رسالوں کے سرورق دیکھے، ایک میز پر بیٹھ کر اخبار پڑھنے کا ارادہ کیا، پھر دل ہی دل میں اس خیال کے بے ڈھنگے پن پر ہنسا اور ایک بڑے سے دریچے کے آگے جا کھڑا ہوا۔ بند شیشوں پر سر مارتے ہوئے بارش کے قطرے ہلکی ہلکی کُند آواز پیدا کر رہے تھے۔ پرے میپل کے درختوں پر سے زرد اور سُرخ اور سُرمئی پتے، جن کا وقت پورا ہو چکا تھا، بھاری تعداد میں نیچے آ رہے تھے اور بارش کے پانی میں تیر رہے تھے اور بہہ رہے تھے اور چکّر کھا رہے تھے۔ پرے گرجا گھر کی مخروطی چھت آسمان کی طرف اُٹھی ہوئی تھی۔ پرے سیاہ پہاڑیوں کا سلسلہ دُور تک چلا گیا تھا۔ اس سے پرے کہیں میرا وطن تھا کئی ہزار میل پر، میں نے سوچا۔ بیچ میں سمندر پڑتے تھے۔

”بند دریچوں کے باہر بارش بڑی عجیب لگتی ہے۔“ کسی نے کہا۔

بہت آہستہ آہستہ میں اپنی سوچ میں سے نکل آیا۔ چند لمحوں تک آسانی سے اپنے آپ کو سنبھالے کھڑے رہنے کے بعد میں چونک کر مُڑا۔ یہ ایک لڑکی تھی جو میری طرف پشت کیے ایک رسالے پر جھکی ہوئی تھی۔ بظاہر اس نے یہ الفاظ اپنے آگے پڑے ہوئے پرچے سے مخاطب ہو کر کہے تھے۔ اُس نے سُرخ رنگ کی بھاری سی اُونی سوئٹر پہنی ہوئی تھی اور آنکھوں پر پڑھنے کا چشمہ چڑھا رکھا تھا۔

”مجھے یوں لگتا ہے۔“ جھجکتے جھجکتے اس نے کہنا شروع کیا، پھر وہ مُڑی اور سیدھی میری طرف دیکھتے ہوئے بولی: ”جیسے کوئی راہگیر ناگہانی آ نکلا ہو اور ہمارے دروازے پر کھڑا ڈری ڈری دستک دے رہا ہو۔“

”کیوں ہوں . . .“ میں نے گلے میں سے ملی جُلی تائیدی آواز نکالی۔ اس کی آنکھیں اور بال شہد کے رنگ کے تھے۔

”مجھے ایسا ہی لگتا ہے۔ تمھیں بھی ایسا لگتا ہے؟“

”مجھے؟“ جواب کی تلاش میں میں نے دوبارہ حلق سے غیر یقینی، مگر شائستہ آواز پیدا کرنے کی کوشش کی۔

"تم کہاں سے آئے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"میں . . ."

"ٹھہرو ٹھہرو . . ." وہ بات کاٹ کر بولی: "مجھے بوجھنے دو۔ اررر . . . سپین؟"

"اوں ہنک!"

"نہیں؟" وہ اداس ہوگئی: "سپین سے تمھاری طرح کے لوگ آتے ہیں۔ سپین سے میرو بھی آیا تھا۔ دو سال ہوئے۔ میری اس کی بڑی دوستی تھی۔"

"پھر؟"

"اب وہ جا چکا ہے۔ بتاؤ کہاں سے آئے ہو؟"

"کسی اور ملک کا نام لو۔"

"نہیں۔ میں صرف یہ جاننا چاہتی تھی کہ تم سپین سے تو نہیں آئے۔ بتاؤ۔"

میں نے اُسے اپنے ملک کا پتا بتایا۔

"میرا نام بلانکا ہے۔" وہ پھر مڑ کر بیٹھ گئی: "میں ماہرِ لسانیات ہوں۔" اس نے خوش دلی سے کہا اور اس کے سفید ہموار دانت ہنسی میں کھل گئے: "یعنی یہ کہ میں لسانیات کی طالب علم ہوں۔ سینیئر۔ تم کیا کر رہے ہو؟"

میں نے اپنا نام بتایا، اور یہ کہ فزکس میں ریسرچ کرنے یہاں آیا ہوں۔

"ریسرچ سکالر؟" اس نے بھویں اٹھائیں: "شکل سے تو تم جغرافیے کے جونیئر دکھائی دیتے ہو۔"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی: "خیر فزکس بھی بڑا دلچسپ مضمون ہے۔ مگر لسانیات کی کیا بات ہے۔ اب اسی رسالے کو لے لو۔ اس کے سرِ ورق کا علم بھی تم نہیں رکھتے۔ رکھتے ہو؟"

میں نے قریب جا کر سنجیدگی سے اس اجنبی زبان کے حروف کو پڑھنے کی کوشش کی۔

وہ ہنس پڑی: "کبھی نہیں۔ یہ روسی ہے۔ میں روسی، ہسپانوی اور لاطینی پڑھ رہی ہوں۔ ہسپانوی میرا خاص مضمون ہے۔ میرو سے میں ہر وقت ہسپانوی بولا کرتی تھی۔"

"اب روسی کس سے بولتی ہو؟" میں نے کہا۔

"صرف اپنے پروفیسر سے۔ یہ بڑی مشکل زبان ہے، پر بڑی خوبصورت ہے۔ ابھی ابھی میں پیڑووسکی کی کہانی پڑھ رہی تھی۔ اگلے سال روس جا کر ریسرچ کروں گی۔ میں روس جانا چاہتی ہوں۔ ماسکو۔ اس شہر میں ایسا اسرار ہے۔ زار کا اور راسپوٹین کا ماسکو، ٹالسٹائی کا اور دوستووسکی کا اور نجنسکی اور پاپا کوفسکی اور پاسترنک کا ماسکو۔ اس شہر کا ایک کیریکٹر ہے، اپنی جگہ پر الگ اور انوکھا اور برگزیدہ اور پرکشش۔ جیسے پیرس کا اور روم اور آنا کا کیریکٹر ہے۔ ان جگہوں کے نام آتے ہی ذہن میں داستانیں جاگ پڑتی ہیں۔ نیویارک یہاں سے چند سو میل کے فاصلے پر ہے لیکن وہاں جانے کا خیال کبھی میرے دل میں نہیں آیا۔ ہوسکتا ہے کہ اگر میں وہاں جاؤں تو اس کی وسعت اور گرانڈیل پن سے مرعوب ہو جاؤں لیکن بہر حال وہ میرے لیے کوئی کشش نہیں رکھتا۔ میں شاید کبھی نیویارک نہ جاؤں۔ میں روس جانا چاہتی ہوں۔ تم بھی روس جانا چاہتے ہو؟"

"میں اپنے وطن واپس جانا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"اوہ . . ." وہ چشمہ اتار کر میز پر رکھتے ہوئے بولی: "تم مشرق کے رہنے والے بڑے جذباتی ہوتے ہو۔"

"میں جنوب مشرقی ایشیا کا رہنے والا ہوں۔" میں نے فخر سے اُسے بتایا۔

"گو ہسپانوی بھی بڑے جذباتی ہوتے ہیں۔" اس نے اپنی بات جاری رکھی۔

"تمھیں سپین سے عشق ہے؟"

"نہیں۔ . . ." وہ پھر اُداس ہوگئی: "لیکن میرو سے میرا بڑا بھائی چارہ تھا۔"

"بھائی چارہ؟"

"کیمپس پر تم کس کس سے ملے ہو؟" اس نے دفعتاً موضوع تبدیل کر دیا۔

مَیں نے اُسے بتایا کہ سوائے ڈین آف دی فیکلٹی آف سائنس کے، جس نے کہ آج رات مجھے کھانے پر بلا رکھا ہے، اور کھانا کھلانے والے بوڑھے حبشی کے میں اور کسی کو نہیں جانتا۔

"چلو اچھا ہوا کہ تم ادھر آ گئے اور مجھ سے ملاقات ہوگئی۔ میں بڑے کام کی آدمی ہوں۔" وہ پھر خوش دلی سے باتیں کرنے لگی: "یونیورسٹی کے ایک گروہ میں مَیں سخت غیر مقبول ہوں اور دوسرے گروہ میں بے حد ہر دلعزیز ہوں۔ قصہ مختصر یہ کیمپس بھر میں شیطان کی طرح مشہور ہوں۔ سارا سٹاف مجھ سے سخت نفرت کرتا ہے کیونکہ مَیں بے حد ذہین ہوں۔ تمھیں مجھ سے مل کر بے حد خوشی ہوگی۔ میری شخصیت بڑی رنگا رنگ ہے۔" اس نے عینک چڑھا کر مسخرے پن سے میری طرف دیکھا اور قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

خفیف سی بوکھلاہٹ کے باوجود میں بھی اس کے ساتھ جی کھول کر ہنسا۔ جب ہم ہنستے ہنستے رُکے تو ساری اجنبیت دُور ہو چکی تھی۔ مَیں نے کوٹ اُتار کر کھونٹی پر ٹانگا اور اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ دیر تک وہ مجھے یونیورسٹی کی ساری تاریخ، ٹرم کی ساری مصروفیات اور دلچسپیوں کے بارے میں بتلاتی رہی۔ مَیں نے اسے اپنے مُلک کے حالات اور اپنی طالب علمی کے زمانے کے چند قصّے سُنائے جن کو اس نے گہری دلچسپی سے سُنا۔ باہر بارش لگاتار ہو رہی تھی لیکن کمرے میں سنٹرل ہیٹنگ کی وجہ سے ہلکی ہلکی حرارت تھی اور اُس وقت اُس کے قریب بیٹھ کر باتیں کرتے ہوئے مجھے عجیب سے ذہنی سکون اور فراغت کا احساس ہوا۔ اس نے ہلکے مزاحیہ انداز میں اپنے قریبی دوستوں، ان کی چھوٹی چھوٹی تکلیفوں اور راحتوں اور اُن کی مسخرے پن کی حرکتوں کا ذکر کیا۔ باتیں کرتے کرتے وہ دفعتاً اُداس ہو جاتی اور پھر کھلکھلا کر ہنسنے لگتی۔ اس ایک گھنٹے میں مَیں نے اس کے چہرے کو کئی بار اُترتے اور چڑھتے ہوئے اور اس کی آنکھوں کو کئی بار رنگ بدلتے ہوئے دیکھا۔ آخر باہر جب اندھیرا بڑھ گیا اور بارش تھم گئی تو وہ کندھے جھٹک کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"اب یہاں کوئی نہیں آئے گا۔ چلو چلیں۔"

جب میں کھونٹی سے کوٹ اُتار کر پہن رہا تھا تو بالکل بھول چکا تھا کہ یہاں آئے ہوئے مجھے ابھی دوسرا دن ہے اور اس جگہ میں تقریباً مکمل اجنبی ہوں۔

"بچارے پٹرووسکی کی کہانی۔ . . ." وہ روسی رسالہ بند کرتے ہوئے بولی۔ اخبار اور رسالے سمیٹ کر ترتیب وار رکھتے ہوئے اس نے بتایا کہ کومن روم کا منتظم چونکہ ابھی تک نہیں پہنچا اس لیے ڈین نے چار لڑکیوں کی ایک ایک دن کے لیے ڈیوٹی لگا دی ہے۔

"آج میری ڈیوٹی تھی۔ کمبخت سب لوگ کہیں مر گئے ہیں۔ کوئی بھی نہیں آیا۔ سارا دن میں بڑی محنت سے اخباروں کو بے ترتیبی سے پھیلاتی رہی، جیسے کہ ابھی ابھی بہت سے لوگ یہاں سے اُٹھ کر گئے ہیں۔ تمھیں کچھ پتا چلا؟"

"تم بڑی مکار ہو۔" میں نے کہا۔ وہ بچوں کی طرح خوش ہوگئی۔

دروازے میں چابی گھماتے ہوئے اس نے رازدارانہ انداز میں بتایا: "تم نہیں جانتے یہ ڈین جنکنز سخت کمینہ آدمی ہے۔"

برآمدے کی سیڑھیوں پر رک کر اس نے احتیاط سے بالوں پر سُرخ سکارف باندھا، چہرے پر بارش کی مہین پھوار کو محسوس کیا اور ایک

مختصر سا، گہرا، جذباتی قہقہہ لگایا۔

"یہاں کی آب و ہوا کے بارے میں تو میں نے تمھیں بتایا ہی نہیں۔ یہیں پر، شاید تم نے نوٹ نہیں کیا، چاروں طرف پہاڑیاں ہیں جن پر اکثر بارش ہوتی رہتی ہے۔ اور جب خزاں کی پہلی بارش ہوتی ہے تو موسم یک لخت بدل جاتا ہے اور سردی بڑھ جاتی ہے اور میپلوں کے رہے سہے پتے بھی گر جاتے ہیں اور انسان کے دل میں فضا میں اُڑنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ . . . اس طرح . . . اگر میرے پر ہوتے ——— تو میں اُڑ کر اس شاخ پر جا بیٹھتی جہاں سے ابھی ابھی پتے گرے ہیں۔ اس طرح . . . اس طرح . . ."
اس نے پرندے کی طرح بازو ہوا میں پھیلائے اور دوبارہ منہ اوپر اُٹھا کر آنکھیں بند کر کے ہنسی۔

شام کی ملگجی روشنی میں اُس کی جلد میں سے روشنی اور خوشبو کی لپٹیں نکل رہی تھیں اور اس کی خوبصورت پیشانی پر خوشی کا نور تھا اور اس کے دانت سفید ہیروں کی طرح چمک رہے تھے اور سکارف میں سے نکلی ہوئی اس کے بالوں کی لٹ میری ٹھوڑی کو چھو رہی تھی۔
میں مبہوت کھڑا رہا۔

"تم بڑی خوبصورت ہو" میں نے اپنے آپ کو کہتے ہوئے سُنا۔
اس کے پھیلے ہوئے بازو آہستہ آہستہ نیچے آگرے: "اچھا؟" اس نے پوچھا۔
کوئی جواب نہ پا کر وہ میری طرف رُخ کر کے کھڑی ہو گئی اور چہرہ اوپر اُٹھا کر بولی: "مجھے چومو۔"
پریشانی کے مارے میں آنکھیں جھپکنے لگا۔
"چومو . . ." اس نے تقریباً درشتی سے کہا۔
میں نے جھک کر آہستہ سے اُسے پیشانی پر چوما۔
"بس؟" اس نے ایک لمبا سانس چھوڑتے ہوئے اطمینان سے پوچھا۔
"ہرگز نہیں" میں نے احتجاج کیا۔

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ میں سمجھتی ہوں" وہ رسان سے بولی: "ساری دنیا کی دوستی اور رفاقت کے بعد بھی مردوں کے دل میں ایک خواہش باقی رہ جاتی ہے، عورت کو مجبور کرنے کی، پابند کرنے کی خواہش، اور اُن کے پاس تخیل کی اس قدر شدید کمی ہوتی ہے کہ دُنیا جہان کے مسئلوں کے بعد اسی بات پر آکر ان کی تان ٹوٹتی ہے: 'تم بڑی خوبصورت ہو۔' اس کے بعد عورت کے دل میں غلط فہمی پیدا ہوتی ہے، کمزوری پیدا ہوتی ہے اور قید پیدا ہوتی ہے۔ اس کے بعد وہ محبوبہ بن سکتی ہے، دُکھ سہہ سکتی ہے اور دُکھ دے سکتی ہے لیکن دوستی نہیں کر سکتی . . . اور مجھے افسوس ہے سلطان حسین کہ میں صرف دوستی کر سکتی ہوں۔ بس! اب ٹھیک ہو گیا نا سلطان حسین! تمھارے سارے بکھیڑے میں نے آن واحد میں ختم کر دیے ہیں۔ تمھیں میرا شکر گزار ہونا چاہیے۔ اب ہم پھر برابر کی سطح پر آگئے ہیں۔ اب نہ تمھیں مزید بننے کی ضرورت ہے نہ مجھے۔ اب ہم دونوں آزاد ہیں۔ تم جہاں چاہو، جس وقت چاہو مجھے چوم سکتے ہو اور آزاد ہو سکتے ہو۔ سمجھ گئے؟"

میں خاموش کھڑا خفت اور برہمی کی وجہ سے ہونٹ کاٹتا رہا۔ اُس کا چہرہ اُتر گیا۔

"انہی باتوں کی وجہ سے میں لڑکوں کی اکثریت میں غیر مقبول ہوں، بلکہ بدنام ہوں۔ لیکن جو میرے دوست ہیں، بڑے عزیز دوست ہیں۔ اب تمھاری مرضی ہے جس گروپ میں چاہو شامل ہو جاؤ . . . چلو" وہ میرا ہاتھ پکڑ کر دوڑتی ہوئی سیڑھیاں اُتری۔

تاریک پھوار میں بھیگتے اور سڑک پر جگہ جگہ رُکے ہوئے پانی کو پھلانگتے ہوئے وہ پھر اپنے ہلکے، تمسخرانہ لہجے میں باتیں کرنے لگی: "ارے میں نے اپنے ذاتی کارنامے تو تمھیں بتائے ہی نہیں۔ پچھلے سال میں نے دانتے کی بیترس پر ایک مضمون لکھا

تھا جو بڑا مشہور ہوا اور جس پر سال کے بہترین مضمون کا انعام مجھ کو دیا گیا اور جو یونیورسٹی پریس نے کتابی صورت میں شایع کیا اور جس کا ترجمہ میرو نے ہسپانوی میں کیا اور میڈرڈ کے ایک پبلشر کو بھیجا جو سخت کمینہ نکلا اور اسے صاف ہضم کر گیا۔ بہرحال بڑا معرکۃ الآرا مضمون ہے۔ تمھیں دوں گی، اسے پڑھنا۔ تمھاری ذہنی تربیت کے لیے مفید ثابت ہوگا۔" وہ ہنسی: "اور تم آج ڈین کے ہاں کھانے پر جا رہے ہو، مجھ سے چند ٹپ لے لو ورنہ بڑے خسارے میں رہوگے۔ یہ ڈین رچرڈس بڑا کمینہ ہے، مجھ سے سخت نفرت کرتا ہے، کبھی کسی کو کھانے پر نہیں بلاتا۔ تم چونکہ ایشیا سے . . . معاف کرنا جنوب مشرقی ایشیا سے پہلے طالب علم آئے ہو اس لیے . . . لیکن تم نے اگر اُس کے کتے کی تعریف کر دی تو سمجھو بیڑا پار ہو گیا۔ اُس کے دروازے پر ایک ہاتھی نما جانور ملے گا۔ یہ سینٹ برنارڈ ہے۔ تم اس سے بالکل مت ڈرنا۔ بڑا غبی، کاہل اور نکما کتا ہے۔ لیکن اس کی تعریف کرنا مت بھولنا۔ اور بڑودا جنگ ڈین رچرڈس کی ہابی ہے، اس میں بے حد دلچسپی کا اظہار کرنا، ورنہ وہ سخت بُرا منائے گا۔ یہ باتیں اچھی طرح سے ذہن نشین کر لو۔"

"تم نے کہا کہ وہ تم سے نفرت کرتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ارے ہاں۔ وہ یوں ہوا کہ پچھلے کرسمس بال کے خاتمے پر رات کے گیارہ بجے جب ہم جکین ہال سے نکلے تو لڑکوں کے اصرار پر چوری چھپے ان کے ہوسٹل چلے گئے اور لاؤنج میں رقص کرنے لگے۔ انھوں نے دیوار پر ایک نیوڈ ٹانگ رکھی تھی۔ رات کا ایک بجا ہوگا کہ ڈین رچرڈس کو کسی نے خبر کر دی۔ تمھیں پتہ ہے کہ لڑکوں کے ہوسٹل میں ہمارا جانا منع ہے۔ خیر ہمیں وقت پر اطلاع مل گئی اور ہم میں سے چند تو صوفوں کے پیچھے چھپ گئیں اور جو باہر رہ گئیں وہ ترتیب سے کھڑی ہو کر کیرل (کرسمس کے بارے میں مذہبی گیت) گانے لگیں۔ جب ڈین ہمارے سر پر چڑھ آیا تو ہم نے معصومیت سے اُسے بتایا کہ ہم تو کیرل گاتی ہوئی یہاں سے گزر رہی تھیں۔ خیر جناب، ہم زور زور سے گاتے ہوئے باہر نکل آئے۔ اندر ڈین کی نظر نیوڈ پر جا پڑی۔ پھر تو وہ پانچ منٹ تک لال پیلا ہو کر گرجتا رہا اور جاتی دفعہ تصویر اتار کر لے گیا۔ اس کے جانے کے بعد ہم دیر تک میزوں پر بیٹھے سگریٹ پیتے اور بور ہوتے رہے۔ پھر کسی نے کہا کہ ڈین رچرڈس کا کارٹون بنایا جائے۔ یہ تجویز اتفاق رائے سے منظور ہوئی اور مجھے کارٹون بنانا پڑا جسے ہم نیوڈ کی جگہ ٹانگ کر اپنے ہوسٹل واپس آ گئے۔ لیکن صبح کسی بیوقوف نالائق چپڑاسی نے جا کر اسے بتا دیا کہ رات اُس کے جانے کے بعد ہم پھر وہاں پر موجود تھے اور یہ کہ بلانکا وئیمز نے اس کا کارٹون بنا کر دیوار پر ٹانگا ہے۔ وہ خود اُسے دیکھنے کے لیے وہاں آیا۔ اُس دن سے لے کر وہ مجھ سے سخت جلا ہوا ہے۔ لیکن میں اس کی پہنچ سے باہر ہوں۔ ڈین جنکنز مجھے بہت اچھا جانتا ہے۔ تم بہرحال اپنی خیر چاہتے ہو تو اسے مت بتانا کہ آج شام تمھاری ملاقات مجھ سے ہوئی۔ یہ دیکھو ہمارا گرجا ہے، کسی روز اندر لے چل کر تمھیں دکھاؤں گی۔ یہ ریفیکٹری ہے جہاں ہم دن میں تین بار زہر کھانے کے لیے جمع ہوتے ہیں۔ پرسوں بائرن آ جائے گا، اس سے ملنا۔ ایک دم ڈیوائن ڈارلنگ آدمی ہے۔ اچھا میری سرائے آ گئی، پھر ملاقات ہوگی۔ شب بخیر۔ . . ."

ٹرم شروع ہوئے تین روز ہو چکے تھے۔ میں دن بھر اپنے پروفیسر کے ساتھ لیبارٹریوں میں مارا مارا پھرتا رہا تھا۔ شام کو تھک ہار کر لوٹا۔ کپڑے تبدیل کر کے کھانا کھانے گیا اور واپس آ کر لیلیٰ کو خط لکھنے بیٹھ گیا۔

"بھائی جان، مجھے ساری جگہوں کی اور سارے لوگوں کی ساری باتیں لکھیے گا۔ اچھا؟" جب میں گھر سے چل رہا تھا تو اس نے اپنا چھوٹا سا منہ اٹھا کر کہا تھا۔

رات کے دس بجے ہوں گے۔ میں سونے کی تیاری کر رہا تھا کہ باہر اُن کا شور سنائی دیا۔ اس شور میں تیز، باریک نسوانی چیخوں کی آوازیں تھیں۔ میں جلدی سے سیڑھیاں اتر کر باہر نکل آیا۔ سڑک کے دو رویہ لڑکے کھڑے تھے۔ دور سے مشعلوں کا جلوس

چلا آرہا تھا۔ جب قریب آیا تو میں نے عجیب منظر دیکھا۔ سو ڈیڑھ سو لڑکیاں شب خوابی کے لباس میں ملبوس عجیب افراتفری کے عالم میں بھیڑوں کے گلے کی طرح ایک دوسرے سے لگی ہوئی بوکھلائے ہوئے چہروں کے ساتھ چلی آرہی تھیں، بھاگ رہی تھیں، رک رہی تھیں، لڑکھڑا رہی تھیں۔ گریبانوں کو سمیٹ رہی تھیں، تبسم چرا رہی تھیں، بالوں کو سنوار رہی تھیں، سردی سے کپکپا رہی تھیں، چیخیں مار رہی تھیں، رو رہی تھیں اور خجالت سے ہنس رہی تھیں۔ ان کے گرداگرد سینئیر لڑکیوں کا حلقہ تھا جو ہاتھ میں جلتی ہوئی مشعلیں لیے ان کو ہنکائے لیے جارہی تھیں۔ سڑک کے دونوں طرف لڑکوں کا مجمع قہقہے لگا رہا تھا۔ ایک مشعل کی روشنی میں میں نے بلانکا کو پہچانا۔ بائرن مجھے بتارہا تھا:

"یہ فراش[1] کا 'پاجامہ جلوس' ہے۔ یہاں کی بڑی پرانی روایت ہے۔ بچاری نئی نئی آتی ہیں۔ پہلے ایک دو روز تک سینئیر لڑکیاں داروغہ بنی ہوئی انھیں ساتھ ساتھ لیے پھرتی ہیں۔ جب انھیں دُنیا کی عمومی اچھائی پر یقین ہونے لگتا ہے تو ایک رات کو جب وہ بستروں میں گھس کر سونے کی کوشش کررہی ہوتی ہیں آگ آگ کا شور مچا کر ان کو اسی حالت میں باہر نکال لیا جاتا ہے اور سارے کیمپس پر ہانکا جاتا ہے۔ کئی لڑکیاں اس کے بعد صدمے کی وجہ سے کئی روز تک کلاسوں میں نہیں جاسکتیں۔ قاعدے کی رُو سے صرف دوسرے سال کی لڑکیاں اس چھوٹی سی کمینگی میں حصہ لیتی ہیں مگر بلانکا ہر سال ان میں شریک ہوجاتی ہے۔ پروفیسر اس بات کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔ ساتھ میں جین کو بھی کھینچ کر لے جاتی ہے۔ وہ جین ہے۔ وہ دیکھو بلانکا کے پیچھے۔ لائبریری سائنس پڑھ رہی ہے۔ یہاں سے فارغ ہوکر ہم شادی کررہے ہیں . . ."

جلوس کے گزر جانے کے بعد ہم دیر تک سڑک پر کھڑے باتیں کرتے رہے۔ آسمان پر بڑا سا چاند نکلا ہوا تھا جو اس کی بڑی خنک، شفاف، شیشے کی طرح کھڑکھڑاتی ہوئی رات تھی۔ میپل کے پتے ہمارے پاؤں پر گر رہے تھے۔ بائرن سے میں چار روز پہلے ملا تھا۔ اکنامکس کا پوسٹ گریجویٹ تھا اور بلانکا کے بہترین دوستوں میں سے تھا۔ بڑا سلجھا ہوا، خوش شکل، ٹھوس قسم کا نوجوان تھا۔ اس کے والدین آئرلینڈ سے آکر کینیڈا میں بس گئے تھے۔ ڈبلن کا، جو اسے تھوڑا تھوڑا یاد تھا، ابھی تک بڑے پیار، بڑی اداسی سے ذکر کرتا تھا، جس طرح ہم سب اپنے بچپن کی خواب ناک، خوبصورت جگہوں کو پیار اور اُداسی سے یاد کرتے ہیں۔ لیکن اُس رات سڑک کے کنارے رُک کر اُس سے باتیں کرتے ہوئے میرے دل میں نوجوانی کا اوّلین زور تھا اور میں اس بات سے بے خبر تھا کہ ساری اچھائی اور ساری نوجوانی اور ساری خوبصورتی کہانیوں کی طرح ہمارے خوابوں میں اور گمشدہ محبوب چہروں میں اور پارسال کے گرے ہوئے پتوں میں اور گزرے ہوئے وقت میں رہ جاتی ہے اور کبھی کبھار بہتے ہوئے پانی میں دیکھنے پر اور دیکھتے رہنے پر کہیں کہیں سے اُبھر آتی ہے، ڈوب جاتی ہے۔

مہینے کے وسط میں "خزاں کے رقص" کا موقع آیا۔ بائرن نے مجھ سے کہا: "کیوں نہیں تم بلانکا سے اپنے ساتھ چلنے کو کہتے۔"

"پتہ نہیں وہ جائے یا نہ جائے،" میں نے کہا: "اور پھر مجھے ناچنا واچنا تو آتا ہی نہیں۔"

"جہاں تک مجھے علم ہے وہ کسی ایک لڑکے میں آج کل دلچسپی نہیں لے رہی۔ تم پوچھ کر تو دیکھو۔" بائرن نے کہا۔

میں نے فون کیا۔ بلانکا نے معذرت کرتے ہوئے کہا وہ ایک اور لڑکے کے ساتھ جانے کا وعدہ کرچکی ہے، اور یہ کہ اُسے اس بات کا علم نہیں تھا کہ میرا اُس کی طرف خیال ہے ورنہ وہ ضرور میرے ساتھ جاتی، وغیرہ وغیرہ۔

بائرن کندھے اُچکا کر لاپروائی سے ہنسا۔ "کوئی بات نہیں۔ میں تمھارے لیے لڑکی کا انتظام کرتا ہوں۔"

---

[1]: پہلے سال کی لڑکیاں: فراش

لیکن شام سے پہلے پہلے بلانکا کا فون آگیا: "سلطان آف دی ساؤتھ ایسٹ ایشیا، تمھارے لیے میں نے ایک کوئین تلاش کرلی ہے۔" وہ کہہ رہی تھی: "اب انکار مت کرنا۔ پہلے سال کی بڑی ہی خوبصورت اور نازک مزاج لڑکی ہے۔ کل ہال جانے سے پہلے اُسے ہوسٹل کی سیڑھیوں پر سے لے لینا۔ اس کے لمبے لمبے سیاہ بال ہیں، تعارف خود ہی کرلینا۔ ازابلا اس کا نام ہے۔"

مغربی کینیڈا کے جنگلوں میں خزاں کے ہزاروں رنگ ہوتے ہیں۔ گرنے سے پہلے پتے زرد، سُرخ، سیاہ، سبھی رنگ بدلتے ہیں۔ جیکسن ہال میں خزاں کے رقص کی شام کو ان سارے رنگوں کی کاغذی جھنڈیاں لہرا رہی تھیں اور برقی قمقمے روشن تھے۔ ہال کے چکنے فرش پر آدھ گھنٹے تک ازابلا مجھے بال روم ڈانسنگ کے ابتدائی گر سمجھاتی رہی۔ پھر ہم تھک کر بیٹھ گئے اور ہلکی ہلکی گفتگو کی سعی شروع کی۔ اس کے لمبے دار سیاہ بال تھے اور براؤن آنکھیں تھیں اور چہرے پر تل ہی تل تھے اور سیدھا سادا جسم تھا۔ انگریزی ادب پڑھ رہی تھی۔ اگر اس میں دلربائی ذرا زیادہ ہوتی تو پُرکشش ہو سکتی تھی لیکن وہ بڑی سنجیدہ اور مخلص لڑکی تھی اور انگریزی ادب کے سوا اُسے کچھ نہ آتا تھا جس سے مجھے دور کا واسطہ بھی نہ تھا، چنانچہ گفتگو زیادہ دیر تک نہ چل سکی۔ جلد ہی ہم اپنے اپنے مشروبات کے گلاس تھامے کونے کی میز پر بیٹھے ہال میں اُوٹ پٹانگ ناچ ناچتے ہوئے قہقہے لگاتے اور گاتے ہوئے جوڑوں اور چھوٹے چھوٹے گروہوں کو اکتاہٹ سے دیکھنے لگے۔ دو ایک بار بائرن جین کے ساتھ رقص کرتا ہوا پاس سے گزرا۔ ازابلا سے رقص کی درخواست کرنے اور کوئی لڑکا ابھی تک نہ آیا تھا مگر وہ مطمئن تھی کیونکہ وہ پہلے سال کی اُن چند ایک لڑکیوں میں سے تھی جو باقاعدہ طور پر کسی مرد کے ہمراہ آئی تھیں۔ خزاں کا رقص فراش کے لیے عام تعارف کا موقع بھی ہوتا ہے، چنانچہ اُن میں سے زیادہ تر اکیلی آئی تھیں اور دو دو چار چار کر کے دیوار کے ساتھ ساتھ کھڑی تھیں۔ اسی طرح پہلے سال کے لڑکے چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بیٹھے تھے اور انھیں تاک رہے تھے۔ جب کسی پُرشور رقص کی دُھن اندھا دُھند بجنے لگتی تو وہ ایک ساتھ اُٹھتے، مجموعی جرأت کے بل پر آگے بڑھتے، سُرخ ہو ہو کر مُنہ میں منمناتے اور جو لڑکی سامنے آجاتی اس کے ساتھ ناچنے لگتے۔ میرے لیے یہ منظر مجموعی طور پر بڑا مزاحیہ تھا۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر زیادہ تر جوڑے تشکیل پا چکے تھے اور نئی دوستی کے جوش میں کھلکھلا کر ہنس رہے تھے۔ میں ازابلا سے گفتگو شروع کرنے کی ایک آخری کوشش کرنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"میں آپ کے ساتھ ناچنے کی سعادت حاصل کر سکتی ہوں؟" بلانکا نے نیم تمسخر، نیم سنجیدگی سے پوچھا۔ میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اُس کے بال چمکتے ہوئے سنہرے رنگ کے تھے۔ چند لمحے تک گھبراہٹ میں آنکھیں جھپکتے رہنے کے بعد میں ازابلا سے رسمی طور پر اجازت لے کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ ہم ہال کے فرش پر آگئے۔

"گنواروں کی طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مت دیکھو۔ بالوں کو رنگ کروانا میری ہابی ہے۔" رقص کرتے ہوئے وہ بولی۔

"اچھا؟"

"کاش کہ آنکھوں کا رنگ بدلوانے کا بھی کوئی طریقہ نکل آتا تو میں انھیں بھی رنگواتی۔"

"تمھارے بالوں کا اصل رنگ اچھا ہے۔"

"اوہ، سخت غلطی ہوگئی۔ تم سے پوچھے بغیر میں نے ایسی نازیبا حرکت کر دی۔ اچھا معاف کر دو۔ اگلی بار تم سے لکھ کر اجازت نامہ حاصل کروں گی۔"

"میرا مطلب یہ نہیں تھا۔" میں نے کہا۔

"اور کیا مطلب تھا؟" وہ بڑے یقین، بڑی لاپروائی سے بولی: "اچھا خاصا ناچ لیتے ہو۔"

"ابھی ابھی ازابلا سے سبق حاصل کیا ہے۔"

"ازابلا؟ ارے ہاں تم نے بتایا ہی نہیں۔ ازابلا پسند آئی؟"

"بہت۔"
"بڑی پیاری لڑکی ہے۔"
"بہت۔"
"بڑی ذہین ہے۔"
"بہت، بہت۔" میں نے جل کر کہا۔
ایک لمحے کو رُک کر اس نے میری طرف دیکھا، پھر مجھے کھینچتی ہوئی کوریڈور میں لے گئی۔
"مجھ سے خفا ہو؟" برآمدے کی نیم تاریکی میں اُس نے آنکھیں اُٹھا کر پوچھا۔
"نہیں۔"
"مجھے چومنا چاہتے ہو؟"
"نہیں۔"
"ازابلا کو۔"
"نہیں، نہیں۔" میں نے غصّے سے کہا۔
"کیوں؟"
"ہماری طرف اس کا رواج نہیں ہے۔"
اُس کا چہرہ اُتر گیا: "اسی لیے تم جذباتی ہو۔" وہ اُداسی سے بولی: "میرڈ بھی تھا۔ تم لوگ اُلجھنیں پیدا کرتے ہو۔ جذباتی آدمیوں سے مجھے ڈر لگتا ہے۔"
"اس لیے کہ تم خود جذباتی ہو۔" میں نے کہا۔
اس نے دہل کر میری طرف دیکھا، خفیف سا لڑکھڑائی، پھر سنبھل گئی۔ اندر رقص پورے شباب پر تھا۔ اونچی اونچی کھڑکیوں کے راستے ہال کی تیز روشنی کے ساتھ ساتھ باتوں اور قہقہوں اور گھسٹتے ہوئے پیروں کا ملا جُلا شور باہر آ رہا تھا۔ وہ ریلنگ کے ساتھ کھڑی تیز تیز پلکیں جھپکا رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھوں کی وہ غیر قدرتی چمک، وہ مسکراتا ہوا تمسخر لوٹ آیا جس سے وہ ساری دُنیا کا، ساری انسانیت کا مذاق اُڑاتی رہتی تھی، جس نے ایک لمحے کے لیے مجھے پاگل کر دیا۔ دفعتاً اس نے اُچک کر میری گردن میں ہاتھ ڈالا، سر نیچے کھینچ کر مجھے ہونٹوں پر چوما اور اندر بھاگ گئی۔
جب میں واپس آیا تو ازابلا غائب ہو چکی تھی۔ میں نے اُسے تلاش کرنے کی تکلیف نہ کی۔ اُس شام کو مجھے صحیح طور پر پتہ چلا کہ بلانکا لڑکوں میں کس حد تک مقبول تھی۔ میں نے یکے بعد دیگرے ایک درجن بار اُس کے ساتھ رقص کرنے کی کوشش کی لیکن اوّل تو میں اُس تک پہنچ ہی نہ پایا اور اگر کبھی چند قدم تک ناچ بھی لیا تو فوراً ہی کسی نے عقب سے آ کر میرے کندھے کو ٹھوکا دینا شروع کر دیا اور مجھے ہر دفعہ بادلِ ناخواستہ اس کا ہاتھ نووارد لڑکے کے ہاتھ میں دے کر پیچھے ہٹنا پڑا۔ ازابلا مستقل ایک دوسرے لڑکے کے ساتھ ناچ رہی تھی۔ ایک بار قریب سے گزرتے ہوئے رُک کر اس نے اپنے ساتھی سے میرا تعارف کرایا۔ چھوٹے سے قد اور کھڑے کھڑے کانوں والا پہلے سال کا لڑکا خورد بینی شیشوں والی عینک کے پیچھے خوشگواری سے مسکرایا۔ مجھے ان دونوں کو ساتھ دیکھ کر دلی خوشی ہوئی۔ ناچ کی آخری، تیز، پُرشور دھنیں بج رہی تھیں اور سینکڑوں تھکے ہوئے، گھسٹتے ہوئے پاؤں کا زور ٹوٹ رہا تھا۔
پھر شام کا آخری والز ہوا۔ دھیما اور نرم اور پُروقار اور شکل اور رومانٹک —— اس رقص کے ناچنے والوں کو دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ دُنیا میں اور کوئی ناچ نہیں ہے۔ میرے دل میں ایک نامعلوم سا، بے وجہ غصّہ آہستہ آہستہ بل کھا رہا تھا۔ وقتاً وقتاً

پر اس کو محسوس کرکے میں سخت متعجب ہوتا، اسے دبانے کی کوشش کرتا، پھر بھول جاتا۔ اس کی ہر دم مسکراتی ہوئی، طنز کرتی ہوئی، حقیر جانتی ہوئی آنکھوں میں، اس کی ہر دلعزیزی میں، اس کی طبیعت کے ہرجائی میلان میں ایک گہرا سربستہ مشتعل کرنے والا، پاگل کر دینے والا اسرار تھا۔ اس کے متبسم ہونٹوں کے خم میں ایک خاموش حقارت تھی جو ہر ایک سے یہ کہتی ہوئی معلوم ہوتی تھی: میں تمہیں جانتی ہوں۔ تم میرے سامنے کچھ بھی نہیں ہو۔ مجھ سے بچ کر کہاں جاؤ گے؟

شب بخیر کے شور میں کوٹ پہنے گئے۔ باہر رات سرد اور ویران اور خوشگوار تھی۔ موٹر گاڑیوں کے دروازے کھل رہے تھے، بند ہو رہے تھے۔ تھکی ہوئی آنکھیں بند ہو رہی تھیں، کھل رہی تھیں۔ میں ازابلا کے بازو پر ہاتھ رکھے باہر نکلا۔ سڑک کے کنارے وہ اپنے گروہ کے ساتھ کھڑی تھی۔

"ہلو بلانکا۔ شب بخیر . . ." میں نے جسم چرا کر نکل جانا چاہا۔

اس نے میرے بازو پر ہاتھ رکھا: "انسانوں سے اپنے آپ کو وابستہ مت کرو سلطان حسین، ورنہ انہی بھول بھلیوں میں رہ جاؤ گے۔ آزادی اصل چیز ہے۔" اس نے کہا۔

"اچھا؟" میں نے بے خیالی سے چاروں طرف دیکھا۔ رات کے آخری قہقہے لگائے جا رہے تھے، رات کے آخری بوسے لیے جا رہے تھے، بوسے جو میپل کے پتوں کی طرح ایک ایک کر کے یہیں گر پڑیں گے، قہقہے جو اس رات کی تاریکی میں منجمد ہو جائیں گے، جو ہمیشہ یاد آتے رہیں گے، اور ہمیں مدتوں جوان رکھیں گے، جو کہیں دکھائی نہ دیں گے اور بہتے ہوئے پانی میں شامل ہو جائیں گے۔

"شب بخیر سلطان۔"

"شب بخیر بلانکا، شب بخیر ازابلا۔"

"شب بخیر، بہت بہت شکریہ۔"

"تمہارا بھی شکریہ۔"

"شب بخیر، شب بخیر، شب بخیر۔"

میں اپنی پڑھائی میں پوری طرح مصروف ہو چکا تھا۔ دو ایک بار بلانکا سے ملنے کی کوشش کی لیکن وہ نہ ملی۔ وہ ہر وقت بہت مصروف رہتی تھی۔ چھٹی کے دن سہ پہروں کو میں اور بائرن آس پاس کے پہاڑی جنگلوں میں لمبی لمبی سیروں کو جاتے۔ جنگل بڑے خاموش اور رنگین ہوتے تھے۔ انہی سہ پہروں میں مجھے پتہ چلا کہ بائرن معاشیات کا طالب علم ہونے کے علاوہ چھوٹا موٹا فلسفی بھی ہے، اور یہ کہ وہ مستقل جستجو میں ہے لیکن ابھی تک اپنے آپ کو تلاش نہیں کر پایا۔ انہی جنگلوں میں اس نے مجھ سے کہا:

"بلانکا بڑی ابنارمل لڑکی ہے۔ اتنی کامیابی سے اپنے آپ کو چھپائے رکھتی ہے کہ کبھی کسی کو سمجھنے کا موقع نہیں دیتی۔ یہ اس کا آرٹ ہے۔ جو کچھ کہ وہ کہتی ہے اور کرتی ہے اس کے بالکل برعکس اس کی زندگی ہے۔ ایک وقت تھا جب میں خود اس کے پیچھے خاصا دیوانہ ہو رہا تھا۔ لیکن وہ میری دیوانگی کو پسند نہیں کرتی تھی اس نے کہا تھا: 'بائرن، تمہیں پتہ ہے ہم ایک اچھے دوست ہو سکتے ہیں . . . اگر تم یہ دیوانگی چھوڑ دو . . . تم اتنے پیارے آدمی ہو . . .' اس کے بعد میں سنبھل گیا۔ اب وہ میری عزیز ترین دوست ہے . . . لیکن کوئی شخص اس کے نزدیک جا کر اسے سمجھ نہیں سکتا۔ سب بے کار ہے۔"

وہ خاموش، حسین جنگل اور دھوپیلی سہ پہریں اور آہستہ آہستہ جاگتا ہوا، مضبوط ہوتا ہوا احساسِ رفاقت میری زندگی میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

پھر بائرن اچانک چند دن کے لیے غائب ہو گیا۔ اتوار کے روز بلانکا کا فون آیا: "سلطان۔ بائرن پر آرٹ کا دورہ پڑا ہے۔ وہ شہر میں اپنے کسی آرٹسٹ دوست کے ہاں چھپا ہوا ہے۔ مجھے بھی پتہ نہیں کہاں۔ صرف جین سے اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ اپنے آپ کو تلاش کرنے کی اُس کی یہ آخری منزل ہے۔ ہا ہا ہا۔ بے چارہ ڈیوڈ فنشر جیرالڈ بائرن۔ ۔ ۔"

میں نے اُسے بعد دوپہر سیر کو چلنے کی دعوت دی جو اُس نے تھوڑے سے تامل کے بعد منظور کر لی۔ جنگل اُسی طرح خاموش اور سحر آلود تھا اور چمکیلی دھوپ پتوں سے ڈھکے ہوئے راستوں پر پڑ رہی تھی۔ بلانکا مستقل باتیں کر رہی تھی، پچھلے چند روز کی مصروفیات کی باتیں، اپنے بے مثل، ہلکے، تمسخرانہ، اُداس لہجے میں۔

"یاد رکھنا، بائرن ایک نہ ایک روز اپنے آپ کو پا لے گا۔ میرا یقین ہے۔ اُس کے بعد وہ صحیح معنوں میں کوئی کام کر سکے گا۔"

"تم لوگ اپنے آپ کو کیوں اتنا پُراسرار بنائے رکھنے پر مصر ہو۔" میں نے چڑ کر پوچھا۔

"اسرار، میرے عزیز دوست، بڑی ضروری چیز ہے۔" وہ طنز سے ہنسی: "ہم بڑے کمینے لوگ ہیں، سب کے سب۔ ہمارے اندر بڑی کمزوری ہے، بڑی بد دیانتی ہے۔ اسے چھپانے کی خاطر، اپنی کشش کو قائم رکھنے کی خاطر ہمیں بہت سے اسرار کی ضرورت پڑتی ہے، سمجھ گئے؟ چلو اُس نوجوان جنگل میں چلیں۔ یہ بوڑھا جنگل مجھے پریشان کر دیتا ہے۔"

ہم پرانے جنگل میں سے نکل کر پتلے پتلے نو عمر درختوں والے جنگل میں داخل ہوئے۔ راستوں پر چڑھی ہوئی نوجوان، مُردہ پتوں کی تہہ پتلی اور سرد تھی۔ آخیر خزاں کی سردی کے اثر سے درخت ننگے ہو چکے تھے اور دھوپ ہر جگہ پھیلی ہوئی تھی۔ بلانکا ایک بڑی سی چٹان پر چڑھ کر بیٹھ گئی۔

"ابھی کچھ روز میں برف باری شروع ہو جائے گی۔ پھر یہ سارا سحر ٹوٹ جائے گا۔ پھر یہ ساری جگہیں ایک سی ہو جائیں گی۔ خزاں کا سحر اتنی کم عمر پاتا ہے۔ سارے سحر کم عمر پاتے ہیں۔ تم نے میرا پتہ کیا تھا؟"

"ہاں۔ پچھلے دو ہفتوں میں تین بار۔"

"کیوں؟"

"بس یونہی۔ تم سے ملنا چاہتا تھا۔"

"ملنا چاہتے تھے؟" اس نے بے خیالی سے دوہرایا۔

"تم مصروف تھیں۔ تم ہر وقت مصروف رہتی ہو۔"

میرے لہجے کو محسوس کر کے اُس نے سہم کر میرے بازو پر ہاتھ رکھا: "ٹھہرو۔ ۔ ۔ تم کہیں مجھ سے محبت تو نہیں کرنے لگے!"

"ہرگز نہیں،" میں نے ڈھٹائی سے کہا: "میں ایسی حماقت کرنے کا خیال بھی نہیں کر سکتا۔"

"تو ٹھیک ہے۔" وہ ہنسی: "پھر ہم میں دوستی ہو سکتی ہے۔ سب لوگ مجھ سے بغیر پوچھے محبت کرنے لگتے ہیں۔"

"تم کو بڑی خوش فہمی ہے۔" میں نے جل کر کہا۔

"خوش فہمی نہیں سلطان حسین صاحب، سچی بات ہے۔" وہ دوبارہ ہنسی: "ایک ایک کرنے لگتا ہے محبت مجھ سے۔ اس لیے کہ میں اُن سب لڑکیوں سے، جنہیں وہ جانتے ہیں اور جن سے وہ ملتے ہیں، اس قدر مختلف ہوں۔ یہ اُن کا قصور نہیں اور نہ میرا ہے۔ اور میں تمھیں ایک اور بات بتاؤں۔ تم چاہے جتنا بھی اکساؤ، میں کبھی خفا نہ ہوں گی۔ خوش فہمی کا طعنہ دینے کے بجائے اگر تم کہہ دیتے کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں تو بھی ٹھیک تھا۔ میں نے اس سے کہیں بُری بُری باتیں سُنی ہیں۔ ۔ ۔ اس کے باوجود ساری دُنیا سے میری دوستی ہے۔ ہے نا؟"

"ہوگی۔" میں منہ پھلا کر بیٹھا رہا۔

"دیکھو سلطان، اگر تم مجھے برداشت نہیں کر سکتے تو میں ابھی اٹھ کر جا سکتی ہوں۔"

"ارے نہیں بھئی۔" میں کھسیانا ہو کر ہنسا: "میں تو کچھ اور سوچ رہا تھا۔"

وہ ہنسی اور اپنے مخصوص تیز، کمینے، ناقابلِ تشریح انداز میں باتیں کرنے لگی۔

اس کے بعد ہم کئی بار جنگل کی سیر کو گئے۔ کبھی کبھی بائرن اور جین بھی ہمارے ساتھ آملتے اور ہم سیر کے بعد شہر جا کر اپنے محبوب ریستوران "ڈریگن" میں آئس کریم کھاتے، ورکافی پیتے اور کبھی کبھی جب کسی کے پاس پیسے جمع ہو جاتے تو حاتم طائی کی قبر پر لات مار کر کھانا بھی کھا لیتے۔ بائرن نے اب داڑھی رکھ لی تھی اور موسیقی اُس کا نیا 'جذبہ' بن چکی تھی۔ پڑھائی سے وہ غفلت برتنے لگا تھا اور جین اس کی ذہنی اور روحانی حالت کی طرف سے بہت فکر مند رہا کرتی تھی۔ ہم ہر وقت اسے تسلی دیتے رہتے تھے۔ وہ اس قدر شدید پیاری، سیدھی سادی لڑکی تھی کہ بعض دفعہ مجھے سچ مچ تاؤ آجاتا اور جی ہی جی میں بائرن کو بھرے بازار میں پکڑ کر دو چار رسید کرنے کو جی چاہتا۔ برف باری شروع ہو چکی تھی لیکن ہم باقاعدگی سے باہر جاتے رہے۔ ان دنوں میں غیر شعوری طور پر نِس کی بات بات میں معنی تلاش کر رہا تھا۔ اس کے ایک ایک اشارے، ایک ایک حرکت اور اس کی ہر دم متغیر طبیعت کے ایک ایک رنگ کو قریب سے دیکھنے اور ان کی مدد سے اس کی شخصیت کے معمے کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس وقت مجھے اس بات کا علم نہ تھا کہ میں غیر شعوری طور پر بہت آہستہ آہستہ اس کی محبت میں گرفتار ہوتا رہا ہوں۔ اس بات کا علم مجھے بہت بعد میں ہوا۔

کرسمس کی چھٹیاں شروع ہونے سے ایک روز پہلے کرسمس بال منعقد ہوا۔ میں نے بلانکا سے ساتھ چلنے کو کہا۔ وہ کچھ ٹال گئی۔

"کس کے ساتھ جا رہی ہو؟" میں نے اصرار کیا۔

کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے کہا: "مائکل کے ساتھ۔"

"مبارک ہو۔" میں نے کہا اور چلا آیا۔

شام کو اس کا فون آیا: "سلطان، تم ناراض ہو؟ مجھے افسوس ہے کہ اس دفعہ میں تمہارے ساتھ ڈانس پر نہیں جا سکتی۔ مائکل اس قدر نازک مزاج لڑکا ہے، اگر میں اس کے ساتھ نہ گئی تو اس کا دل ٹوٹ جائے گا۔ میں لوگوں کو سمجھتی ہوں۔ لیکن سنو، میں نے اپنی ماں سے فون پر بات کی ہے۔ تم کرسمس گزارنے میرے ساتھ چلو۔ ہمارے گھر۔ چلو گے نا! کہیں اور نہیں جا رہے؟"

"تمہیں یقین ہے کہ تمہارے گھر والے اس پر اعتراض نہیں کریں گے؟" میں نے کہا۔

"ارے نہیں پاگل آدمی، میری ماں نے خاص طور پر تمہیں مدعو کیا ہے۔ ہم کل شام کی ٹرین سے چلیں گے۔ . . چلیں گے نا؟"

گو میں اس کے مائکل کے ساتھ جانے پر اندر ہی اندر جلا بیٹھا تھا لیکن میں نے خوشی سے اُس کے گھر جانے کی دعوت کو قبول کر لیا۔

شام کو ناچ کے اختتام پر اُس نے کہا: "کل شام چھ بجے مجھے ہوسٹل سے لے لینا۔ افیم کھا کر مت سو جانا ورنہ گاڑی نکل جائے گی۔ باقی باتیں رستے میں بتاؤں گی۔"

'کرسمس مبارک۔ کرسمس مبارک' کے شور میں شام کا ہنگامہ ختم ہوا —— باہر برف گر رہی تھی۔

اگلی صبح بائرن نے سامان باندھتے ہوئے آکر مجھے بتایا کہ اُسے ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ بلانکا صبح کی گاڑی سے

جاچکی ہے۔ میں دومنٹ تک کھڑا دیوار کو گھورتا رہا۔ پھر فون کی طرف لپکا۔ اس کے ہوسٹل سے اس خبر کی تصدیق ہوگئی۔

"کوئی پیغام ہے؟" میں نے اندھیرے میں ہاتھ چلائے۔

"نہیں سلطان، تمھارے لیے کوئی پیغام نہیں۔" جین بول رہی تھی: "تم متوقع تھے ہے؟"

میں نے بدتمیزی سے فون بند کردیا۔ میں غصے سے پاگل ہو رہا تھا لیکن اب کیا کیا جا سکتا تھا، سوائے اس کے کہ بیگ میں بند کی ہوئی چیزیں کمرے میں پھیلا دی جائیں ——— چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔

دوپہر کے وقت بارٹن نے پھر میرے کمرے میں جھانکا اور کھڑے کا کھڑا رہ گیا: "ایں۔ ۔ ۔ یعنی یہ کیا حرکت۔ ۔ ۔؟"

"جی ہاں۔" میں گرجا: "ڈریسنگ ٹیبل ننگی تھی چنانچہ میں نے اسے اپنا پاجامہ پہنا دیا ہے، اور میرے بوٹوں کے دانت گندے تھے، میں نے انھیں ٹوتھ پیسٹ اور برش دے دیا ہے اور ٹیبل لیمپ کو بوٹ پالش کی ضرورت تھی، میں نے اس پر پالش کردی ہے اور باقی سب چیزیں بھی اپنی اپنی ٹھیک جگہ پر ہیں۔ آپ کو اس میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ یہ میرا کمرہ ہے۔ ۔ ۔ اب آپ تشریف لے جائیے۔"

وہ سخت مشکوک نظروں سے گھورتا ہوا باہر نکل گیا ——— پھر میں نے کھڑکی کا شیشہ اٹھایا اور برف کے اس چھوٹے سے ٹیلے کو، جسے پچھلے تین روز کی برف باری کے دوران میں بڑی احتیاط اور بڑے پیار سے پال رہا تھا، ایک زوردار گھونسے کی مدد سے توڑ پھوڑ دیا۔ جمی ہوئی برف کی نازک سوئیاں ہزاروں کی تعداد میں فضا میں بکھر گئیں۔ برف متواتر گر رہی تھی۔ ساری دنیا دودھ کی طرح سفید ہو رہی تھی۔ وائٹ کرسمس زندہ باد۔ سرو اور پائن کے درخت برف کے بوجھ سے جھکے ہوئے تھے۔ وائٹ کرسمس زندہ باد میری کرسمس گیٹ آؤٹ۔ نکل جاؤ یہاں سے۔ کرسمس کو باہر نکال کر میں نے کھٹ سے کھڑکی کا شیشہ گرا دیا۔ برف کے ننھے ننھے، بے آواز، خود سر پھویے اس پر سر مارتے رہے۔

دوسرے دن مجھے اس کا ایک مختصر سا خط ملا جس میں اس نے لکھا تھا کہ اس کو پورا احساس تھا کہ اس نے سخت بری حرکت کی تھی کہ مجھ کو اطلاع دیے بغیر بھاگ آئی تھی لیکن اس کی چند ایک ایسی وجوہات تھیں جو کہ ہم دونوں کی بہتری اسی میں ہے کہ مجھے معلوم نہ ہوں۔ صرف ایک اشارہ ان وجوہات کی طرف اس نے یہ کیا تھا کہ اس کا اپنی ماں سے جھگڑا ہو گیا تھا۔ میں نے خط پھاڑ کر پھینک دیا۔

کرسمس بہرحال میں نے اپنے پروفیسر کے ہاں گزاری۔ اس کے بعد کے چند دنوں میں مجھ پر سخت ڈپریشن طاری ہوا۔ انھی دنوں مجھے اس بات کا گمان گزرا کہ میں اس کی محبت میں بری طرح مبتلا ہو چکا ہوں۔ تھوڑی دیر کے لیے اس بات کو جان کر مجھے سخت حیرت ہوئی۔

جس روز دوبارہ کلاسیں شروع ہوئیں وہ مجھے لائبریری سے نکلتی ہوئی مل گئی۔ میں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ اس سے بات نہ کروں گا لیکن وہ مجھے ایسے ملی جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔

"ارے سلطان ڈیئر، کیسے رہے اتنے دنوں؟ میں تمھیں یاد کرتی رہی، سب دوستوں کو یاد کرتی رہی۔ بڑے موٹے تازے، لال سرخ نظر آرہے ہو۔ برف باری تمھیں راس آگئی ہے۔ ہے نا؟" اس نے پرانے بے تکلف، بے راز لہجے میں کہا۔

"بڑی شدید برف باری ہو رہی ہے۔" میں نے کہا۔

"آج ہم ڈرگن میں کھانا کھائیں گے۔ میں بڑی امیر ہو رہی ہوں آج کل۔ فکر نہ کرو۔ پھر باتیں کریں گے۔ بہت سی میں تمھیں بہت سی باتیں بتانا چاہتی ہوں، ٹھیک ہے؟"

اس سے پہلے کہ وہ اپنا ارادہ تبدیل کر دے، میں نے اس کی دعوت قبول کر لی۔ میرا سارا غم و غصہ آنِ واحد میں غائب ہو چکا تھا۔ ڈفل کوٹ اور سُرخ رنگ کے سکارف میں وہ بڑی دلکش نظر آ رہی تھی۔ میں اسے قریب سے دیکھ کر مسکرا دیا۔ ہمیشہ اسی طرح ہوتا تھا۔ جو لڑکے اسے کیمپس بھر پر بدنام کرتے پھرتے تھے، پہلی فرصت میں اس کے ارد گرد جمع ہو کر دانت نکالنے لگتے تھے۔

اُسی شام ہم ڈریگن کی ایک میز پر آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ صبح کا ملکا پن غائب ہو چکا تھا اور میری طبیعت کی کدورت پھر اور آگئی تھی۔ پچھلے آدھ گھنٹے میں ہم دونوں میں سے کسی نے بھی بات نہ کی تھی۔ اب ہم کافی کا انتظار کر رہے تھے۔

"تمھیں میرا خط ملا تھا؟" آخر اس نے پوچھا۔

"ہاں۔"

"پھر بھی خفا ہو؟"

"نہیں . . . تمھارا کرسمس کیسے گزرا؟"

"بڑے مزے میں۔"

"تمھاری ماں تم سے جھگڑنے کے لیے ہمیشہ کرسمس کے موقع کو منتخب کرتی ہے۔"

"سلطان،" وہ سانس روک کر بولی: "تمھارا خیال ہے میں نے جھوٹ بولا ہے؟"

"اگر جھوٹ بھی بولا ہو تو میں کیا کر سکتا ہوں؟"

"کمینے . . ." اُس نے چیخ کر کہا۔ پھر مجھے آنکھیں جھپکتا ہوا دیکھ کر ہنسنے لگی: "بس؟ اپنا آخری وار بھی کر لیا نا تم نے! تم لوگ بڑی جلدی اپنا سرمایہ ختم کر دیتے ہو۔ غلطی میری تھی لیکن تم معاف بھی کر سکتے تھے۔"

"بلانکا تم . . ."

"انسانوں سے بہت زیادہ وابستگی کا یہی نتیجہ ہوتا ہے۔"

"میری بات سنو!" میں آگے جھک کر چلایا: "تم نہیں سمجھتیں۔ تم . . ."

"ششش . . ." ہونٹوں پر انگلی رکھ کر وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ آس پاس کے لوگ ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ کاؤنٹر پر پہنچ کر اُس نے پیسے دینے چاہے۔ میں نے بد اخلاقی سے اُس کا ہاتھ پیچھے ہٹا کر بل ادا کیا اور باہر نکل آیا۔

گرم گرم ریستوراں میں سے نکل کر یخ بستہ ہوا کے تھپیڑے ہمارے چہروں پر آ کر لگے اور برف کے پھوے ہماری پلکوں پر اٹکنے لگے۔ برف کے طوفان میں سر اور مُنہ لپیٹے ہم دیر تک خاموشی سے سڑکوں اور گلیوں میں چلتے رہے۔ شہر کے اس حصے سے میں نا واقف تھا۔

"کہاں جا رہی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"چپکے سے میرے ساتھ چلے آؤ۔" اُس نے سرو کے پودے پر سے برف اُٹھا کر مُنہ میں رکھتے ہوئے کہا۔

آخر وہ ایک دروازے کے آگے پہنچ کر رُک گئی۔ دو بار گھنٹی دینے کے بعد ایک لڑکی نے دروازہ کھولا۔ بلانکا کو دیکھتے ہی وہ چیخ مار کر اُس سے لپٹ گئی۔ پھر فوراً الگ ہو کر میری طرف بڑھی۔

"میرا نام اینا ہے۔" اس نے بے تکلفی سے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا: "سب لوگ تہہ خانے میں ہیں۔" وہ مُڑ کر بلانکا سے بولی۔

اس نے تنگ موری کی سیاہ پتلون اور ڈھیلی ڈھالی گرے رنگ کی سویٹر پہن رکھی تھی اور اس کے بھورے رنگ کے لمبے لمبے سیدھے بال تھے اور اُس نے سیاہ فریم کا چشمہ لگا رکھا تھا —— میں نے اُسے بددلی سے دیکھا ——

اس کے پیچھے پیچھے ہم تہ خانے میں اُتر گئے۔ یہ بہت چھوٹا سا کرہ تھا اور سگریٹ اور سگار کے دھوئیں سے بھرا ہوا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی مجھے اچھو لگا۔ جب میں سنبھلا تو دو چار لڑکے اور لڑکیاں ایک ساتھ بلانکا سے باتیں کر رہے تھے۔ میں نے کمرے کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک نگاہ ڈالی اور میرا سر چکرانے لگا۔ ایک ہاتھ دیوار پر رکھ کر میں نے دوسری نظر ڈالی۔ کمرے میں دُنیا کی ہر شے جو دستیاب ہو سکتی تھی موجود تھی۔ ٹوٹا پھوٹا فرنیچر اور موسیقی کا ساز و سامان، کتابیں، بیئر کی خالی بوتلیں اور سگرٹوں کے ٹن، میلے کپڑے اور پُرانے جوتے اور پھٹی ہوئی جرابیں اور استعمال شدہ ڈالمٹ کا سامان اور ٹوٹے ہوئے ٹینس رکیٹ اور برتن جن میں دنوں تک بغیر دھوئے کھانا کھایا جاتا رہا تھا اور کتنے ہی الم غلم کے انبار چھت تک لگے تھے۔ چھوٹے سے فرش کی ایک ایک انچ جگہ اسی سامان سے اور لوگوں سے بھری تھی اور لوگ ——— نوجوان لڑکے، جن کی داڑھیاں بڑھی ہوئی تھیں اور جنھوں نے موٹی موٹی بند گلے کی سویٹریں اور ڈھیلی ڈھالی پتلونیں اور غیر پالش شدہ جوتے پہن رکھے تھے اور بے انتہا غلیظ دکھائی دے رہے تھے، جو موٹی موٹی عینکوں کے پیچھے سے آلوؤں کی طرح دانا، غیر شخصی نگاہوں سے نوواردوں کو دیکھتے تھے اور پھر بڑے بے تکلف، بڑے پیارے انداز میں ہنستے تھے۔ اور لڑکیاں تھیں، جنھوں نے بال کھلے چھوڑ رکھے تھے جو ہیئر ڈریسر کے ہاتھوں سے نا آشنا تھے اور جو میزوں پر بیٹھی سگریٹ پر سگریٹ پیے جا رہی تھیں۔ ایک کونے میں فرش پر ایک لڑکا بیٹھا بانگو ڈرم بجا رہا تھا اور دوسرا ایک کاغذ پر سے نظم پڑھ کر سُنا رہا تھا۔ تیسرا لڑکا خاموش بیٹھا غور سے دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ایک چوتھا اُن کی طرف پشت کیے رگیں پھلا پھلا کر ٹرمپیٹ بجانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وسط میں ایک بڑی سی میز پر پانچ چھ لڑکے لڑکیاں بیٹھے کوئی بحث کر رہے تھے اور بیئر پی رہے تھے۔ تیسری دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے ایک لڑکی اکیلی بیٹھی جھلملاتی ہوئی آنکھوں سے خلا میں گھور رہی تھی۔ سگریٹ اُس کی انگلیوں میں جل چکا تھا۔ دوسرے کونے میں سب کی طرف پیٹھ کیے بائرن بیٹھا پیانو بجا رہا تھا۔ کمرے میں کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ بلانکا میز پر بحث کرتے ہوئے لوگوں میں شامل تھی اور ایک لڑکا بار بار اُسے چومنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس سارے منظر نے میرے اندر شدید بددلی کی کیفیت پیدا کر دی۔ دیوار پر سے ہاتھ اُٹھا کر میں بائرن کے پاس جا کھڑا ہوا۔

"بیتھوون۔" وہ سر اُٹھا کر بولا: "موسیقی کا پیغمبر بیتھوون۔"

"ہوں۔" میں نے دانائی سے سر ہلایا۔

"میں نے 'مون لائٹ سوناٹا' ختم کر لیا۔ یہ پانچویں سمفنی ہے۔ بیتھوون کی موسیقی کے علاوہ دُنیا میں کچھ نہیں ہے۔ میں نے اپنی 'کال' سُن لی ہے۔"

"ہوں۔" میں نے دوبارہ سر ہلایا۔

"کیا ہوں ہوں لگا رکھی ہے میاں! کچھ مُنہ سے بولو۔ تم نے اپنی کال سُن لی ہے؟"

"نہیں۔" میں بوکھلا کر ہنسا: "مجھے تو بلانکا یہاں لے آئی ہے۔"

"جین میرا یہاں آنا پسند نہیں کرتی۔" اس نے اُداسی سے کہا: "تم بھی بلانکا کا یہاں آنا پسند نہیں کرتے ہو گے۔ مگر تم لوگ نہیں سمجھتے۔ تم چھوٹی چھوٹی باتوں میں اُلجھ کر رہ جاتے ہو۔ تم چھوٹے چھوٹے لوگ ہو۔"

مجھے اس کی طرف دیکھ کر افسوس ہوا۔ اس کی داڑھی غلیظ تھی۔

اسی اثنا میں کئی نوجوانوں نے آکر تعارف کیے بغیر اپنے بے تکلف لہجے میں مجھ سے بات کرنے کی کوشش کی اور لوٹ گئے۔ جب دوبارہ میں نے پلٹ کر دیکھا تو بلانکا اور وہ نوجوان، جو اُسے چومنے کی کوشش کر رہا تھا، ٹرمپیٹ اور بانگو ڈرم کی دُھن پر ٹیپ ڈانس کر رہے تھے اور باقی سب ان کے گرد دائرہ بنائے کھڑے تالی کی تال دے رہے تھے۔ بلانکا والہانہ طور پر ہنس رہی تھی۔ دیوار کے ساتھ اکیلی بیٹھی ہوئی لڑکی مُنہ ہی مُنہ میں کچھ بڑبڑانے لگی تھی۔ کوئی اس کی طرف توجہ نہ دے رہا تھا۔ میں اور

باٹرن جاکر تالی بجانے والوں میں شامل ہو گئے۔

جب دو گھنٹے کے بعد ہم وہاں سے نکلے تو خوش و خرم تھے۔ تازہ ہوا کو پھیپھڑوں میں داخل کرکے میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ گلی ویران پڑی تھی۔

بلانکا نے دیوار کی تاریکی میں دونوں بازو پھیلائے اور بولی: "یہ سب میرے دوست ہیں۔ میں ساری دنیا میں شامل ہوں۔ ہم سب ہیں۔"

برف باری رک گئی تھی۔ ہوا رک گئی تھی۔ سردی غائب ہو چکی تھی۔ خوش گوار موسم میں ہم نے اپنے بھاری کوٹوں کے بٹن کھول دیے۔ دکانیں دیر ہوئی بند ہو چکی تھیں۔ شوکیسوں میں روشنیاں جل رہی تھیں۔ ہم ان میں دیکھتے ہوئے چلنے لگے۔

"یہ سفید فر دیکھ رہے ہو" وہ کہہ رہی تھی: "یہ اصل نایاب منک ہے۔ آج سے دو سال بعد میں کسی لکھ پتی سے شادی کرنے والی ہوں۔ پھر یہ ساری فریں میرے کلوزٹ میں ہوں گی اور میں ناک ہوا میں اٹھا کر تمھارے ایسے لوگوں کے پاس سے شوں کر کے نکل جایا کروں گی۔ تم اگر دو سال کے اندر اندر لکھ پتی بن گئے تو مجھے ضرور اطلاع دینا۔" وہ ہنسی: "یہ سیزان کے سیب ہیں۔ مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ چھ ہزار سات سو بیاسی۔ اتنے سیب اس نے پینٹ کیے تھے۔ پتہ نہیں کھائے کتنے ہوں گے؟"

ہر چند قدم پر اس کی اُبلتی ہوئی نوجوان، اُداس، دانا، گہری، جذباتی، مختصر، ہلکی ہنسی کی آواز آتی رہی۔ کیمپس تک پہنچتے پہنچتے ہم ہانپ گئے۔۔۔ اتنی چڑھائی چڑھنی پڑی تھی۔ یہاں پر تقریباً حبس ہو رہا تھا۔ ہم نے کوٹ اتار کر اس کے ہوسٹل کی سیڑھیوں پر رکھے اور ان پر بیٹھ گئے۔ رات میں تازہ گری ہوئی برف کی بو تھی۔

کچھ دیر کے بعد اکڑوں بیٹھے بیٹھے اس نے کہنا شروع کیا: "سلطان، میں اکثر جھوٹ بولتی ہوں لیکن اس معاملے میں میں نے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ میری ماں کا جغرافیہ کا علم بہت محدود ہے۔ جب میں نے اُس سے تمھارے بارے میں کہا تو وہ بہت خوش ہوئی کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ آج تک میں نے کبھی کسی کو اس طرح اپنے گھر مدعو نہیں کیا۔ لیکن شام کو میرے باپ سے اُس نے اس کا ذکر کیا تو اُس نے اسے بتایا کہ پاکستان ایشیا میں ہے۔ اس سے سارا جھگڑا شروع ہوا۔"

"سارا جھگڑا؟"

"ہاں۔ اسے پتہ چل گیا کہ تم۔۔۔ یعنی تم۔۔۔"

"میں کیا۔۔۔؟"

"کہ تم۔۔۔" وہ پھر رک گئی۔

"کالا ہوں۔" میں نے اس کا فقرہ مکمل کر دیا۔

اس نے ایک لمبا سانس چھوڑا: "کہ تم ایشین ہو۔ اسی رات کو اس نے پھر مجھے فون کیا۔ میں تمھیں ساتھ لانے پر بضد رہی۔ اس نے کہا کہ اس کو تمھارے رنگ سے یا نسل سے کوئی اختلاف نہیں ہے، کہ وہ یہ میرے ہی بھلے کے لیے کہہ رہی ہے کیونکہ اس سے دوسرے لڑکے۔۔۔ میرے ہم عمر لڑکے۔۔۔ متعصب ہو جائیں گے اور یہ میرے مستقبل کے لیے بُرا ثابت ہو سکتا ہے۔ میں نے فون بند کر دیا۔ صبح اُٹھ کر میں پہلی گاڑی سے چلی گئی۔ یہ ساری بات تھی۔ تم کو میں اس جھگڑے میں شامل نہیں کرنا چاہتی تھی۔"

"تو کیا واقعی۔۔۔" کچھ دیر کے بعد میں نے پوچھا: "دوسرے لڑکے۔۔۔ گورے لڑکے۔۔۔؟"

"ہاں۔ یہ لوگ ظاہر نہیں کرتے مگر بُری طرح محسوس کرتے ہیں۔ اور پھر ایک خاموش معاہدے کے تحت اُس لڑکی کا

بائیکاٹ کر دیا جاتا ہے۔ ایسا پہلے ہو چکا ہے۔"

"اور تم ؟"

"میں ؟ ارے پاگل آدمی تم نے سنا نہیں۔ میں تو ساری دنیا میں شامل ہوں۔"

"پھر بھی تم۔ ۔ ۔"

اس نے اپنی بات جاری رکھی: "ہم سب ایک دوسرے کی زندگیوں میں برابر کے شریک ہیں۔ اسی خاطر میں آج تمہارے ساتھ شہر گئی تھی۔ یہاں سے جاتے ہوئے اور شہر میں پھرتے ہوئے ہم دونوں کو بیسیوں لڑکوں نے دیکھا ہے، وہ لڑکے مجھ پر جان دیتے ہیں، وہی جو مجھے بدنام کرتے رہتے ہیں، جو میرے آگے پیچھے پھرتے ہیں۔ میں کس کی پروا کرتی ہوں ! میں آزادی چاہتی ہوں۔ میرا جی چاہے گا تو دن دہاڑے جا کر کسی سیاہ فام آدمی سے شادی کر لوں گی۔ یہ لوگ مجھے بدنام ہی کریں گے نا۔ میں اس کی عادی ہوں۔ پھر یہ لوگ بھول جائیں گے، لوگ بھول جاتے ہیں۔ ۔ ۔ اسی خاطر میں آج تمہیں ان لوگوں کے درمیان لے گئی تھی جو سوسائٹی سے نکالے ہوئے ہیں۔ سوسائٹی نے جن کو ملعون قرار دیا ہے، جن کی مذمت میں اخباروں کے ورق کے ورق سیاہ کیے گئے ہیں۔ جو غلیظ ہیں اور آوارہ ہیں اور غیر منظم زندگیاں بسر کرتے ہیں اور لامذہب ہیں۔ لیکن پاگل آدمی۔ ۔ ۔" وہ آہستہ سے ہنسی: "تم نے دیکھا ہے ؟ یہی لوگ ہیں جو زندگی کو اس کی اصل بنیادی شکل میں دیکھنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں، جنھوں نے اپنے اوپر سے تہذیب کے ہر خول کو اتار پھینکا ہے تاکہ زندگی کو ننگا کر سکیں، جنھوں نے اپنی سمت خود متعین کرنے کی خاطر رائج سمتوں کا احساس ہی کھو دیا ہے۔ جو زندگی کی نیکی اور محبت اور سادگی میں یقین رکھتے ہیں لیکن مذہب نے جنھیں بد دل کر دیا ہے، کیونکہ بیسویں صدی میں دنیا کے اس سب سے تہذیب یافتہ ملک میں ایک چرچ سے تعلق رکھنے والا شخص دوسرے چرچ سے تعلق رکھنے والے کی دکان سے ضرورت کی کوئی چیز بھی نہیں خرید سکتا، کیونکہ ایک مذہب دوسرے مذہب سے نفرت کرنا سکھاتا ہے۔ یہ لوگ کسی قوم یا مذہب یا نسل سے تعلق نہیں رکھتے۔ یہ محض انسان ہیں جن کے پاس ان کا دماغ ہے جو انھیں کسی پل چین نہیں لینے دیتا، جو انھیں دکھ دیتا رہتا ہے۔ یہ غلط ہیں لیکن اپنی تمام تر غلاظت اور بے ترتیبی اور کنفیوژن میں سے خوبصورتی اور محبت کی تخلیق کرنا چاہتے ہیں۔ خوبصورتی کا تصور پیدا ہونا یا نہ ہونا محض اتفاق کی بات ہے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ کون اس کی تلاش میں نکلتا ہے، کون اتنی جرأت کرتا ہے۔ یہ لوگ آزاد ہیں اور آزادی چاہتے ہیں۔ میں ان میں سے ہوں۔ میں کوئی بندش قبول نہیں کر سکتی۔ میں کسی سے دلچسپی نہیں رکھتی، کسی کی پروا نہیں کرتی، صرف آزادی چاہتی ہوں، آزادی۔"
وہ پرندے کی طرح بازو ہوا میں پھیلا کر کھڑی ہو گئی: "آزادی میری خواہش ہے۔"

پھر وہ اچانک بیٹھ گئی: "سلطان سنو۔ میرا کمرہ دیکھنا چاہتے ہو ؟ چلو تمھیں دکھاؤں۔ چلو۔ ۔ ۔" وہ بولی۔

"مگر۔ ۔ ۔ کیسے ؟"

"اس وقت سب سو رہے ہیں۔ میرے پاس باہر کے دروازے کی چابی ہے۔ ہم چپکے سے اوپر چڑھ جائیں گے۔ تم یہیں بیٹھو، میں دیکھ کر آتی ہوں۔ جب اشارہ کروں تو آ جانا۔"

مجھ سے مزید اجازت لیے بغیر وہ چپکے سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ میں مبہوت بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب اس نے دروازے میں آکر اشارہ کیا تو میں بے خودی میں اپنا کوٹ وہیں چھوڑ کر اس کے پیچھے پیچھے اندر داخل ہوا۔ اندر گرم پانی کے پائپوں کی ہلکی ہلکی حرارت تھی۔ ہم چوروں کی طرح دبے پاؤں سیڑھیاں چڑھ کر اس کے کمرے میں داخل ہوئے۔ دروازہ بند کرتے ہوئے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور وہ وہیں پر دوہری ہو گئی۔ چند منٹ تک اس کا سارا جسم خاموش ہنسی کے اثر سے ہلتا رہا۔ اس وقت وہ مجھے ایک ننھی سی چمکیلی آنکھوں والی بچی کی طرح لگی جو سب بڑوں کے سو جانے کے بعد اپنے ہم عمر بچے کے ساتھ کیک چرانے کا

پروگرام بنا رہی ہو۔

"اس وقت اگر کسی کو تمھاری موجودگی کا علم ہو جائے تو ہم دونوں کو یونیورسٹی سے نکال دیا جائے۔" وہ بولی: "مجھے ان باتوں میں بڑی آزادی کا احساس ہوتا ہے، بڑے ایڈوینچر کا۔ تم دوسرے شخص ہو جو میرے کمرے میں آئے ہو۔ پہلے میرو آیا تھا۔ بیٹھ جاؤ۔"

میں کمرے کے وسط میں کھڑا رہا۔ اس کا کمرہ ہر لڑکی کے کمرے کی طرح تھا، مگر سخت بے ترتیب! صرف دیواروں پر جگہ جگہ چھوٹے بڑے، سیاہ رنگ کے، بدہیئت، پرانی دیمک زدہ لکڑی کے ٹکڑے دھاگوں کے ساتھ کیلوں سے ٹنگے ہوئے تھے۔

"یہ ڈرفٹ ووڈ ہے۔ میں ڈرفٹ ووڈ جمع کرتی ہوں۔ تم بھی کرتے ہو؟" اس نے کہا۔

"نہیں۔ ۔ ۔"

"یہ تم لے لو۔" اس نے ایک لکڑی دیوار سے اُتار کر میری طرف بڑھائی: "لے لو، یہ میری سب سے قیمتی لکڑی ہے۔ یہ میں نے پارسال اطلانتک میں سے پکڑی تھی۔ اور یہ۔ ۔ ۔" اس نے دُوسری لکڑی اُتاری: "میری سب سے خوبصورت لکڑی ہے۔ یہ بھی تم لے لو۔"

پھر وہ میرے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر کھڑی ہو گئی۔ "مجھے چومو۔"

اُس کی آنکھوں سے تیز شعاعیں نکل رہی تھیں۔ مَیں نے جُھک کر آہستہ سے اُس کے ہونٹوں کے کناروں کو چوما۔ پھر میرے دماغ میں آگ لگ گئی۔ دونوں لکڑیاں فرش پر پھینک کر مَیں نے اُسے کندھوں سے پکڑ لیا۔

"بلانکا۔ ۔" مَیں چیخا: "مَیں بچّہ نہیں ہوں۔ مجھے تمھارے کھلونے نہیں چاہئیں۔ مَیں تمھارا دوست بھی نہیں ہوں۔ مجھے تم سے۔ ۔ ۔ تم سے عشق ہے۔ تم۔ ۔ ۔"

میری بلند ہوتی ہوئی آواز کو سُن کر وہ چند لمحے کے لیے سکتے میں آگئی۔ پھر تیزی سے لپک کر اس نے میرے مُنہ پر ہاتھ رکھا اور دروازہ کھول کر مجھے باہر دھکیل دیا۔

بند دروازے کے پیچھے مجھے اس کے تیز تیز سانس لینے، پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے کی آواز سنائی دی۔

پنجوں کے بل بھاگتا ہوا مَیں سیڑھیاں اُترا اور باہر نکل آیا۔ برف گرنی پھر شروع ہو گئی تھی۔ خاموش سفید رات میں مَیں اپنے کوٹ کے پاس سُن کھڑا دل کے دھڑکنے کی آواز سنتا رہا۔

برف باری شدید ہو گئی۔ در و دیوار، شجر اشجار اور حدِ نظر تک زمین و آسمان دودھیا سفید رنگ میں رنگے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ میں دن بھر لیبارٹری میں اور رات گئے تک اپنے کمرے میں کافی پیتا اور کام کرتا رہتا تھا۔ میرا وظیفہ صرف ایک ٹرم کا تھا اور انہی چند مہینوں میں مجھے اپنا تھیسس مکمل کرنا تھا۔ لائبریری سے لائی ہوئی کتابوں کے ڈھیر کے ڈھیر میری میزوں پر، کرسیوں پر اور صندوقوں پر پڑے رہتے تھے۔ اُس سرد، بے رنگ اور بے بُو دنیا میں یوں لگتا تھا کہ پڑھنا اور کام کرنا انسان کی آخری جائے پناہ رہ گئی ہے۔ اور دفعتاً ایسا ہوا کہ اُس سرد بے رنگ دُنیا میں بلانکا کے لیے میرا جذبہ کافور ہونے لگا۔ کبھی کبھی لیبارٹری میں کام کرتے ہوئے ایک لمحے کے لیے ٹھٹھک کر مَیں اسے صاف طور پر محسوس کرتا، دل ہی دل میں اس پر متعجب ہوتا، پھر اطمینان اور پشیمانی کا گہرا سانس لیتا اور خوردبین پر جھک جاتا۔ ایک مہینے کے اندر اندر مَیں پھر جذباتی طور پر مضبوطی سے اپنے پاؤں پر کھڑا ہو چکا تھا۔

اب بھی ہم اکثر ملتے تھے۔ مہینے میں ایک آدھ بار اب بھی میں، بائرن، جین اور بلانکا 'ڈریگن' میں اپنی مخصوص میز کے گرد جمع ہوتے، یونیورسٹی یونین کے جلسوں میں غل مچاتے اور اکٹھے سکی انگ کے لیے جاتے، مگر اب وہ بات نہ رہی تھی۔ جلتے

ہوئے جذبے کی ساری بے چینی اور سارا درد اب گزر چکا تھا اور اس کی جگہ ہلکی سی پشیمانی اور گہرا اطمینان اور دائمی رفاقت کا احساس رہ گیا تھا۔ اب ہم برابر کی سطح پر آ گئے تھے اور اس پر خوش تھے۔ اُس رات والے واقعے کا ذکر کسی نے کبھی نہ کیا۔ بائرن پر برابر دیوانگی کا وہ دور گزر چکا تھا اور اس نے داڑھی بھی صاف کروا دی تھی۔ لیکن موسیقی میں اس کی دلچسپی بڑا سنجیدہ اور بالغ جذبہ بن چکی تھی۔ وہ گہرے شعور کے ساتھ اب اس کا مطالعہ کر رہا تھا۔ جین کے ساتھ اب اُس کی مکمل صلح تھی۔ بلانکا اُسی طرح حسین، متلون مزاج اور بڑی عزیز دوست تھی۔

اس کے باوجود اُس کی دلکشی اور اس کے تلون اور اس کی ساری شخصیت کے معمے کے بارے میں ایک گہرا استعجاب. گہرا تجسس میرے دل میں راہ پا گیا تھا، جس کی ہلکی ہلکی آنچ ہر وقت اندر سلگتی رہتی تھی اور کبھی مجھے پورے طور پر اس سے بے نیاز نہ ہونے دیتی تھی۔ گو اس کے بعد میں نے شعوری طور پر اس سلسلے میں کبھی کوئی کوشش نہ کی۔

پھر بہار کا موسم آیا اور برف ساری پگھل گئی اور نئی کونپلوں کے رنگ فضا میں بکھر گئے۔

سالانہ 'پرام' ڈانس سے تین ہفتے قبل مجھ پر انفلوئنزا کا حملہ ہوا اور مجھے کیمپس ہسپتال میں منتقل کر دیا گیا ——— ایک روز بلانکا مجھے دیکھنے آئی تو اس کے ہاتھوں میں سفید پھولوں کے گلدستے تھے: "یہ بہار کے پہلے پھول ہیں" اس نے کہا: "تمھارے لیے اُگے ہیں۔ انھیں چومو"

میں نے ہنس کر اس کا شکریہ ادا کیا اور پھولوں کو تکیے کے برابر رکھ دیا۔

وہ میرے پاس بیٹھ کر روزانہ کے قصّے سُنانے لگی۔

مَیں نے پانچ روز سے شیو نہیں کیا تھا اور خاصا کمزور محسوس کر رہا تھا۔ اُس کی باتیں سُنتے ہوئے میں بیچ بیچ میں آنکھیں بند کر لیتا ——— ایک بار مَیں نے آنکھیں کھولیں تو وہ خاموش بیٹھی ہوئی مجھے دیکھ رہی تھی۔

"سلطان کب واپس جا رہے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"آج سے پورے ایک ماہ بعد"

"تمھارا تھیسس مکمل ہو گیا؟"

"تقریباً"

"سلطان،" وہ آگے جھک کر بیٹھ گئی: "میں 'پرام' ڈانس پر تمھارے ساتھ جاؤں گی"

"اگر تم چاہتی ہو تو" مَیں نے کہا۔

"میری ایک بات مانو"

"کہو"

"تم داڑھی رکھ لو"

مَیں ہنسنے لگا۔

"ہنسو نہیں پاگل آدمی، میری بات سنو۔ بس اسے بڑھنے دو چند روز تک، پھر اسے ترشوا لینا۔ وہ جیسے بائرن نے ترشوائی تھی۔ پھر . . . پھر مَیں تمھارے ساتھ جاؤں گی۔ اور اس روز مَیں بھی تمھیں ایک سرپرائز دوں گی"

"تم بھی داڑھی رکھو گی"

"کچھ نہ کچھ بہرحال ہو گا۔ تمھیں بڑی اچھی لگے گی، یقین کرو۔ رکھو گے نا؟ مان لو . . ." اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر ہلاتے ہوئے کہا: "میری خاطر . . . کہو ہاں"

کچھ دیر تک سوچنے کے بعد مَیں نے کچھ اس کی خاطر، کچھ پرانے وقتوں کی خاطر 'ہاں' کر دی۔

بیماری سے اُٹھتے اُٹھتے مجھے دو ہفتے لگ گئے۔ دسویں روز جب وہ مجھے دیکھنے کو آئی تو سفید پھولوں کا گلدستہ بستر پر رکھ کر اس نے جیب سے قینچی نکالی اور انہماک کے ساتھ میری داڑھی تراشنے لگی۔ مَیں اس کی مشاقیِ فن پر حیران رہ گیا۔

ڈانس سے ایک روز پہلے وہ مجھے شہر لے گئی۔ 'ڈریگن' میں آئس کریم کھانے اور کافی پینے کے بعد ہم واپس ہوئے۔ رستے میں وہ ہیئر ڈریسر کی دوکان کے سامنے رُک گئی۔

"دیکھو یہ ہمارا ہیئر ڈریسر جان ہے۔ اس سے سب طے ہو چکا ہے۔ یہ تمھاری داڑھی کو خوبصورتی سے تراش دے گا اور اسے سنہرا رنگ دے دے گا۔" اس نے کہا: "اب دیکھو ضدمت کرنا، ورنہ میں یہیں پر بیٹھ کر رونے لگوں گی۔"

جان کے شیشے میں دیکھتے دیکھتے میری شکل تبدیل ہو گئی۔

"اب تم بالکل جارج پنجم لگتے ہو۔" وہ میری پیٹھ ٹھونکتے ہوئے بولا۔

"شکریہ۔" میں نے سنجیدہ جواب دیا اور پیسے دے کر باہر نکل آیا۔

جب بانکا باہر نکلی تو مجھے دیکھ کر خوشی سے اچھل پڑی۔ لیکن مَیں وہیں کا وہیں کھڑا رہ گیا۔ اس کے سر پر سفید چمکدار جھلملاتی ہوئی چاندی کے تار بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے بال چھوٹی عمر کے جیسی لڑکوں کی طرح کٹوائے تھے اور سلور گرے میں رنگائے ہوئے تھے۔ وہ اپنی حجامت سے کم عمر لڑکا، بالوں کے رنگ سے بڑھیا اور اپنے حسین چہرے سے نوجوان عورت دکھائی دیتی تھی۔ سب کچھ ملا کر دیکھنے پر انسان چکرا جاتا تھا۔ میری بوکھلاہٹ کو دیکھ کر اس نے مضبوطی سے سکارف سر پر باندھ لیا۔

ناچ کی شام کو ہم دونوں کے گرد میلہ رہا۔ اس کو ان گنت لڑکوں اور مجھے ان گنت لڑکیوں کے ساتھ رقص کرنا پڑا۔ شام جب اپنے عروج پر تھی تو میں اور وہ اچانک آمنے سامنے آ گئے۔ ناچ کی گرمی اور شباب اور ایک دوسرے کی ہیئت کے مضحکے کے باوجود ہم نے اس وقت کوئی ایسی حرکت نہ کی جس کی ہم سے توقع کی جا سکتی تھی۔ اس کے بجائے ہم نے تقریباً ایک ساتھ نظریں نیچے گرا دیں اور، یوں جیسے پہلے سے کیے گئے فیصلے پر عمل کر رہے ہوں، باہر نکل آئے۔ برآمدے کی بتیاں قصداً بجھا دی گئی تھیں ——— نیم تاریکی میں آہنی ریلنگ جھلملا رہی تھی۔

"تمھارا گھر یہاں سے کتنی دُور ہے؟" اس نے پوچھا۔

"آٹھ ہزار میل۔"

وہ ریلنگ پر جھکی رہی۔ ہال میں بتیاں ایک ایک کر کے بجھائی جانے لگیں، حتیٰ کہ صرف چھت کا وسطی فانوس جلتا رہ گیا۔ نیچے وی آنا کا والز ہو رہا تھا۔ 'بلیو ڈینیوب' کی مانوس، آہستہ آہستہ اُٹھنے والی، قریب آنے والی، دُور جانے والی، رُوح میں داخل ہونے والی، پگھلا دینے والی کیف آگیں موسیقی ہمارے کانوں میں آ رہی تھی۔ اس نے سر اُٹھا کر اندھیرے میں میری طرف دیکھا۔

"سلطان۔" اس نے کہا: "ہم زندگی میں ہزاروں میل طے کریں گے لیکن یہ آٹھ ہزار میل شاید کبھی طے نہ کر پائیں۔ میں تم سے باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

کچھ دیر بعد ہم شہر کے بازاروں میں گھوم رہے تھے۔ 'ڈریگن' میں چند منٹ بیٹھنے کے بعد وہ گھبرا کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے بعد فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے مَیں نے کئی ایک جگہیں بیٹھنے کے لیے تجویز کیں لیکن وہ چلتی گئی۔ مجھے کچھ ایسا لگا کہ جیسے بیٹھنے سے پہلے وہ اپنے آپ کو تھکا کر چُور کر دینا چاہتی ہو۔ مگر پھر وہ ایک ادھ کھلے آہنی گیٹ کے سامنے رُک گئی۔

یہ اُس ہاکی کا سٹیڈیم تھا، جہاں پر دو روز پہلے ایک مشہور میچ ہو چکا تھا، جس میں یونیورسٹی کے تماشائی لڑکوں نے بڑی دھاندلی کی تھی اور قصہ ڈین جنکنز تک پہنچا تھا۔

ہم نیم تاریک گیٹ میں داخل ہوئے۔ ہمارے چاروں طرف پچیس ہزار نشستیں خالی پڑی تھیں اور اس عظیم سٹیڈیم میں اس وقت صرف ایک وسطی لائٹ جل رہی تھی جو نیچے برف کی چمکتی ہوئی سفید سطح پر روشنی کا چھوٹا سا گول دائرہ بناتی تھی۔ چند مزدور پھاوڑوں کی مدد سے فالتو برف کو سمیٹ رہے تھے اور اگلے کھیل کے لیے برف کا میدان ہموار کر رہے تھے۔ انھوں نے سر اُٹھا کر ہمیں داخل ہوتے ہوئے دیکھا اور کام میں مصروف رہے۔ ہم ان گنت سیڑھیاں چڑھنے کے بعد سب سے پچھلی تاریک رو میں جا کر بیٹھ گئے۔ چاروں طرف سے خالی سٹیڈیم کی بیکراں وسعت عود کر آ رہی تھی اور بیچ میں ایک دوسرے سے لگ کر بیٹھے ہوئے ہم دونوں کی چھوٹی چھوٹی، دھندلی، اکلوتی شکلیں بے ڈھنگا نقیروں کی طرح لگ رہی تھیں۔ اس جگہ، جہاں پر ہم نے ہمیشہ روشنیوں کا اور انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا، اُچھلتا کودتا، ناچتا اور شور کرتا ہوا پُر رونق سمندر دیکھا تھا، اب ہم خاموش اور اکیلے بیٹھے تھے اور ایک عظیم اور خوفناک احساسِ تنہائی نے ہمیں اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ دور نیچے تین بُڈھے بدحال مزدور پھاوڑوں سے برف کی سطح ہموار کرتے ہوئے روشنی کے دائرے میں داخل ہو رہے، روشنی کے دائرے سے نکل رہے تھے اور بیچ بیچ میں بھاری، اُداس آوازوں میں باتیں کر رہے تھے۔ ہم کئی منٹ تک خاموش بیٹھے رہے۔

آخر لانکانے، جو نیچے روشنی کے گیلے، چمکدار دائرے میں ٹکٹکی لگائے دیکھ رہی تھی، خفیف جھرجھری لی اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

"میرو نے یہاں ہاکی کھیلنا سیکھا تھا" اس نے کہا۔

"میرو کو تم بہت یاد کرتی ہو!" میرا لہجہ حسد کے کسی جذبے سے حیرت انگیز طور پر پاک تھا۔

"اس سے میرا بھائی چارہ تھا۔"

"یہ تمھارا بھائی چارہ میرے کچھ پلّے نہیں پڑا" میں نے کہا: "مجھ سے بھی ہے اور بائرن سے بھی ہے اور ساری دنیا سے ہے۔"

"تم غلط سمجھے ہو۔" وہ بولی: "اور کسی سے نہیں تھا۔ صرف اس سے تھا۔"

"کوئی بڑا خاص آدمی ہوگا یہ مسٹر میرو۔"

وہ روشنی کے دائرے میں دیکھتی رہی ———: "میرو ہسپانوی خانہ جنگی کی اولاد تھا۔ اُس کے ماں باپ فرانکو کی فوجوں کے خلاف لڑتے ہوئے سول وار کے دوران ایک دوسرے سے ملے تھے۔ ان دنوں وہ لوگ اپنی جان ہتھیلی پر لیے پھرتے تھے۔ تم کہو گے: 'محبت کرنے کی کسے فرصت تھی؟' لیکن محبت کرنے کے لیے کسے فرصت کی ضرورت ہوتی ہے؟ میرو ایک پہاڑی غار میں پیدا ہوا۔ اس کے چند ماہ بعد وہ دونوں ایک لڑائی میں مارے گئے۔ میرو کو ایک بوڑھے سپاہی نے پالا۔ جب میرو پندرہ برس کا ہوا تو بوڑھا سپاہی بھی مر گیا، لیکن مرنے سے پہلے وہ میرو کو سب کچھ بتا گیا۔ میرو بڑی اُن شخصیت کا مالک تھا۔ میں اپنے ماضی کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتا؛ اس نے مجھے بتایا: 'اور نہ میری خواہش ہے۔ میں بہت بڑا جرنلسٹ بنوں گا۔' ان دنوں میں اس کے پیچھے دیوانی ہو رہی تھی۔ وہ میری زندگی میں پہلا اور آخری مرد تھا۔ میں اس سے بہت خوف زدہ رہتی تھی، کیونکہ وہ مجھے تباہ کر دینے پر قادر تھا۔ لیکن اس نے مجھ سے کہا: 'زندگی میں اگر خوش رہنا ہے تو دُنیا سے بھائی چارہ کرو، پاگل لڑکی۔ باقی سب بے کار ہے۔ سب بھول جاؤ۔' میں نے اطمینان کا سانس لیا اور آہستہ آہستہ اپنی دیوانگی پر قابو پانے لگی۔ لیکن میرے پاس اس کا ذہن نہ تھا۔ وہ اپنے حادثے کو بھول گیا تھا۔ میں اپنے حادثے کو نہیں بھول سکی۔"

"میرو کو؟" میں نے پوچھا۔

وہ اُداسی سے ہنسی: "میرو کو کون یاد کرتا ہے۔ وہ تو محض ایک سمبل تھا۔"

"سمبل؟"

"ہاں۔" اس نے مختصراً کہا

دفعتاً میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُسے دیکھنے لگا۔

یکساں، اُداس آواز میں اس نے اپنی بات جاری رکھی: "تین سال میں اُن کے ہاں تین لڑکے ہوئے۔ پھر میری ماں بیمار پڑ گئی۔ اور ڈاکٹر نے بتایا کہ مزید بچے کی پیدائش ناممکن ہے۔ وہ گھر میں ایک بیٹی بھی چاہتے تھے۔ وہ خوش حال لوگ تھے۔ چنانچہ وہ ہوم پہنچے اور سب سے پیاری بچی کو منتخب کر کے گھر لے آئے۔ میں سیکنڈری اسکول میں تھی جب مجھے یہ سب کچھ بتایا گیا۔ اس وقت میں سب سے چھوٹی اور اکلوتی بچی کی حیثیت سے گھر بھر میں ممتاز تھی اور بھائیوں نے میری عادت کافی حد تک بگاڑ رکھی تھی۔ مجھے سب سے زیادہ پیسے جیب خرچ کے لیے ملتے تھے اور میرے ساتھ سب سے زیادہ لاڈ پیار کیا جاتا تھا۔ پھر ایک روز جب میرے بھائی باہر گئے ہوئے تھے، میرے باپ نے مجھے پاس بلایا۔ میری ماں بھی قریب بیٹھی تھی اور اس کا چہرہ زرد تھا۔ میرے باپ نے کہا: 'اب تم سمجھ دار ہو گئی ہو اور ہمارا اخلاقی فرض ہے کہ تمھیں سب کچھ بتا دیا جائے۔' اس نے مجھے بتایا، اور اس نے مجھے سب کچھ بتا دیا، لیکن ایک بات وہ چھپا گیا۔ اس نے کہا کہ میرے اصل ماں باپ دو غریب انگریز میاں بیوی تھے جو کچھ روز پہلے انگلستان سے ہجرت کر کے آئے تھے اور میری پیدائش کے فوراً بعد ٹریفک کے ایک حادثے میں مارے گئے تھے۔ میں اُداس ہو گئی۔ مجھے افسردہ دیکھ کر اُس نے کہا: 'دنیا میں سب بچوں کی پیدائش محض حادثاتی نوعیت کی ہوتی ہے، لیکن تم وہ خاص الخاص آدمی ہو جسے منتخب کیا گیا ہے سینکڑوں بچوں میں سے، تمھیں خوش ہونا چاہیے۔' میں خوش ہو گئی۔ ان کا فرض پورا ہو گیا۔ وہ اس بات کو بھول گئے مگر میں نہ بھول سکی۔ یہ نہیں کہ میں نے کوشش نہیں کی۔ اس دن سے لے کر آج تک میں ایک درجن ماہرینِ نفسیات کے پاس جا چکی ہوں۔ آخر مجھے پتہ چلا کہ ماہرینِ نفسیات اگر احمق نہیں تو خوش فہم ضرور ہوتے ہیں۔ اُس روز ان دونوں میاں بیوی نے، جو میرے ماں باپ ہیں، میرے دل میں ایک خوف بٹھا دیا تھا جسے آج تک کوئی نہیں نکال سکا۔ وہ مجھ پر اسی طرح مہربان رہے جس طرح ہمیشہ سے تھے اور میرے بھائی اسی طرح مجھے لاڈ پیار سے بگاڑتے رہے اور میں اُسی طرح کنبے کا خاص الخاص فرد بنی رہی . . . لیکن اس روز کے بعد میں نے ایک بار بھی یقین کے ساتھ کبھی نہ سوچا کہ میں وہی لڑکی ہوں جو سولہ سال سے ان لوگوں کے ساتھ رہتی آئی ہوں۔ میرے ماں باپ نے کبھی میری داخلی زندگی کو جاننے کی کوشش نہ کی۔ انھیں اس کی ضرورت ہی نہ تھی۔ میرے باپ کے روزانہ کام کے اوقات بڑھتے گئے، آٹھ سے دس اور دس سے بارہ گھنٹے ہوئے، اس لیے کہ ہم خوش حال تر ہو سکیں، اس لیے کہ ہمارے ہمسایوں کے پاس بڑھیا فرنیچر تھا اور ہم ان سے بازی لے جانے پر مصر تھے، صرف اس بنا پر کہ ہم ان کے بازو میں رہتے تھے۔ مذہب ہمسایے کے ساتھ محبت کرنا سکھاتا ہے نا؟ ہم ان سے محبت کرنے میں مصروف تھے، کہ اس ملک میں یہی طریقہ محبت کرنے کا رائج ہے۔ پھر انھوں نے بڑی عمدہ کار خریدی اور میرے باپ کی زندگی کا اوّلیں مقصد اُن کی ایسی کار خریدنا بن گیا۔ میرا باپ بڑا کامیاب شخص ہے۔ ایک دن آیا کہ ہمارے پاس وہ سب کچھ تھا جو ہمارے ہمسائے کے پاس تھا، اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا۔ پھر میرے باپ نے مکان چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ اب ہم اپنے تمام ہمسایوں میں سب سے زیادہ خوش حال تھے اور یہ لوگ اس قابل نہیں رہے تھے کہ ہم ان میں رہتے چلے جائیں۔ ہم نئے مکان میں آ گئے جو بڑے فیشن ایبل علاقے میں تھا۔ میرے باپ نے آرام دہ مکان میں ذرا دیر رک کر سستانے کے بجائے اپنے کام کے اوقات مزید بڑھا دیے۔ اب وہ آدھی آدھی رات تک گھر پر کام کرتا رہتا تھا، اس لیے کہ اپنے نئے ہمسایوں میں ہم سب سے زیادہ بدحال تھے اور اُن سے ٹکر لینے پر مصر تھے، محض اس بنا پر کہ ہم ان کے

باڑوں میں رہتے تھے۔ میں تمھیں الف لیلیٰ کی کہانی نہیں سُنارہی، یہ ہمارے ملک کا دستور ہے۔ یہاں فرد تباہ ہو جاتا ہے اور سوسائٹی مضبوط تر ہوتی جاتی ہے۔ سال کے آخر پراعداد و شمار شایع ہوتے ہیں اور ہمیں پتہ چلتا ہے کہ آج ہم دُنیا کے سب سے ترقی یافتہ ملک میں رہ رہے ہیں اور فی کس دُنیا میں سب سے زیادہ کمارہے ہیں اور اپنے جسموں کو دُنیا کی عمدہ ترین غذا پر پال رہے ہیں اور بھاگ رہے ہیں اور بھاگ رہے ہیں اور بھاگ رہے ہیں اور پتہ نہیں کہ کدھر جا رہے ہیں۔ ہماری روحوں کو دن بھر میں کتنی کیلوریز کی ضرورت ہے، اس کے اعداد و شمار ابھی تک شایع نہیں ہوئے . . .

"معاف کرنا، مَیں بھٹک گئی تھی۔ میرا کہنے کا مقصد یہ تھا کہ میرے ماں باپ کو ذرا فرصت نہیں تھی۔ انھوں نے اپنے گھر کو نعمتوں سے مالامال کر رکھا تھا اور اپنے بچوں کو دُنیا کے خوش قسمت بچوں میں تصور کرتے تھے اور وہ شاید غلطی پر بھی نہ تھے۔ لیکن میں اب بدل چکی تھی۔ جہاں مَیں پہلے ہر وقت ناک چڑھائے رہتی تھی وہاں مَیں اب اپنے ماں باپ اور بھائیوں کو گہری احسان مندی اور خوف سے دیکھنے لگی تھی۔ جیسے کہ مَیں اس گھر میں چور دروازے سے داخل ہو کر غاصبانہ قبضہ جما بیٹھی تھی اور یہ لوگ مجبور ہو گئے تھے اور مجھے مستقل برداشت کیے جا رہے تھے۔ جہاں پہلے وہ مجھے بہلانے کے بہانے ڈھونڈھتے رہتے تھے وہاں اب میں نے ہر چھوٹی موٹی بات میں انھیں خوش کرنے کے راستے تلاش کرنے شروع کر دیے تھے۔ مَیں موقع بے موقع مسخرے پن کی حرکتیں کرتی اور وہ قہقہے لگاتے اور میں دل میں مطمئن ہو جاتی، آزردہ ہو جاتی، پریشان ہو جاتی۔ مَیں یکلخت جوان ہو گئی تھی، شاید بوڑھی ہو گئی تھی، مجھے اپنی نئی زندگی میں عظیم داخلی پریشان حالی کا سامنا کرنا پڑا۔ مجھے اپنے اوپر ایک بالکل غیر فطری شخصیت کا خول چڑھانا پڑا۔ اپنی شرمندگی کو، اپنی خفت کو، اپنے احساسِ جرم کو چھپانے کے لیے! کسی کو فرصت نہ تھی یہ جاننے کی کہ مجھ میں یہ تبدیلی کیوں کر آئی۔ سب اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ سب کا فرض پورا ہو چکا تھا۔ صرف میرا فرض باقی رہتا تھا . . .

"پھر ایک روز رابرٹ کو مَیں نے اپنا ہمراز بنا لیا۔ وہ سیکنڈری کے آخری سال میں میرا ہم جماعت اور گہرا دوست تھا۔ ایک دن مَیں اور وہ جھوٹ موٹ کے میاں اور بیوی بن کر 'ہوم' جا پہنچے۔ ہم نے ان سے کہا کہ ہم کوئی بچہ گود لینا چاہتے ہیں اور درخواست دینے سے پہلے انکوائری کے لیے آئے ہیں۔ ہم وہاں بے مقصد گھومتے اور ان کی فائلیں دیکھتے رہے۔ پھر مَیں نے وہاں کی سب سے بوڑھی میٹرن کو ایک طرف لے جا کر اپنے بچپن کی تصویر دکھائی اور پوچھا کہ کیا وہ اس بچی کو جانتی ہے؟ اس نے ذہن پر زور دے کر یاد کیا اور میری طرف مشکوک نگاہوں سے دیکھ کر بولی: تم اس لڑکی کے بارے میں کیوں پوچھتی ہو؟ میں نے اس سے کہا کہ یہ لڑکی میری بچپن کی ساتھی تھی اور ایک سال کا عرصہ ہوا کہ مر چکی ہے۔ یہ سُن کر وہ بدحواس ہو گئی اور کہنے لگی کہ قانونی طور پر 'ہوم' کو اس کی اطلاع ہونا چاہیے تھی جو کہ نہیں کی گئی۔ وہ اپنی فائلوں کی طرف دوڑی، لیکن جاتے جاتے اپنی بدحواسی میں مجھے بتا گئی کہ یہ لڑکی سترہ سال ہوئے اس کے سامنے ہی لائی گئی تھی اور کہ جاڑوں کی اس صبح کو یہ لڑکی شہر کے باہر باغ کے ایک بنچ پر ٹھٹھرتی ہوئی پائی گئی تھی۔ اس کی ماں کے بارے میں کسی کو علم نہ تھا۔ باپ قانونی طور پر شاید کوئی تھا ہی نہیں . . .

"اسی شام میٹرن ہمارے گھر آئی اور میرا پول کھُل گیا۔ مجھے کھُلے بندوں مجرم قرار دیا گیا۔ اور ایک ہفتے تک میرا باہر نکلنا اور گھر والوں سے میری بول چال بند کر دی گئی۔ لیکن اب مجھے پروا نہ تھی۔ میرے دل میں نفرت اور جرم کی آگ بھڑک اُٹھی تھی۔ ایسی آگ جو گھن کی طرح اندر ہی اندر کھائے بھی جاتی ہے اور زندہ رہنے کا اور جی بھر کر نفرت کرنے کا جذبہ بھی عطا کرتی ہے۔ میرے ان لوگوں کے درمیان اب ایک جھوٹ جنم لے چکا تھا، جس کے بل پر ہم رہ رہے تھے۔ وہ جھوٹ جو دوست اور دوست، بھائی اور بہن، میاں اور بیوی اور ماں اور بچے کے مابین پیدا ہو جاتا ہے اور دو انسانوں کو، دو ساتھ ساتھ رہتے سہتے، کھاتے پیتے اور سوتے جاگتے ہوئے انسانوں کو ایک دوسرے کے رُوبرو کھڑے ہو کر نفرت کرنے کے قابل بنا تا ہے۔ ان کی ہر

مہربانی، ہر نیک دلی اور ہر سرو ازتگی اب مجھے اپنے اوپر ان کا احسانِ عظیم دکھائی دیتا تھا، کہ جیسے میں ان کی سترہ سال کی جمع شدہ لطف و عنایات کی مقروض ہوں۔ اس خیال نے کہ دُنیا میں کوئی میری پیدائش کا خواہش مند نہ تھا، کہ خدا نے اپنے عکس میں مجھے تخلیق کیا اور اس پر شرمندہ ہوا، کہ میرا وجود ایک جرم تھا جو سڑک کے کنارے سرزد ہوا اور بچہ رہ گیا اور نشر ہوا لیکن کسی کے سر نہ چڑھا اور ساری دُنیا کی ذمہ داری بن گیا، کہ جو بعد میں ترس کھا کر پناہ میں لے لیا گیا اور اس خاطر داری سے پالا گیا جس سے سیامی بلی یا فوکس ٹیریئر کتے کے بچے کو پالا جاتا ہے، کہ جیسے بڑا ہونے پر احساس دلایا گیا کہ یہ جو اس کے سر پر سایہ اور ایک کنبے کی رفاقت اور نگرانی اور کھانے کو روٹی اور پہننے کو کپڑا اور ماں باپ کی محبت اور دوسری اتنی ساری چیزیں اسے مہیا کی گئی تھیں ان پر اس کا کوئی پیدائشی حق نہیں تھا بلکہ یہ عنایات تھیں جو اس پر کی گئی تھیں اور بدلے میں اس سے ہر ہر شے کے لیے شکر گزاری کی توقع رکھی جاتی تھی، اس خیال نے میری ساری شخصیت کو مسخ کر دیا۔ میں اس سلسلے میں کچھ بھی نہ کر سکی۔ اس میں میرا کوئی قصور نہ تھا۔ حد تو یہ ہے کہ اس میں کسی کا بھی قصور نہ تھا . . .

"پھر میں یونیورسٹی میں آگئی۔ اب تک وہ میری کل تعلیم پر دس ہزار ڈالر خرچ کر چکے ہیں۔ ایک اور خیال جو ہر دم میرے پیچھے لگا رہتا ہے یہ ہے کہ ایک روز میں ان کی ایک ایک پائی واپس کر دوں گی۔ پھر میں آزاد ہو جاؤں گی۔ پچھلی گرمی کی چھٹیوں میں میں نے تین ماہ تک ایک چھوٹے سے ہوٹل میں ویٹرس کا کام کیا تھا۔ کھانا کھانے کے لیے آتے ہوئے ٹرک ڈرائیور اور گندے فیکٹری ورکر میری کمر میں انگلیاں چبھویا کرتے تھے۔ آزادی کی خواہش اتنی طاقت ور ہے۔ ایک بار میں نے خواب دیکھا تھا کہ جیسے میرے کندھوں پر پر ہیں اور میں اُڑ رہی ہوں اور اُڑتی جا رہی ہوں اور پھر بادل آ گئے ہیں اور ان کے بیچ بیچ میں اوپر اٹھ رہی ہوں اور نیچے اُتر رہی ہوں اور ابھی غائب ہو جاتی ہوں، ابھی باہر نکل آتی ہوں۔ پھر بادلوں پر ایک جگہ رک کر میں نے دم لیا اور دوبارہ اُسی آسانی اور تیزی کے ساتھ اُڑنے لگی۔ اب نیچے سفید بادلوں کا فرش تھا اور اوپر نیلا آسمان تھا اور چاروں طرف بیکراں وسعت تھی اور سناٹا تھا اور امن تھا اور آزادی تھی اور میں کوشش کیے بغیر جس طرف چاہتی تھی مڑ جاتی تھی، کبھی تیز کبھی ہولے، کبھی اوپر کبھی نیچے، میری بے آواز، بے حرکت اُڑان تھی اور آزادی اور وسعت ختم ہونے میں نہ آتی تھی۔ میں فرطِ مسرت سے چلا اُٹھی: "یہ آسمان میرا ہے . . . !" پھر اُسی مسرت کے مارے میں رونے لگی اور میری آنکھ کھل گئی . . .

آج اس بات کو کئی برس گزر چکے ہیں اور میں اس خواب کے لیے ترس گئی ہوں۔ ہر روز رات کو جب میں خواب آور دوائی کھاتی ہوں تو اس کے لیے دعا مانگتی ہوں۔ لیکن یہ خواب پھر کبھی نہیں دیکھا۔ گھر میں میری دو شخصیتیں ہو گئی تھیں، یہاں پہنچنے پر تین ہو گئیں، چار ہو گئیں، پتہ نہیں کتنی ہو گئیں۔ ہر مرد سے مجھے خوف آنے لگا۔ اب تک آتا ہے۔ ہر مرد کو دیکھ کر مجھے خیال آتا ہے: "یہ مرد . . . میرے قریب آگیا تو مجھے تباہ کر دے گا!" دُنیا کے ہر مرد کی جانب سے میرے دل میں بدظنی پھیل گئی ہے۔ حالانکہ تمھیں سُن کر تعجب ہوگا کہ آج تک کسی مرد نے مجھے ذرا سا بھی دُکھ نہیں دیا۔ ہر مرد کی کشش سے بچنے کے لیے میں نے اپنے اوپر کتنے ہی خول چڑھا لیے ہیں۔ میں نے باتیں کرنے کا اور باتیں کرتے جانے کا فن سیکھا ہے۔ میں دُنیا کے ہر موضوع پر نہایت دلچسپ اور معلومات افزا گفتگو کر سکتی ہوں، حالانکہ مجھے کسی ایک موضوع کے متعلق بھی کچھ پتہ نہیں ہے۔ میں نے اپنے چہرے کے اُتار چڑھاؤ کو اپنے قبضے میں کر رکھا ہے۔ میں دُنیا کی عظیم کتابوں اور عظیم موسیقی اور انگلستان کی سیاسیات اور کیمپس کے سارے اسکینڈلز کے متعلق ایک ہی سانس میں، ایک ہی موڈ میں، یا اپنی مرضی کے مطابق مختلف موڈوں میں بڑی کامیابی اور نفاست کے ساتھ باتیں کر سکتی ہوں۔ اور اس سارے دوران میں مجھے برابر یہ خیال رہتا ہے کہ یہ شخص، یہ خوبصورت اور پُرکشش اور ذہین مرد مجھ سے مرعوب ہو رہا ہے، میرے قبضے میں آ رہا ہے، میرے پھندے میں آ چکا ہے، مسحور ہو چکا ہے۔ اب یہ میرے بس میں ہے کہ اسے رکھوں یا چھوڑ دوں، اُٹھاؤں

یا گرادوں یا اس کا دل توڑ دوں۔ اس سارے دوران میں مجھے برابر یہ خیال رہتا ہے کہ یہ شخص اعلیٰ ہے اور میں ادنیٰ ہوں، چنانچہ اُسے میرے نزدیک نہیں آنا چاہیے۔ اس کو میری حقیقت کا علم نہیں ہونا چاہیے، ورنہ یہ مجھے چھوڑ دے گا۔ اس سے پہلے میں اپنی پوزیشن مضبوط کروں گی۔ میں اپنی ساری مرکب شخصیتیں، اپنا سارا ذہن، اپنا سارا فن استعمال کروں گی۔ اسے مرعوب کروں گی، اسے چھوڑ دوں گی۔ پیشتر اس کے کہ یہ مجھے تباہ کر دے، میں اسے تباہ کر دوں گی۔ . . یہ میری زرہ بکتر ہے، میری زندگی ہے۔ اور حد یہ ہے کہ میں اس ساری بات کو جانتی بھی ہوں۔ آج تک میری اپنے آپ سے، یا دُنیا سے، مکمل صلح نہیں ہو سکی۔ میں نے بڑے خلوص سے کوشش بھی کی ہے . . .

"میں یہ سب کچھ تمھیں اس لیے نہیں بتا رہی کہ تم کوئی پادری ہو اور میں اقبالِ جُرم کے لیے آئی ہوں۔ میں پادریوں سے بھی مل چکی ہوں۔ پادری احمق ہوتے ہیں اور انھوں نے طوطے کی طرح اپنا سبق رٹا ہوا ہوتا ہے۔ وہ بھی میری طرح اپنی شخصیت پر خول چڑھا کر رکھتے ہیں، چنانچہ بے اثر ہوتے ہیں اور ہماری کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ میں تمھیں یہ سب کچھ اس لیے بتا رہی ہوں کہ تم سے شاید دوبارہ ملاقات نہ ہو اور میں نہیں چاہتی کہ تم میرے بارے میں اوٹ پٹانگ سوچتے رہو۔ ہم بڑے اچھے لوگ ہیں اور ہم نے بڑی مضبوط اور خوش حال سوسائٹی بنائی ہے اور اس پر نازاں ہیں۔ لیکن کچھ لوگ ہوتے ہیں جو سب کچھ جانتے ہوئے بھی کچھ نہیں کر سکتے۔ جو سب کچھ کرنا چاہتے ہیں مگر . . . آخری تجزیے میں یہ پتہ چلتا ہے کہ ہم کسی کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتے . . ."

میں اس کی آواز، اُس کے الفاظ کے سحر سے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔

"یہ میری خوش قسمتی ہے،" وہ پھر بولی: "کہ آج تک میرو کے علاوہ کسی مرد نے مجھے متاثر نہیں کیا۔ اور میرو نے خود ہی میرے قریب آنے سے احتراز کیا۔ اس نے مجھ پر بڑا احسان کیا اور میں اُس کی شکر گزار ہوں۔ لیکن سلطان، میں اُس شخص سے ڈرتی ہوں جو ایک روز آئے گا، جسے میں نظر انداز نہ کر سکوں گی۔ پھر میں کیا کروں گی سلطان؟"

"بلانکا!" میں کھنکارا: "مجھے پتہ نہیں کہ تم کیا کرو گی۔"

"تمھیں پتہ نہیں کہ میں کیا کروں گی؟" اس نے سہم کر دہرایا۔

میں نے دوبارہ گلا صاف کیا: "بلانکا میں نے ایک دفعہ تم سے کہا تھا کہ ہم لوگوں میں دوست لڑکیوں کو چومنے کا رواج نہیں ہے لیکن . . ." میں رُک گیا۔

اُس نے گہری نظروں سے مجھے دیکھا اور بڑے دُکھ بھرے پیار سے مسکرائی:

"رواج کو توڑنا چاہتے ہو پاگل آدمی؟" پھر اس نے آنکھیں بند کر لیں اور چہرہ میری طرف اُٹھا دیا۔

جب ہم باہر نکل رہے تھے تو سٹیڈیم کے دروازے پر کھڑے ہوئے مزدوروں نے میری سُرخی مائل سنہری داڑھی اور سیاہ سر اور گندمی رنگت کو، اور بلانکا کے سفید بالوں کو اور ہمارے گہرے اُداس، خاموش چہروں کو اچنبھے اور تمسخر سے دیکھا۔ کیمپس کا راستہ ہم نے خاموشی سے طے کیا۔ گرجے کے سامنے سے گزرتے ہوئے اُس نے صرف اتنا کہا: "سلطان، لوگ عبادت کرتے ہیں تاکہ خدا کو پا سکیں۔ میں خدا کی تلاش میں ہوں تاکہ محبت کر سکوں۔ اپنی اپنی جگہ ہم دونوں ٹھیک ہیں۔ مجھے چومو۔"

تم ٹھیک کہتی ہو محبوب لڑکی، میں نے کہنا چاہا، لیکن کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ صرف آہستہ سے شب بخیر کہہ کر چلا آیا۔

پھر آخری منظر آتا ہے۔ آخری منظر جو سب سے زیادہ قریب، سب سے زیادہ شوخ اور گہرا ہوتا ہے اور تیزی سے نکل

جاتا ہے۔

یونیورسٹی ٹاؤن کا چھوٹا سا ریلوے سٹیشن اور مین مجوب تہ ہیکر ہیں اور میرا سامان رکھا جا چکا ہے اور لمبا سا سبز ٹکٹ میرے ہاتھ میں ہے۔

اور بائرن کہتا ہے: "جب میں اپنا ذاتی آرکسٹرا لے کر عالمی دورے پر آؤں گا تو صرف تمھارے اور تمھارے گھر والوں کے لیے سپیشل پرفورمنس دوں گا۔ رائل کمانڈ پرفورمنس"۔

اور بلانکا کہتی ہے: "یاد رکھنا ایک نہ ایک روز میرا جہاز تمھارے ساحل پر آلگے گا۔ میرا انتظار کرنا"۔

اور جین محض خاموش کھڑی اپنے میٹھے تبسم کے ساتھ دیکھے جاتی ہے، جیسے کہہ رہی ہو: ہم بڑے اچھے لوگ ہیں، ہمیں یاد رکھنا۔ خدا تمھارا بھلا کرے۔

پھر ہاتھ ہلتے ہیں اور رومال ہلتے ہیں اور مسکراتے ہوئے چہرے اداس ہو جاتے ہیں، پھر مسکراتے ہیں، پھر اداس ہو جاتے ہیں، پھر ہجوم میں غائب ہو جاتے ہیں، پھر باہر نکل آتے ہیں، پھر دور ہو جاتے ہیں، پھر کچھ پتہ نہیں چلتا۔ گاڑی پہاڑ کا موڑ کاٹتی ہے اور سب کچھ پیچھے رہ جاتا ہے۔

چند ماہ تک بلانکا کے خط آتے رہتے ہیں، پھر بند ہو جاتے ہیں۔ بائرن کا خط کبھی کبھار آجاتا ہے۔ ایک خط سے پتہ چلتا ہے کہ بلانکا ایک یوکرائنی لڑکے میں شدت سے دلچسپی لے رہی ہے۔ پھر اطلاع ملتی ہے کہ دونوں نے شادی کا اعلان کر دیا ہے اور بلانکا بڑی خوش ہے۔ مجھے عجیب سی بے چینی کا احساس ہوتا ہے۔ پھر کئی ماہ تک بائرن کا خط نہیں آتا۔ پھر آج اس کا آخری خط موصول ہوتا ہے جسے جیب میں رکھ کر میں باہر نکل آتا ہوں اور خزاں کی سہ پہر کے پر سکوت سحر کو محسوس کرتا ہوں اور سامنے والے کھیت میں دنیا کے سب سے دل گداز منظر کو دیکھتا ہوں اور ندی پر جھک کر اس سے مخاطب ہوتا ہوں۔

اب ندی کے پل پر شام پڑ رہی ہے اور بہت سارا وقت منظر منظر کر کے پانی میں بہتا ہوا گزر گیا ہے۔ اب کسان یہاں سے جا چکا ہے اور درختوں میں رکی ہوئی ہوا چلنے لگی ہے اور یاد کرتے ہوئے دل کا خوف اترتا جا رہا ہے۔ میں خط کو جیب سے نکالتا ہوں اور دن کے آخری اجالے میں اسے آنکھوں کے قریب لاتا ہوں:

"شادی سے دو ہفتے قبل وہ 'نیاگرا' گئے۔ وہاں پہنچتے ہی انھوں نے مجھے اور جین کو پکچر کارڈ بھیجے۔ شام کو جان بچانے والوں کے دستے نے دو گھنٹے کی تلاش کے بعد دریا میں سے اس کی لاش برآمد کی۔ پولیس کی رپورٹ کے مطابق وہ ریلنگ پر بیٹھی تصویریں لے رہی تھی کہ پھسل کر آبشار میں جا گری۔ موت حادثاتی طور پر عمل میں آئی۔ میں نے اور جین نے بہرحال ہنی مون کے لیے 'نیاگرا' جانے کا خیال ترک کر دیا ہے ——— خدا حافظ ——— تمھارا
——— ڈیوڈ ۔ الیف ۔ بائرن"

میں ایک ایک سطر کو پڑھتا ہوں اور ایک ایک لفظ کو پڑھتا ہوں حتیٰ کہ اندھیرا میری نظر کے راستے کو روک دیتا ہے اور خوف کا سایہ میرے دل پر سے اتر جاتا ہے۔ ایک یاد مکمل ہوئی، ایک یاد ساتھ چھوڑ گئی۔ اب میں آزاد ہوں اور مستقبل کی طرف سفر کرتا ہوں۔ مستقبل جو فراموشیوں کی آماجگاہ ہے، جہاں وہ سب، جو دنیا میں خالص ہے اور خوبصورت ہے اور نازک ہے اور نوجوان ہے اور دلیر ہے، خام اور بعد از بن جاتا ہے، ٹوٹ کر گر پڑتا ہے، پیچھے رہ جاتا ہے، بھلا دیا جاتا ہے، اور گو اس کرۂ ارض پر ساری انسانی آبادی کی پیدائش محض حادثاتی نوعیت کی ہے لیکن کچھ لوگ ہوتے ہیں جو اپنی پیدائش کے حادثے کو نہیں بھلا سکتے، جو اپنے خلوص و ذہانت اور اپنے حسن اور اپنی دیانتداری کو یکجا رکھنے کی خاطر بہادری سے کھڑے رہتے ہیں اور کھڑے رہتے ہیں اور بالآخر اپنی اعلیٰ ترین کی سفاکی کے مقابل ناپائیدار ثابت ہوتے ہیں اور گر پڑتے ہیں۔ یہ لوگ

زمانے کا خمیر ہیں جو اپنے زور سے ٹوٹ جاتے ہیں اور انسانی حافظوں سے محو کر دیے جاتے ہیں۔ یہ وقت کا ظلم ہے جس پر ہم قادر نہیں ہیں، جس کی برابری صرف ہماری ادنیٰ یاد کی رحمدلی کرتی ہے۔

مَیں پُل پر جھک کر کھڑکھڑاتا ہوا کاغذ آہستہ سے ندی میں گرا دیتا ہوں۔ پانی کی سطح پر اندھیرا اُتر آتا ہے: اس میں ہم سب برابر کے شریک ہیں۔ تم اکیلی ہی نہیں ہو . . . بلانکا!

سمندر

جہاز کا نام کیلیڈونیا تھا۔ کیلیڈونیا پر وہ میری پہلی دوست تھی۔

"ایک دو تین —— چار، پانچ، چھ، سات، آٹھ، آٹھ، آٹھ —— پندرہ سولہ سترہ ——" میرے قریب ریلنگ پر جھکی وہ سمندری بگلوں کو گن رہی تھی۔

ہم اطلانتک کو پار کر رہے تھے۔ ابھی کچھ دیر پہلے جب سورج ڈوب رہا تھا تو اسی ڈیک پر جہاز کے نقارچیوں نے کوچ کا نغمہ بجایا تھا جس میں شامل الوداعی دھنوں کے ساتھ ساتھ روانگی سفر کا ولولہ بھی تھا جس نے ہم سب کو بیک وقت غمزدہ اور خوش وخرم بنا دیا تھا۔ اب شام پڑ رہی تھی اور ہم ساحلی پانیوں میں چکر کاٹ رہے تھے۔ کنارے کی روشنیاں سمندر میں جھلملا رہی تھیں جو تاریک تر ہوتا جا رہا تھا۔ آہستہ رو جنوبی ہوا چل رہی تھی۔

سمندر! میں نے خوش ہو کر سوچا۔ سمندر!!

"ایک دو تین تین تین ——" زرد اونی ٹوپی والی لڑکی پھر شروع سے گننے لگی۔

سمندری بگلوں کی ٹولی نے ساحل سے ہی ہمارا تعاقب شروع کر دیا تھا۔ وہ تعداد میں بیس پچیس کے لگ بھگ ہوں گے گو ایک ایک کر کے گنے نہ جا سکتے تھے کہ ہماری طرح وہ بھی جہاز کے شاندار کوچ سے اور کوچ کے نغمے سے مسحور و متاثر

معلوم ہوتے تھے اور مسرور شرابیوں کی طرح لڑکھڑاتے ہوئے پھڑپھڑاتے ہوئے اور تیزی سے ایک دوسرے کے راستوں کو کاٹتے ہوئے اُڑ رہے تھے، گر رہے تھے اور ننھی ننھی کاغذی کشتیوں کی مانند لہروں پر ڈول رہے تھے۔ لحظہ بہ لحظہ تیز تر ہوتی ہوئی ہوا میں سمندر سوئے ہوئے دیو کی مانند تھا جس کی تاریک چھاتی یک مجم اُٹھ رہی تھی، بیٹھ رہی تھی اور پھنکارتی ہوئی سانسیں کانوں میں شور مچا رہی تھیں۔ جہاز آہستہ آہستہ ڈولنے لگا تھا ــــ سمندر! میں نے ذرا سہم کر سوچا۔

"اٹھارہ ــــ" وہ چلا کر بولی۔

"ایں؟"

"میں نے گنے ہیں۔"

"اچھا؟" میں جواب میں چلّایا: "مبارک ہو۔"

وہ اپنے زردی مائل سنہری بالوں کی لٹ کو ٹوپی میں اُڑس کر میرے قریب کھسک آئی: "تم نے بھی گنے ہیں؟"

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"پتہ نہیں۔"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اُس کے دانت صاف، شفّاف اور ہموار تھے۔

"تم تو اتنی دیر سے دیکھ رہے ہو۔"

"میں ساحل کو دیکھ رہا تھا۔"

"ساحل کہاں ہے؟" وہ ریلنگ کے درمیانی ڈنڈے پر پاؤں رکھ کر کھڑی ہو گئی: "ساحل کہاں ہے؟"

"اب چھپ گیا ہے۔"

"کہاں؟"

"سمندر کے پیچھے۔"

"سمندر کے پیچھے؟" اُس نے دہرایا۔ وہ ریلنگ سے چمٹی ایک ہاتھ سے بالوں کی اُس لٹ سے لڑے جا رہی تھی جو ہوا کے زور سے مستقل اُس کی آنکھوں پر جھول رہی تھی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر لٹ کو مضبوطی سے ٹوپی کے نیچے جما دیا۔

"میرا نام فیروز ہے۔" میں نے کہا: "احمد فیروز۔"

"میرا نام اینڈ ہے۔" وہ بولی۔

"ایں؟"

"ای نِڈ۔"

"ای نِڈ کیا؟"

"سی گل ــــ"

"سی گل؟"

"ہاں ہاں۔ ای نِڈ سی گل۔ ای نِڈ سی گل۔" اس نے چڑ کر کہا۔

"ہا ہا ہا۔ سی گل ــــ" اب ہنسنے کی میری باری تھی۔ "یعنی سمندری بگلا؟"

"میں نے گنے ہیں۔ اٹھارہ ہیں۔"

"نہیں اُنیس ہیں۔" میں نے کہا۔

"تم نے گنے ہیں؟"

"ہاں۔"

"تم کہہ رہے تھے کہ تم نے نہیں گنے۔"

"اب گن لیے ہیں۔ اٹھارہ وہ ہیں اور ایک —————" میں نے اس کی ناک کو چھوا: "یہ ہے۔"

یہ بات اس کی سمجھ میں نہ آئی۔ اس کا شاید اسے کبھی خیال نہ آیا ہوگا کہ اس کے نام کے معنی سمندری بگلا ہیں۔ کچھ دیر تک اسی اُلجھن میں میری طرف دیکھتے رہنے کے بعد اس نے دھیان ہٹا لیا اور دوبارہ آبی پرندوں کو گننے لگی۔

"ایک دو تین چار چار چار پانچ۔"

تھوڑی دیر بعد جب ہوا کی تیزی کی وجہ سے سمندر کا تاریک دیو گہرے خواب کی حالت میں پھنکارنے اور کروٹیں بدلنے لگا اور کان پڑی آواز سُنائی نہ دینے لگی اور بال اُڑ اُڑ کر ہم دونوں کی آنکھوں پر پڑنے لگے اور ٹوٹتی ہوئی لہروں کی بوچھاڑ ڈیک تک پہنچنے لگی، اور جہاز کی رولنگ بڑھ گئی تو پیشتر اس کے کہ میں اسے احتیاطاً اپنے ساتھ لگاتا یا تھام کر رکھتا وہ ریلنگ پر سے چھلانگ لگا کر اپنی موٹی موٹی گوری گوری ٹانگیں جھلاتی ہوئی بھاگ گئی۔

جب ہم اپنے پاسپورٹ اور دوسرے کاغذات لے کر 'پرسر' کے دفتر کے آگے قطار باندھے کھڑے تھے تو ہمارے پاؤں کے نیچے مسلسل زلزلے کی کیفیت تھی۔ وہاں سے ہمیں جہاز کے قواعد و ضوابط کی ایک ایک چھپی ہوئی کاپی ملی جس میں علاوہ اور باتوں کے یہ بھی درج تھا کہ سورج غروب ہونے کے بعد 'ڈائننگ ہال اور دوسرے تمام 'پبلک رومز' میں جانے کے لیے شام کے لباس کا پہننا ضروری امر ہے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

جہاز کی نچلی منزل میں ڈائننگ ہال، جس میں تین سو سے زاید آدمی ایک وقت میں بیٹھ کر کھانا کھا سکتے تھے، خوب کھلا اور روشن اور پُر شور تھا۔ میزوں پر جہاز کی اوّلیں دوستیاں لگائی جا رہی تھیں۔ میرا ساتھ ایک نوجوان اور خوش شکل ہنگیرین جوڑے سے ہوا۔ اس میز پر ہم تین ہی آدمی تھے، چنانچہ انھوں نے فوراً مجھے اکیلا جان کر اپنی تحویل میں لے لیا۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم سوپ کو کپڑوں پر گرنے سے بچانے کی کوششوں میں مصروف ہنسنے اور باتیں کرنے لگے۔

"ارے ابھی کیا ہے۔" ہنگیرین خاوند نے اطلاع دی: "پتہ تو تجھے بھی اطلانتک کے بیچ میں جا کر چلے گا جب سوپ اُڑ اُڑ کر چھت کو پہنچتا ہے اور اسے پینا منظور ہو تو مُنہ کھول کر اس کے پیچھے پیچھے بھاگنا پڑتا ہے۔"

"تم نے کون سی لڑکی پھانسی ہے؟" ہنگیرین بیوی نے پوچھا۔ میں نے پریشان ہو کر اسے دیکھا۔

"کل صبح سے پہلے پہلے ساری لڑکیاں لگ جائیں گی۔" اس نے بتایا: "خیریت چاہتے ہو تو آج ہی کسی نہ کسی کو پھانس لو ورنہ ہاتھ ملتے رہ جاؤ گے۔"

مَیں نے ہال میں چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ آخر ایک کونے کی میز پر مجھے وہ کھانا کھاتی ہوئی نظر آ گئی۔ اس وقت وہ سکرٹ میں تھی اور اس کے زرد سنہرے بال اسی رنگ کے ربن سے بندھے ہوئے شانوں پر پڑ رہے تھے۔

"وہ —————" مَیں نے کہا۔

"وہ کیا؟" ہنگیرین بیوی نے پوچھا۔

"وہ زرد لباس والی لڑکی ————— وہ زرد ربن والی، آج شام کو میں نے اس سے دوستی لگائی ہے!"

"وہ؟"

"ہاں وہ۔" میں نے متانت سے کھانا جاری رکھا۔
ہنگیرین خاوند نے منہ کھول کر ہنسا۔ پھر بیوی منہ کھول کر ہنسی۔ میں بھی اخلاقاً منہ کھول کر ہنسا۔ پھر وہ دونوں تندہی سے کھانے پر پل پڑے۔ دل میں یہ اندازہ کرکے کہ میرے کھانے کے ساتھی کم پڑھے لکھے اور مغربی دنیا کے مشہور و معروف خوشحال نچلے متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگ تھے مجھے کافی مایوسی ہوئی۔ یہ طبقہ میرے اطالوی پارک کے دورانِ قیام میں میری ذہنی اور روحانی شخصیت کے اعصاب پر سوار رہا تھا اور میں نے اس کے ہاتھوں بڑے دکھ اٹھائے تھے۔ جب سے میں جہاز پر سوار ہوا تھا چوری چوری، دل ہی دل میں شاید کسی کم گو، ذہین اور مہذب انگریز کی ہمسائیگی کی خواہش کو پال رہا تھا۔ چوری ہی چوری، یہ خواہش اب حسرت بن چکی تھی۔
"ہم بوڈاپسٹ میں تھے جب (۱۹۵۶ء کی) بغاوت شروع ہوئی۔" کھانے کے بعد کافی پیتے ہوئے ہنگیرین خاوند نے پہلی بار اپنے زبردستی کے مزاحیہ لہجے کو ترک کرکے کیساں، غیر جذباتی آواز میں بتانا شروع کیا: "ہم اس وقت اپنی منگنی کا اعلان کرچکے تھے اور ساتھ ساتھ کی فیکٹریوں میں کام کررہے تھے۔ بوڈاپسٹ کی گلیوں میں، جہاں ہم رہتے تھے، ہم نے کچے مورچے کھڑے کیے اور پانچ روز تک ان کے عقب سے لڑتے رہے۔ جب روسی ٹینک شہر میں داخل ہوئے تو ہم انڈر گراؤنڈ چلے گئے۔ اس رات —— جب ہم شہر سے فرار ہوئے ہیں ہمیں برف کے طوفان نے آگھیرا۔ خدایا۔ تمہارے ملک میں برف کے طوفان آتے ہیں؟"
"نہیں۔"
"پھر تم اندازہ نہیں کرسکتے۔ لیکن بہرحال، برف کے طوفان میں ہم نے رات بھر میں چالیس کلومیٹر کا فاصلہ طے کیا، برقی رو والا کانٹے دار تار کا ٹا اور آسٹریا کی حد میں داخل ہوئے۔ آخری دس کلومیٹر میں نے اپنی بیوی کو کندھوں پر اٹھا کر طے کیے۔ اس کے پاؤں سوج گئے تھے۔ جب ہم نے سرحد پار کی تو میرے پاؤں بھی ناکارہ ہوچکے تھے۔ وی آنا پہنچ کر ہم نے شادی کرلی۔ میرے پاؤں سوج گئے تھے، تم اندازہ بھی نہیں کرسکتے —— برف کا طوفان!
"میرے ملک میں بڑی سخت گرمی ہوتی ہے مگر۔"
"خوش قسمت آدمی ہو ——" اس نے کافی ختم کرتے ہوئے پُرخلوص لہجے میں کہا۔
اُس وقت وہ مجھے اپنی طرف آتی ہوئی نظر پڑی۔ وہ اپنی ماں کی انگلی پکڑے ڈائننگ ہال سے باہر جارہی تھی۔ مجھے دیکھ کر مسکرانے لگی۔
"ہلو ای بنڈ۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔
"ہلو ——"
"تم نے کھانا اچھی طرح سے کھالیا؟"
"کھالیا۔" اس نے کہا: "ممی ہم سمندری بگلوں کو دیکھ رہے تھے۔ ان کا نام —— مجھ کو بھول گیا ہے۔"
"فیروزر۔" میں نے کہا۔
"نے روز۔ ممی ان کا نام نے روزہے۔"
اُس کی ماں جو ایک شائستہ اور پُروقار جوان عورت تھی آہستہ سے مسکرائی۔ پھر جرمن لہجے میں بولی:

"آج شام اس نے مجھے خاصا پریشان کیا۔ مَیں سارے میں اسے ڈھونڈتی پھری۔"
"جہاز پر یہ میری پہلی دوست بنی ہے۔" مَیں نے کہا۔
"ممی ممی —— مَیں نے روز سے دوستی کرسکتی ہوں؟"
"" مسٹر فیروز۔" اس کی ماں نے تنبیہاً کہا۔
"میں مسٹر فیروز کے ساتھ دوستی کرسکتی ہوں؟"
"کرسکتی ہو۔"
"مسٹر فے روز مَیں تم سے دوستی کرسکتی ہوں۔"
"بڑی خوشی کی بات ہے۔" مَیں نے کہا: "بہت بہت شکریہ۔"
"ممی ممی —— مَیں مسٹر فے روز کے ساتھ ڈیک پر جاسکتی ہوں؟"
"نہیں ای ٹیڈ —— اب ہم سونے کے لیے جارہے ہیں۔"
"گڈ نائٹ مسٹر فے روز ——" ہال سے باہر آکر اُس نے کہا۔
"گڈ نائٹ ای ٹیڈ۔ گڈ نائٹ میڈم سی گل۔"
"گڈ نائٹ۔" اُس کی ماں نے اخلاق سے جواب دیا اور اپنے کیبن کی طرف چلی گئی۔

ڈیک پر نئے نئے جوڑے پھر رہے تھے۔ جہاز ایک یونانی کمپنی کی ملکیت تھا مگر سٹاف تمام تر جرمن تھا اور مسافروں میں بھی زیادہ تر وہ جرمن لوگ تھے جو امریکہ اور کینیڈا میں آکر بس گئے تھے اور کرسمس منانے کے لیے واپس یورپ کو جارہے تھے۔ یہ لوگ ابھی ابھی کھانے کی میزوں پر اور بار پر ایک دوسرے سے ملے تھے اور اب دو دو چار چار کی ٹولیوں میں ڈیک پر گھوم رہے تھے اور سگریٹ پی رہے تھے۔ زرد بالوں والے جرمن مردجن کے چہرے، جب وہ پینتیس سے تجاوز کرتے ہیں تو، ایک خاص طرح پر پھول جاتے ہیں، اور بلونڈ جرمن لڑکیاں جن کی جلد قریب سے دیکھنے پر ایسی صاف نہیں نکلتی جیسی دُور سے دکھائی دیتی ہے۔ میں ریلنگ کے ساتھ ساتھ دیر تک اکیلا اکیلا پھرتا رہا، کیونکہ ای ٹیڈ جو کہ میری واحد دوست تھی وہاں پر نہیں تھی اور ہنگیرین جوڑا ہجوم میں کہیں گم ہوچکا تھا۔ ڈیک کے آخری سرے پر رک کر مَیں نے دُور تک سامنے اندھیرے میں دیکھا۔ اندھیرے سے پرے اور اندھیرا تھا اور اُس سے پرے اور . . . ! اندھیرا عمیق اور بے کراں تھا اور اس کے اسرار میں گم سمندر کا لافانی دیوکروٹیں بدل رہا تھا اور جاگنے کے لیے بے کل تھا۔
اور جاگ رہا تھا۔

"تم نے عمر بھر مجھے دُور دُور سے چاہا ہے۔" پھر اُس نے مجھے دیکھا اور یوں گویا ہوا: "اور اب مجھ تک پہنچ سکے ہو۔ اب مَیں تم سے مخاطب ہوتا ہوں۔ اس مختصر سے دورِ وصال میں مَیں تمھیں چند باتیں بتاؤں گا جو تمھیں اور کوئی نہیں بتائے گا۔ غور سے سُنو اور پیچھے مڑ کر مت دیکھو، کہ جو پیچھے رہ گیا ہے وہ بھی میرے ہی بدن کا حصّہ ہے اور وہ جو دوسرے کے بدن کا حصّہ ہے تم اُس تک نہیں پہنچ سکتے کیونکہ اس وقت جہاں پر تم موجود ہو وہاں وقت تھم گیا ہے اور ایک ایک پل پر سے تمھارا اختیار اُٹھ گیا ہے کہ یہاں پر مَیں حکومت کرتا ہوں۔ اس لیے نہیں کہ مَیں لافانی ہوں اور طاقت ور ہوں اور غصیل ہوں۔ اس لیے کہ جب پل پل پر تمھارا اختیار تھا تو تم نے ہاتھ بڑھا کر کسی تک پہنچنا ہی نہ چاہا اور آخر بے اختیار ہو کر بیٹھ گئے اور اب پیچھے مڑ کر نہیں دیکھ سکتے کہ جو پیچھے مڑ کر دیکھ سکتے ہیں اُن کا اختیار پل پل پر سے نہیں اُٹھا اس لیے کہ انھوں نے ہاتھ بڑھایا اور پہنچ گئے اور ایک بدن میں دوسرے بدن کو شامل کرلیا اور

شامل ہوگئے اور اب آگے پیچھے کے خود حاکم ہیں اور یکساں، غیر جذباتی آواز میں اس کا ذکر کرتے ہیں اس لیے کہ غور سے سُنو کہیں بھول نہ جاؤ، میرے محب، اس لیے کہ دنیا میں ساری چیزوں کے ہونے کا ایسا اتفاق ہوا ہے کہ محبت میں اور دکھ میں اور دلیری میں اور قربانی میں اور اُن ساری باتوں میں جو زندگی میں کوئی اہمیت رکھتی ہیں کہیں بھی اور کبھی بھی تعلیم اور طبقے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ تم اس کا اندازہ نہیں کر سکتے کہ اب یہاں پر میں حکومت کرتا ہوں۔ شب بخیر۔"

ہوا کے زور سے ایک تاریک لہر ڈیک کے قریب آکر ٹوٹی اور مجھے ٹخنوں تک بھگو گئی۔

سمندر رات بھر جاگ کر صبح کے وقت مزے سے پڑا سوتا تھا۔ اُوپر کے ڈیک پر دھوپ پھیل چکی تھی اور پانی کی سطح گہری نیلی اور چمکدار تھی اور اُس پر ننھی ننھی ہموار لہروں کا جال بچھا تھا۔ کینیڈا کا ساحل حدِ نظر پر ایک مدھم سی سیاہ لکیر میں سمٹ کر رہ گیا تھا۔ موسم مکمل طور پر پُرسکون تھا اور ناشتے سے فارغ ہو کر مسافر ایک ایک دو دو کر کے اُوپر آ رہے تھے اور دھوپ میں سستا رہے تھے اور ہلکی پھلکی مقوی غذا کو ہضم کر رہے تھے اور تمباکو پی رہے تھے اور جہاز ایک بہت بڑے راج ہنس کی سی گریس کے ساتھ بے ڈول چلا جا رہا تھا۔ اب ہم کھلے سمندر میں تھے: "ہم تمہارے بدن کے کس حصے پر ہیں؟" میں نے اُسے باتوں میں لگانا چاہا۔ وہ پڑا سنتا رہا۔ اُس کو اس طرح مغلوب دیکھ کر مجھے عجیب سا احساسِ برتری ہوا اور مکمل اطمینان کے ساتھ ریلنگ سے ٹیک لگا کر میں پائپ میں تمباکو بھرنے لگا۔

"ممی ممی میں مسٹر نے روز کے ساتھ کھڑی ہو سکتی ہوں؟" عقب سے آواز آئی۔

"مسٹر ——" اُس کی ماں نے سختی سے کہا۔

"ممی میں مسٹر نے روز کے ساتھ وہاں کھڑی ہو سکتی ہوں؟"

میں نے مڑ کر اس کی ماں کو سلام کیا۔ وہ بڑے اخلاق اور بڑے وقار اور بڑی علیحدگی سے مسکرائی اور جا کر پاس کی کرسی پر بیٹھ گئی۔ ای نڈ بھاگ کر ریلنگ پر جا چڑھی۔

"صبح بخیر ای نڈ۔ تم اچھی طرح سے سوئیں؟" میں نے کہا۔

"ایک دو تین —— وہ دیکھو —— چار پانچ چھ —— سات۔"

"ارے رے رے —— رکو رکو ——" میں نے اس کے پھیلے ہوئے بازو سمیٹے اور اُسے ریلنگ سے اُتار کر کھڑا کر دیا۔

"اگر گر جائیں تو؟"

"آج زیادہ ہو گئے ہیں۔"

"میں پوچھتا ہوں اگر گر جائیں تو ——!"

"آج بیس ہو گئے ہیں۔"

"اگر گر جاتیں تو تم بھی بگلا بن جاتیں۔"

"میں نے گن لیے ہیں۔ کل اٹھارہ تھے آج بیس ہو گئے ہیں۔"

"یہاں بیٹھو۔" میں نے ایک ڈیک کی کرسی کھینچ کر اُسے بٹھا دیا۔

"دو کہاں سے آئے ہیں۔ مسٹر نے روز دو کہاں سے آئے ہیں؟"

"اب تم میری نگرانی میں ہو۔" میں نے کہا: "ریلنگ پر نہیں چڑھ سکتیں۔ پتا نہیں دو کہاں سے آئے ہیں۔"

"تم کو پتا نہیں دو کہاں سے آئے ہیں؟" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی: "مسٹر نے روز دو کہاں سے آئے ہیں؟"
"تمھیں بُرا حساب آتا ہے!" میں نے کہا۔
"دو کہاں سے آئے ہیں؟"
"ذرا دم لو، مجھے سوچنے دو۔ ارر —— دو —— ہاں۔ دو نے بچّے دیے ہیں۔"
وہ بےحد محظوظ ہو کر ہنسی: "بگلے انڈے دیتے ہیں۔ مسٹر نے روز بگلے تو انڈے دیتے ہیں۔"
"تمھیں کیسے پتا؟"
"مجھ کو پتا ہے۔"
"اس لیے کہ تم بھی بگلا ہو؟"
"نہیں میں تو ای نڈ ہوں۔"
"تم ای نڈ سی گل ہو۔"
"سی گل تو نام ہے۔"
"تم سی گل ہو اور یہ سارے بگلے تمھارے عزیز و اقارب ہیں۔ میں جانتا ہوں۔"
"نہیں۔" وہ چیخی: "ممی ممی، مسٹر نے روز کو بتاؤ۔"
اس کی ماں نے مسنگ پر سے نظر اٹھا کر مسکرائی: "تم خود بتاؤ۔"
"مسٹر نے روز یہ سی گل ایس ای ای جی ای ایل ایل ہے۔ یہ میرا نام ہے۔"
"ٹھیک ہے۔ پھر دُور کے رشتہ دار ہوں گے۔"
"کون؟"
"بگلے۔"
"ہمارے رشتہ دار جرمنی میں ہیں۔"
"جرمنی میں بگلے ہوتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔
"وہاں مائیکل بھی ہے۔ وہ کرسمس پر سات برس کا ہو جائے گا۔"
"بڑی خوشی کی بات ہے۔ یہ مائیکل کون ہے؟"
"گیارہ بجے ہمیں آئس کریم ملے گی۔ مسٹر نے روز تم گیارہ بجے آئس کریم کھاؤ گے؟"
"میں آئس کریم نہیں کھاتا۔"
"مجھ کو آینا نے بتایا تھا۔"
"آینا کون ہے؟"
"میری دوست ہے۔"
"وہ بھی آئس کریم کھاتی ہے؟"
"وہ جہاز پر رہتی ہے۔ مسٹر نے روز تم میرے ساتھ پنگ پونگ کھیلو گے؟"
"ارے تم سے کیا کھیلوں گا؟" میں نے اکتا کر کہا۔
"میں مارچ میں چھ برس کی ہو جاؤں گی۔"

"میرا بھی یہی اندازہ ہے۔"
"اب میں پانچ سال نو ماہ کی ہوں۔"
"تم بڑی باتیں کرتی ہو۔"
"ایک دو تین چار —— پانچ چھ ——"
"چلو ٹہلیں۔" میں اُٹھ کھڑا ہوا۔
ہم دونوں ہاتھ میں ہاتھ دیے ریلنگ کے ساتھ ساتھ ٹہلتے ہوئے ڈیک کے آخری سرے تک پہنچ گئے۔
"ای نڈ۔" میں نے کہا: "میرا خیال ہے تم بڑی اچھی بچی ہو۔"
"بگلے کہاں گئے؟"
"ای نڈ یہاں بیٹھ جاؤ۔"
"بگلے یہاں سے نظر نہیں آتے۔"
"یہ دیکھو کیسا اچھا اسٹول ہے۔"
"مسٹر نے روز تم تیر لیتے ہو؟"
"ای نڈ ——"
"ہوں ——"
"آؤ باتیں کریں۔"
"تم پانی میں تیر لیتے ہو؟"
"ای نڈ چپ رہو۔"
وہ خاموش ہو کر مجھے دیکھنے لگی۔ اُس کی معصوم، ہراساں شکل کو دیکھ کر میں ندامت سے ہنسا۔
"ہاں۔ تیر لیتا ہوں۔"
"تم میرے ساتھ تیرو گے؟"
"ای نڈ۔" میں نے لمبی سانس لی: "ای نڈ تمھاری ممی۔" آخر میں نے کہہ دیا: "ہمارے ساتھ کیوں نہیں آتی؟"
"ممی ممی ——" اُس نے پریشان ہو کر چاروں طرف دیکھا: "ممی کہاں گئی؟"
"وہ دوسری طرف بیٹھی ہے۔"
"ممی میرے لیے پُل اوور بُن رہی ہے۔"
"اور تمھارے ڈیڈی؟"
"ڈیڈی نہیں ہیں۔"
میں نے اطمینان کا سانس لیا۔
"کہاں ہیں؟"
"ممی میرے لیے زرد پُل اوور بُن رہی ہے۔"
"مجھے پتا ہے۔" میں نے کہا: "ای نڈ ممی سے کہنا مسٹر نے روز تمھاری باتیں کر رہے تھے۔"

"میری باتیں کر رہے تھے؟"

"نہیں۔ ممی کی۔"

"کیا باتیں کر رہے تھے؟"

"اررر —— اچھا مت کہنا۔"

"وہ آگئی ——" وہ دونوں بازو پھیلا کر چیخی: "گیارہ بج گئے ہیں؟"

"پتا نہیں۔"

"مسٹر نے روز تم آئس کریم نہیں کھاؤ گے؟"

"میں آئس کریم کو سخت ناپسند کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔

بیرے نے کاغذ کے کپ میں اُسے آئس کریم لا کر دی جسے وہ گتے کے چمچے کے ساتھ مزے لے لے کر کھانے اور مُنہ بنا کر ہنسنے لگی۔

"آئس کریم صرف بچے کھاتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"میں مارچ میں چھ برس کی ہو جاؤں گی۔"

"مجھے علم ہے۔ شکریہ۔"

وہ خاموش بیٹھی آئس کریم کھاتی اور ادھر اُدھر دیکھتی رہی۔

"ای ٹڈ ——" میں نے مری ہوئی آواز میں کہا: "آؤ باتیں کریں۔"

"اچھا۔" اس نے کہا اور آئس کریم کھاتی رہی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ سٹول سے چھلانگ لگا کر بھاگ گئی۔ میں اُداسی سے اُسے ڈیک کے دوسرے سرے تک موٹی موٹی گوری ٹانگیں جھلا کر بھاگتے ہوئے دیکھتا رہا۔

لنچ سے پہلے لاؤنج میں بیٹھ کر میں نے چند خطوط لکھے اور انھیں ڈاک کے سپرد کرنے جہاز کے ڈاک خانے تک گیا۔ لنچ کے بعد ڈائننگ ہال سے نکلتے ہوئے میڈم سی گل سے اتفاقیہ ملاقات ہو گئی۔ (یا کہ میں نے غیر شعوری طور پر —— یا شاید عمداً؟ —— ہال سے اپنی روانگی کے وقت کو اس طور متعین کیا تھا؟) وہ اکیلی تھی۔ "ہلو۔" میں نے کہا۔ پھر میں نے ای ٹڈ کے بارے میں پوچھنا چاہا، مگر اس کی اس لافانی، لاتعلق، اجنبی اور پُراخلاق مسکراہٹ کو دیکھ کر میرا خون سرد پڑ گیا۔ ہم نے خاموشی سے سیڑھیاں طے کیں۔ یہاں اُس نے پھر مجھے سر کی بے نام سی جنبش کے ساتھ الوداع کہا۔ اُوپر جانے سے پہلے، کوشش کے باوجود میں ایک لحظے کے لیے ٹھٹک کر اُس کے شاندار، متحرک جسم کو دیکھنے سے باز نہ رہ سکا، کہ اس عورت کے جسم میں ایک اسرار تھا۔

سہ پہر کے وقت میں نے جہاز کے فونوگراف پر اپنے چند ریکارڈ بجا کر سُنے۔ پھر ڈنر کے وقت تک اپنے کیبن میں پڑا سونے کی کوشش کرتا رہا۔ رات کے کھانے کے بعد ڈانس شروع ہوا۔ اس وقت میرے ساتھی ہنگیرین جوڑے نے پھر مجھے اپنے چارج میں لے لیا اور دو رہی دُور سے مجھے، رقص کرنے کے لیے، کئی لڑکیاں تجویز کرتے رہے جنھیں میں مستقل رد کرتا رہا۔

"میرے مُلک میں ایسا رقص نہیں ہوتا۔" آخر میں نے کہا۔

"تمھارے مُلک میں کیسا رقص ہوتا ہے؟" ہنگیرین بیوی نے پوچھا۔

"ہمارے ہاں خٹک ڈانس ہوتا ہے۔"

"ایں؟"

"یہ مارشل ڈانس ہے۔" میں نے فخر سے کہا: "ہم مارشل ریس ہیں۔"

وہ دونوں منہ کھول کر ہنسے۔ غصے کے مارے میں بھی منہ کھول کر ہنسا۔

تھوڑی دیر کے بعد ہنگیرین جوڑا اگلے دن کے لیے برج کا پروگرام بنا کر اور اجازت لے کر سونے کے لیے چلا گیا۔ میں کافی دیر تک وہیں بیٹھا سگریٹ پیتا اور مختلف جوڑوں کو دیکھتا رہا جو زیادہ تر نوجوان جرمن لڑکیاں اور لڑکے تھے اور جرمن گیتوں کی دھنوں پر رقص کر رہے تھے۔ ایک بہت نوجوان لڑکا خصوصاً میری توجہ کا مرکز رہا تھا جو ایسی اذیت ناک تندہی کے ساتھ ناچ رہا تھا اور اتنی تیزی سے ہم رقص لڑکیوں کو بدل رہا کہ کچھ دیر کے لیے مجھے اس کی صحیح الدماغی پر شک ہونے لگا۔ پھر میں نے اداسی سے سوچا، یہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے۔ آخر جب رات آدھی سے زیادہ گزر چکی اور بہت کم جوڑے ہال کے فرش پر رہ گئے اور سازندے جمائیاں لینے لگے تو میں اُٹھ کر ڈیک پر نکل آیا۔ کہیں کہیں پر ابھی تک کوئی کوئی جوڑا ریلنگ پر جھکا سرگوشیوں میں مصروف تھا۔ میری جگہ خالی تھی۔ وہاں کھڑے ہو کر میں نے دیکھا، بہت زرد رنگ کا نصف چاند سمندر پر جھکا ہوا تھا اور سمندر جاگ رہا تھا۔

"تم باتیں کرتے ہو لیکن نہیں کرتے گو کرنا چاہتے ہو مگر نہیں کر سکتے۔" پھر اس نے مجھ سے کہا: "اس لیے نہیں کہ نحیف و نزار ہو اور گویائی سے محروم ہو (کیونکہ یہ غلط ہے)، اس لیے کہ پہنچنا نہیں چاہتے بلکہ پانا چاہتے ہو، شامل کرنا نہیں چاہتے اور نہ ہونا چاہتے ہو صرف حاصل کرنا چاہتے ہو، اوّلیں معصومیت کو جو کھو چکی ہے اور پیچھے ناکارہ جسم چھوڑ گئی ہے جو اب اندھے بھکاری کی طرح محض صدا دیتا ہے اور بڑھتا ہے اور خوف کھا کر رک جاتا ہے اور پھر صدا دیتا ہے اور ہاتھ سے ٹٹول کر صرف اپنے جیسے ناکارہ جسموں کو محسوس کرتا ہے اور پکڑ لیتا ہے اور ساتھ گھسٹتا چلا جاتا ہے اور نہیں جانتا کہ میری حکومت میں کون کسی کو حاصل کر سکا ہے! ——— کہ میں بھی جو اتنا غصیل اور طاقت ور اور لافانی ہوں آخر کار سب کو اُگل دیتا ہوں اور تم بھی کہ میرے محبوب ہو ان سب میں شامل ہو اور اُگل دیے جاؤ گے کہ جیسے زندگی بالآخر آدمی کے ڈھانچے کو اُگل دیتی ہے۔ افسوس کہ ابھی تم اس کا اندازہ نہیں کر سکتے کہ ابھی یہاں پر میں حکومت کرتا ہوں اور چاروں طرف میرا تاریک بدن پھیلا ہوا ہے اور تم درمیان میں اکیلے کھڑے ہو اور ابھی زندہ ہو۔ شب بخیر۔"

میں اطمینان سے کھڑا سنتا رہا اور جب اُس نے ختم کیا تو اطمینان سے پائپ سلگا کر واپس لوٹا کہ اب میں اُس کی بکواس کا عادی ہوتا جا رہا تھا۔ ڈیک سنسان پڑا تھا۔ صرف ایک جوڑا ابھی تک نیم اندھیرے میں رُکا ہوا تھا۔ پاس سے گزرتے ہوئے میں نے انھیں پہچانا۔ یہ دونوں آج دن بھر ساتھ ساتھ نظر آتے رہے تھے اور دونوں کے چہروں کی ساخت اور خدوخال میں اس حد تک مشابہت تھی کہ بلا مبالغہ آپس میں بہن بھائی نظر آتے تھے۔ لیکن اس وقت وہ ایک دوسرے کو چوم رہے تھے۔ جہاز پر بعض اوقات اتفاقیہ طور پر سخت غیر موزوں جوڑے بن جاتے ہیں۔

اگلی صبح ہوا نسبتاً تیز اور مطلع ابر آلود تھا اور ساحل کی سیاہ لکیر بھی غائب ہو چکی تھی۔ اب چاروں کھونٹ پانی تھا جو بڑھتا بڑھتا ہر سمت آسمان سے جا ملتا تھا اور جس کا رنگ شوخ نیلے سے گہرا نیلا ہو چلا تھا اور جس کی سطح پر چھوٹی چھوٹی بے ترتیب لہروں کا جال بچھا تھا جن پر جہاز ہولے ہولے ڈول رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں ہوا سے تنگ آ کر میں نیچے اُتر آیا اور لاؤنج میں اپنے ہنگیرین ساتھیوں کے ساتھ بیٹھ کر برج کھیلنے لگا۔ میری ساتھی

ایک غیر معمولی طور پر حسین جرمن لڑکی تھی جس کو میں پہلی دفعہ دیکھ رہا تھا اور جو ظاہر تھا کہ میری طرح اس ہنگیرین جوڑے کی متبنیٰ تھی۔ پہلے ایک گھنٹے تک میں مستقل ہارتا گیا اور مستقل خوش رہا اور برج کے متعلق لطیفے جو مجھے یاد تھے سناتا رہا۔ مثلاً وہ ہٹلر والا لطیفہ جب وہ اپنے تین جرنیلوں کے ساتھ برج کھیلنے بیٹھا تھا اور ایک جرنیل نے کہا وَن ڈائمنڈ اور دوسرے نے کہا وَن ہارٹ اور تیسرے نے کہا وَن نو ٹرمپ اور اب ہٹلر کی کال تھی اور اُس نے کہا وَن کلب تو تینوں سنجیدہ چہروں والے جرنیلوں نے باری باری سے کہا پاس پاس پاس اور کالنگ ختم ہو گئی اور کھیل شروع ہوا۔ اس پر زبردست قہقہہ پڑا۔ (ہٹلر کی میز پر نہیں، ہماری میز پر) ۔ لیکن میری پارٹنر جو شروع کھیل سے ہی غمزدہ تھی، صرف مسکرا کر خاموش ہو رہی۔ پھر مجھے خیال ہوا کہ شاید جرمن ہونے کے ناطے اُسے ہٹلر والا لطیفہ پسند نہیں آیا۔ اس کا اثر زائل کرنے کے لیے میں نے کئی من گھڑت لطیفے سنائے جن کا کوئی اثر نہ ہوا، چنانچہ میں تھک کر خاموش ہو گیا۔

"مسٹر فے روز ——" بازو سے آواز آئی: "آج بگلے اکیس ہیں۔"

"صبح بخیر ای نڈ۔" میں نے تاش کے پتوں پر جھکے جھکے کہا: "کیسی طبیعت ہے؟"

"صبح بخیر۔ ٹھیک ٹھاک ہوں۔ میں نے گنے ہیں۔"

"بڑے افسوس کا مقام ہے۔ ایک اور کہاں سے آ گیا۔"

"مس فے روز۔" وہ میری کرسی کی پشت پر چڑھ کر کھڑی ہو گئی: "آینا کہتی ہے آج ہم تیرنے جائیں گے۔"

"اچھا —— ؟" میں نے بے خیالی سے کہا۔

"یہ کون ہے؟" ہنگیرین خاوند نے پوچھا۔

"یہ میری، متبنیٰ ہے۔" میں نے 'میری' پر زور دے کر کہا۔

ہم چاروں منہ پھاڑ کر ہنسے۔ اُس وقت مجھے افسوس ہوا۔ میری ساتھی اگر نہ ہنستی تو اچھا تھا۔ اس کا شاید اُس کو بھی احساس تھا۔ اگلے ایک گھنٹے تک میں مستقل ہارتا گیا اور مستقل ناخوش رہا۔ ای نڈ مستقل میرے سر پر سوار رہی اور چرچر بولے گئی۔ جب ہم کھیل ختم کر کے اُٹھے تو میں قریب پانچ ڈالر کے ہار چکا تھا۔ آنکھ ملائے بغیر میں نے اپنی ساتھی کا شکریہ ادا کیا اور چلا آیا۔

باہر آ کر ہم نے بگلے گننے شروع کیے۔ پورے اکیس تھے۔ جب بگلے گن چکے تو چپکے کھڑے ہو کر سمندر کو دیکھنے لگے۔

"ای نڈ۔"

"ہوں۔"

"کچھ نہیں۔"

وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگی جو میں نے کچھ نہ سنیں۔

"ای نڈ۔"

"ہونہہ؟"

"آؤ۔" میں نے تھوک نگلا: "باتیں کریں۔"

"اچھا ——" اس نے کہا اور باتیں کرنے لگی۔ میں متلاشی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ کرسیوں پر اور لوگ بیٹھے تھے۔ جب میں دوبارہ اُس کی طرف متوجہ ہوا تو وہ چیخ رہی تھی اور ایک سُرخی مائل سنہرے بالوں والی

جوان عورت اس پر جھکی اُس کو آئس کریم کھلانے کی کوشش کر رہی تھی۔
"مَیں خود کھاؤں گی خود کھاؤں گی۔"
"نہیں مَیں کھلاؤں گی۔" جوان عورت نے کہا۔
"خود کھاؤں گی خود کھاؤں گی خود کھاؤں گی۔" اس نے دُھوم مچائی۔
آخر وہ آئس کریم کا کپ اُس سے چھیننے میں کامیاب ہوگئی اور ریلنگ کے ساتھ لگ کر کھانے لگی۔
"ہلو۔" میں نے کہا۔
"ہلو۔ تمھاری دوست بڑی شرارتی ہے۔"
"یہ میری جہاز کی پہلی دوست ہے۔"
"یہ میری بھی پہلی دوست ہے۔ جہاز کے سارے بچوں میں سے تیز ہے۔" وہ بولی: "مَیں آئینا ہوں۔"
"آئینا ۔ ۔ ۔ ؟"
"آئینا ہیمبرگر ـــــ" اس نے کہا: "مَیں فرسٹ ہوسٹس ہوں۔"
"اور سیکنڈ ہوسٹس کون ہے؟"
وہ ہنسی: "کوئی نہیں ہے۔ جہاز کے سٹاف پر بس مَیں ہی ایک عورت ہوں۔"
"مس آئینا ہیمبرگر فرسٹ ہوسٹس۔" مَیں نے کہا: "کیسے حال چال ہیں؟"
"مَیں بالکل ٹھیک ہوں۔" وہ دوبارہ ہنسی: "تم مزے کے آدمی معلوم ہوتے ہو۔"
"میرا بھی یہی خیال ہے۔" میں نے کہا: "مَیں فیروز ہوں۔"
"دراصل مَیں کل شام کو تمھیں تلاش کرتی رہی ہوں۔"
"مجھ کو؟"
"مجھے وہ تمھارا ریکارڈ چاہیے تھا۔"
"کون سا؟"
"جو تم کل بجا رہے تھے۔ ایلا فٹز جیرلڈ کا۔"
"اوہ۔ ایلا ـــــ" مَیں نے کہا۔
"وہ۔ آئی ایم گلیڈ دیر از یو ان دِس ورلڈ آف آرڈنری پیپل ـــــ"
"اچھا۔" مَیں نے کہا: "پہلا والا۔"
"کچھ دیر کے لیے مجھے دے سکتے ہو؟"
"یقیناً یقیناً ـــــ" مَیں نے کہا: "چلو۔" پھر مَیں بے وجہ گھبرا گیا: "اچھا مَیں لے کر آتا ہوں۔"
اپنے کیبن میں آکر مَیں نے ریکارڈ نکالا اور واپس اوپر جانے سے پہلے اُسے ہاتھ میں لٹکائے چند لمحے تک گم سم کمرے کے وسط میں کھڑا رہا۔ اس بہت پرانی کیفیت سے مَیں اچھی طرح سے واقف تھا۔
واپس ڈیک پر جاکر میں نے ریکارڈ اُس کے حوالے کیا جسے پاکر وہ بے حد خوش ہوئی۔
"اگر چاہو تو لنچ کے بعد سٹاف روم میں آجانا۔ اکٹھے سُن لیں گے۔" وہ بولی۔
"ضرور ضرور۔"

Scanned by CamScanner

"خدا حافظ۔"

"خدا حافظ۔"

اس کے بعد بیچ بیچ میں جانے کتنی دیر تک دس ٹرنے روز، ٹس ٹرنے روز کی آوازیں آتی رہیں۔ آخر جب میں چونک کر مڑا تو اس انڈکیبی کی جا بچکی تھی۔ لنچ کا وقت ہو چلا تھا۔

کھانے کے بعد میں نے شیو کیا، نہایا، صاف کپڑے پہنے اور سٹاف روم پہنچا۔ آینا اپنے چھوٹے سے فونوگراف کو صاف کر رہی تھی اور ایک نوعمر لڑکا اُس سے باتیں کر رہا تھا۔ میں ایک کرسی پر بیٹھ کر سگریٹ سلگانے لگا۔ جہاز کا ایک نوجوان افسر سفید وردی پہنے، کونے کی میز پر ٹانگیں رکھے چند کاغذات دیکھ رہا تھا اور ہونٹوں سے ہلکی ہلکی سیٹی بجاتا جا رہا تھا۔ کچھ دیر کے بعد نوعمر لڑکا جو آینا سے باتیں کر رہا تھا مڑا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ اب میں نے پہچانا۔ یہ وہی لڑکا تھا جو کل رات کو اس افراتفری کی حالت میں ناچ رہا تھا۔ میں آینا کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ اس نے ریکارڈ فونوگراف پر رکھا اور اسی میز پر بیٹھ کر پاؤں سے آہستہ آہستہ تال دینے لگی۔ جب ریکارڈ آدھا بج چکا تو نوجوان افسر نے ٹانگیں اُٹھا کر نیچے رکھیں، کاغذات گول کر کے جیب میں ڈالے اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ کچھ دیر تک وہ کمرے کے وسط میں ٹانگیں پھیلائے ہاتھ جیبوں میں ٹھونسے فرش پر نظریں جمائے کھڑا میوزک کو سنتا رہا، پھر جرمن زبان میں آینا سے کوئی مختصر سی بات کر کے باہر نکل گیا۔ جب گیت ختم ہوا تو آینا نے سوئی کو اُٹھا کر پھر شروع پر رکھ دیا اور ساتھ ساتھ گنگنانے لگی:

I am glad there is you
In this world of ordinary people...

میں اُٹھ کر اُس کے پاس میز پر جا بیٹھا۔

"آسمانی آواز ——!" وہ آنکھیں بند کر کے بولی۔

اب اگلا گیت شروع ہو چکا تھا۔ ریکارڈ کے اس رُخ پر چھ گیت یکے بعد دیگرے بجتے تھے۔

"میں نے ایلا کو نیو یارک میں سُنا تھا۔" آینا نے کہا: "نائٹ کلب میں۔"

"اچھا۔"

"میں اس کی عاشق ہوں۔"

"میں بھی اُس کا عاشق ہوں۔"

"اچھا؟"

"اس حساب سے ہم ایک دوسرے کے عاشق ہوتے ہیں۔"

وہ ہنسی: "ہو سکتا ہے۔"

"ہو سکتا ہے؟"

"ہاں۔ صرف جیومیٹری کے حساب سے۔" اُس نے بڑی آہستگی لیکن مضبوطی سے میرا ہاتھ اپنے کندھے سے ہٹایا اور اُٹھ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔

"تم نے مجھے اپنے بارے میں تو کچھ بتایا ہی نہیں۔" اس نے کہا: "کہاں جا رہے ہو؟"

"میں پاکستان کا رہنے والا ہوں اور دو سال کی غیر حاضری کے بعد اپنے وطن کو لوٹ رہا ہوں۔"

"پاکستان؟"

"ہاں۔ مشرقِ بعید کا ملک ہے اور قدیم تہذیب کا مسکن ہے۔" میں نے فخر سے کہا: "چھ ہزار سال۔۔"
"مگر ہم مشرقِ بعید تو نہیں جا رہے۔"
"تمھیں شاید علم نہیں کہ یہ وہی راستہ ہے۔" میں نے کہا: "پہلے یورپ آئے گا، پھر افریقہ پھر——"
"اوہ۔" وہ ہنسی: "کینیڈا کیا کرنے آئے تھے؟"
"پڑھنے پڑھانے——"
"پڑھنے؟" اُس نے سخت متعجب ہو کر پوچھا۔
"بالکل۔ کیا میں اب پڑھنے کے قابل نہیں رہا؟"
"میرا یہ مطلب نہیں تھا" وہ ندامت سے ہنسی: "میرا خیال تھا شاید تجارت وغیرہ کے سلسلے میں آئے ہو۔"

میں نے حلق میں سخت بدمزگی محسوس کی۔ ریکارڈ ختم ہو گیا تو آئینا نے پھر شروع سے لگا دیا۔ پہلا گیت ہم نے خاموش بیٹھ کر سُنا۔ بدمزگی آہستہ آہستہ زایل ہونے لگی۔
"سمندر کا سفر پہلی دفعہ کر رہے ہو؟" آئینا نے پوچھا۔
"ہاں۔ میری عمر بھر کی خواہش تھی۔"
"طبیعت تو خراب نہیں ہوئی؟"
"نہیں۔ میں بالکل چاق و چوبند ہوں۔"
"آئے کیسے تھے؟"
"ہوائی جہاز سے۔"
"موسمی رپورٹ کے مطابق کل ہم طوفانی سمندروں میں داخل ہوں گے۔ ہوشیار رہنا۔"
"فکر نہ کرو۔" میں نے سینہ پھلا کر کہا: "میں عمر بھر بیمار نہیں پڑا۔"
"تم—— شادی شدہ ہو؟"
"نہیں۔ اور تم؟"
"میں۔" وہ ہنسی: "سمندر سے بیاہی جا چکی ہوں۔"
"میں سمندر ہوں۔" میں نے بازو پھیلا کر کہا۔
وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ریکارڈ ختم ہو چکا تھا۔
"اب مجھے ڈیوٹی پر جانا ہے۔" اس نے ریکارڈ اُتار کر میرے حوالے کرتے ہوئے کہا: "بہت بہت شکریہ۔"
"ارر—— رُکو۔" میں نے تھوک نگلا: "ابھی—— پکچر دکھایا جانے والا ہے۔ چلو دیکھیں۔"
"اس وقت میری اور جگہ پر ڈیوٹی ہے۔ کل دیکھیں گے۔"
"شام کو ڈانس پر آؤ گی؟"
"یہ میری آفیشل ڈیوٹی میں شامل ہے۔" اُس نے کہا: "خدا حافظ۔"
"خدا حافظ خوبصورت لڑکی۔"

وہ خوش ہو کر مسکرائی اور باہر نکل گئی۔

آدھ گھنٹے تک میں تاریک پکچر ہال میں بیٹھا رہا جہاں جینا لولو برجڈا کا فلم دکھایا جا رہا تھا۔ پھر میں نے باہر نکل کر اوپر نیچے جتنے ڈیک تھے سب کا چکر لگایا کرسیوں پر اور اور لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ پھر میں نے سہ پہر کی چائے پی اور اپنے کیبن کو لوٹ آیا۔

کرنے کے لیے اتنا کچھ ہے، بستر پر لیٹ کر میں نے سوچا۔ نچلی منزل میں گرم پانی کا سوئمنگ پول ہے، لاؤنج میں خوش گپیاں ہو رہی ہیں، پبلک رومز میں برج کھیلی جا رہی ہے، شطرنج ہو رہی ہے، بار پر لوگ قہقہے لگا رہے ہیں، باہر ڈیک پر ٹینس کھیل رہے ہیں، تصویریں لے رہے ہیں، کرنے کے لیے اتنا کچھ ہے، میں نے سوچا۔ ڈنر کے وقت تک میں بستر پر لیٹا سگریٹ پیتا اور چھت کو گھورتا رہا۔

رات کے کھانے کے بعد ڈانس شروع ہوا۔ جہاز نے آہستہ آہستہ ڈولنا شروع کر دیا تھا چنانچہ کل کی نسبت کم جوڑے رقص کر رہے تھے۔ میں نے بڑے اخلاق کے ساتھ آینا سے جا کر رقص کی درخواست کی۔ وہی آنا کا والز بج رہا تھا۔

"تم تو بہت اچھا ناچ لیتے ہو۔" آینا نے نیم سنجیدگی نیم تمسخر سے کہا۔

"شکریہ۔"

"میرا خیال تھا اب دھیمے پڑ چکے ہو گے۔"

"میری صحت اللہ کے فضل سے بڑی اچھی رہی ہے۔" میں نے پنجوں پر اٹھ کر اپنے آپ کو اس کے برابر لاتے ہوئے کہا۔

اس کے بعد میں نے دوبارہ آینا کے ساتھ رقص کیا۔ دوسری بار جب میوزک ختم ہوا تو وہ کچھ کہے بغیر باہر چلی گئی۔

"تم مجھ سے جنگ کرنے چلے ہو جیسے کہ عمر بھر جنگ کرتے رہے ہو۔" اُس رات جب میں اپنی جگہ پر پہنچا تو سمندر نے مجھ سے کہا: "مگر پچھتاؤ گے اور ہار جاؤ گے جیسے کہ عمر بھر ہارتے رہے ہو۔ تم نے اتنی محنت کی ہے اور اتنی محنت گنوائی ہے اور اتنی لمبی عمر پائی ہے کہ دیکھنے والے کے دل میں افسوس پیدا ہوتا ہے۔ مگر اب تم تھک چکے ہو اور رُکنا نہیں جانتے کہ اس میں پابندی ہے اور تم نہ پابند ہو نہ قوی ہو اور نہ میری آواز کو سن سکتے ہو کہ ہار چکے ہو اور تسلیم کرنا نہیں چاہتے کہ اس میں تمہاری آخری شکست ہے اور بڑھتی ہوئی، ہر دم قریب آتی ہوئی، آخری شکست تمہیں بولائے دے رہی ہے اور ہاری ہوئی جنگ کو جاری رکھنے پر مجبور کر رہی ہے، اُن نوجوان خداؤں کے بل پر جنھوں نے تم کو معصومیت سے آزادی کے خواب دکھائے ہیں اور جو ایک ایک کر کے سب مر چکے ہیں کہ معصومیت سے آزادی کا نام موت کا نام ہے۔ لیکن تم ابھی زندہ ہو اور زندہ رہو گے اور محنت کرو گے اور اس کا پھل چکھو گے، ایک نہ ایک دن، کہ کڑوا ہو کسیلا ہو، محنت کا پھل ضرور ملتا ہے، کبھی نہ کبھی۔ شب بخیر——"

میں نے طنز سے مسکرا کر اس کے زورِ خطابت کی داد دی اور اس کو شک بھی نہ گزرنے دیا کہ اس کی بے موقع تقریر نے مجھ پر ذرہ بھر اثر نہ کیا تھا، کہ آینا کے جسم میں بھی بالآخر بڑا اسرار تھا جس سے کہ میرا یہ دوست قطعی ناواقف تھا۔ جب میں ڈیک پر واپس آ رہا تھا تو عقب سے میں نے اس کے خوفناک، مجبور اور غصیلے قہقہے کی آواز سنی اور حیرت سے مڑ کر دیکھا۔ وہ پھنکار کر اٹھ بیٹھا تھا اور اس کی تاریک چھاتی تیزی سے یک جسم اُبھر رہی

تھی اور مچل رہی تھی۔ مَیں نے جہاز پر اپنے آپ کو محفوظ پا کر اس کی طرف رُخ کیا اور جوابی قہقہہ لگا کر نیچے اتر آیا۔
کیبن میں لوٹ کر مَیں نے اعصابی کمزوری کے لیے اپنا مخصوص ٹانک پیا اور حسبِ معمول خواب آور گولیاں کھا کر نیند کا انتظار کرنے لگا۔ رفتہ رفتہ مجھ پر اس کے قہقہے کی اصل نوعیت واضح ہونے لگی۔

صبح مَیں سو کر اُٹھا تو چاق و چوبند محسوس کر رہا تھا۔ چائے کی پیالی کے بجائے مَیں نے انناس کا رس طلب کیا۔ پھر شیو کرنے اور صاف ستھرا لباس پہننے کے بعد جا کر پیٹ بھر ناشتہ کیا۔ اُس کے بعد مَیں نے بار پر سے بہترین ولایتی تمباکو کا ڈبہ خریدا اور ڈیک پر بیٹھ کر پائپ سلگانے لگا۔ ادھر اُدھر چند اور لوگ بکھرے ہوئے تھے، ٹہل رہے تھے اور کرسیوں پر بیٹھے اُونگھ رہے تھے۔ مَیں نے یکے بعد دیگرے کئی بار متلاشی نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ اس کا کہیں پتہ نہیں تھا۔

"ہلو ——"

"ہلو ——"

وہ بڈھا جرمن جو دن بھر لاؤنج میں اکیلا بیٹھا بیئر پیتا رہتا تھا سامنے سے گزر گیا۔ سامنے بگلے اپنا مچھلیوں کا ناشتہ کر رہے تھے اور ننھی ننھی کاغذی کشتیوں کی مانند سطحِ سمندر پر ڈول رہے تھے۔ وہ تعداد میں چوبیس تھے۔ مَیں نے تین بار ان کو گنا۔ وہ تعداد میں پورے چوبیس تھے اور کچھ شرارتی مسخروں کی طرح اور کچھ بڑے وقار سے مچھلیوں کا شکار کر رہے تھے۔ اُن کا تماشہ دیکھتے ہوئے مَیں جانے کس وقت اونگھ گیا۔ یکے بعد دیگرے کئی ایک بے حد دلچسپ اور مختصر خواب دیکھنے کے بعد جب میری آنکھ کھلی تو سب سے پہلے میری نظر جس پر پڑی وہ سمندر تھا جس کی سطح پر حدِ نظر تک چھوٹے بڑے متحرک ٹیلے بنے ہوئے تھے اور جو جگہ جگہ سے اُچھل رہا تھا۔ کئی لمحے تک میں ایک قسم کے ذہنی اور جسمانی خلا میں بڑی فراغت کے احساس کے ساتھ مسحور بیٹھا رہا۔ پھر یکا یک ہوا کا ایک زوردار ریلا آیا اور جہاز جھکتا جھکتا تقریباً سطحِ سمندر کو جا لگا۔ مجھ کو جیسے کسی ان دیکھی قوت نے ایک جھٹکے سے اُٹھا کر پیروں پر کھڑا کر دیا اور اگلے لمحے اسی زور میں ڈیک کی ڈھلان پر بھاگتا بھاگتا مَیں ریلنگ سے جا ٹکرایا۔ پھر ہوا کا دوسرا ریلا آیا اور جہاز اُٹھتا اُٹھتا دوسری جانب کو جھکنے لگا۔ میں پچھلے پیروں پر لڑھکتا ہوا آن کر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ڈیک اُٹھتے اُٹھتے آسمان کو جا لگا اور سمندر نظروں سے غائب ہو گیا، صرف اُس کی پھنکار رہ گئی جس میں تیز ہوا کی سنسناہٹ شامل تھی جو فضا میں سیٹیاں بجا رہی تھی۔ ہوا کا زور تیزی سے بڑھ رہا تھا اور جہاز خطرناک طور پر ڈولنا شروع ہو گیا تھا۔ ڈیک پر بکھرے ہوئے چند لوگ جو ادھر اُدھر لڑھکتے پھر رہے تھے اپنے اُڑتے ہوئے لبادوں کو سمیٹتے، خوف اور خوشی کی ملی جلی چیخیں مارتے ہوئے ریلنگ کو پکڑ پکڑ کر نیچے اُترنے لگے۔ مَیں بھی اپنا تمباکو کا ڈبہ اٹھا کر ان کے ساتھ ہو لیا۔
نیچے لاؤنج میں اور گرین روم میں اور بار پر لوگ کھڑکیوں میں کھڑے ایک دوسرے کو تھامے دلچسپی سے جہاز کے ڈولنے کا نظارہ کر رہے تھے اور اپنی سراسیمگی کو چھپانے کے لیے غیر قدرتی طور پر بلند آواز میں ہنس رہے تھے۔

"ہلو ——"

"ہلو ——"

میری برج کی ساتھی حسین لڑکی مسکرائی۔ مَیں جلدی سے آگے نکل گیا۔ دور کوریڈور میں مجھے آینا کی جھلک دکھائی دی۔ مَیں لپک کر بڑھا مگر وہاں پہنچنے سے پیشتر وہ غائب ہو چکی تھی۔ لنچ کے وقت تک مَیں مختلف کمروں میں پھرتا اور جہاز کو ڈولتے ہوئے دیکھتا رہا۔ جب وہ ایک طرف کو جھکتا تو اس طرف صرف سمندر ہی سمندر ہوتا جو کھڑکیوں تک چڑھ آتا اور دوسری طرف آسمان ہی آسمان دکھائی دیتا۔ جب وہ دوسری طرف کو جھکتا تو دوسری طرف سمندر ہی سمندر ہوتا اور پہلی طرف آسمان ہی آسمان نظر آتا۔ چند لحظے تک مستقل دیکھتے رہنے کے بعد جہاز ساکن معلوم ہونے لگتا اور سمندر، حدِ نظر تک پھیلا ہوا وسیع و عریض گہرے نیلے رنگ کا جگہ جگہ سے اُچھلتا کودتا اور پھیلا گھٹتا ہوا سمندر، میکانکی طور پر چڑھتا اور اُترتا، ظاہر اور غائب ہوتا ہوا معلوم ہوتا۔ یہ عجیب و غریب نظارہ تھا جو پہلی بار دیکھنے میں آیا تھا۔ چند لحظے تک اور دیکھتے رہنے کے بعد معدے میں ہلچل مچنا شروع ہوتی اور لوگ بے اختیار غسل خانوں اور باہر ڈیک کی طرف کو بھاگنے لگتے۔ لنچ کے وقفے تک نصف کے قریب لوگ بیمار پڑ چکے تھے۔

سہ پہر تک مَیں جہاز کے ڈولنے سے تنگ آ چکا تھا، اس لیے کہ رولنگ بڑھتی جا رہی تھی اور مَیں ابھی تک چاق و چوبند تھا اور کرنے کے لیے کچھ بھی نہ تھا۔ میں نے لاؤنج میں بیٹھ کر اپنی بیوی اور بڑی بیٹی کو خطوط لکھے جن میں سمندر کی اس کیفیت کو بیان کیا، انھیں ڈاک کے سپرد کرنے لیٹر بکس تک گیا اور پھر واپس کیبن کو لوٹ آیا۔ کیبن میں تین گھنٹے تک میں بستر پر لیٹا مصور رسالوں کی ورق گردانی کرتا اور اپنے آپ کو فرش پر گرنے سے بچانے کی خاطر پہلو بدلتا اور باہر کوریڈور میں نوجوان لڑکے لڑکیوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں سنتا رہا جو طوفانی سمندروں سے برانگیختہ ہو کر بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ شام کے وقت ہم اصل طوفانی سمندروں میں داخل ہوئے۔ یہاں بارش ہو رہی تھی اور ہوا لوہے کی چادر کی طرح بدن کو آ کر لگتی تھی اور سمندر کا تاریک عفریت اپنے جوبن پر تھا اور تئیس ہزار ٹن وزنی جہاز کو تنکے کی طرح بہائے لیے جاتا تھا۔ اگلے پچاس گھنٹے تک یہی حالت رہی۔

سب سے پہلے ڈیک علاقۂ ممنوعہ قرار دیے گئے۔ پبلک ایڈریس سسٹم پر جہاز کے کپتان کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ کوئی مسافر اوپر نیچے کے کسی ڈیک پر نہیں جا سکتا۔ ڈیکوں پر کھلنے والے تمام دروازوں کے ہینڈلوں پر رسیاں باندھ دی گئیں۔ اب 'پبلک رومز' میں ہر وقت بھیڑ رہنے لگی۔ ہر قسم کے کھیل تقریباً بند ہو چکے تھے۔ لوگ ہر وقت کرسیوں پر، صوفوں پر اور بار کے اسٹولوں پر پڑے رہتے اور دروازوں کھڑکیوں کے شیشوں سے ناکیں چپکائے، سراسیمگی، وحشت اور جوش کے ملے جلے جذبات کے ساتھ باہر گرجتے، ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی لہروں کو لپکتے، ڈیک پر آتے، چلتے پھرتے اور واپس جاتے ہوئے دیکھتے رہتے۔ کسی بھی کمرے یا کوریڈور کے فرش کو عبور کرتے ہوئے ہر کسی کو توازن برقرار رکھنے کے لیے رسی پر چلنے والے کاریگر کی طرح ہاتھ پاؤں مارنے پڑتے۔ پہلے بارہ گھنٹوں تک لوگ ایک دوسرے کو مسخروں کی طرح چلتے ہوئے دیکھ دیکھ کر محظوظ ہوتے رہے، پھر اس کے عادی ہو گئے۔ رات کے کھانے کے بعد لوگ صرف شراب پیتے کیونکہ رقص نہ کیا جا سکتا تھا۔ مَیں نے کئی بار شیشوں میں سے بگلوں کو دیکھنے کی کوشش کی مگر وہ کہیں پر دکھائی نہ دیے۔

چوبیس گھنٹوں کے بعد ہم برف کے طوفان میں گھر گئے۔ ہوا گولیوں کی طرح سنسناتی ہوئی اور برف کے پھوئے شیشوں کے ساتھ رگڑ کھاتے ہوئے، سر پٹکتے ہوئے گزرنے لگے اور سمندر چھوٹی چھوٹی سیاہ، متحرک، تیز رفتار پہاڑیوں کی شکل میں جہاز پر حملہ آور ہونے لگا اور جہاز ہلکی پھلکی کشتی کی طرح چکر کھانے لگا۔ پھر کپتان کی طرف سے ہمیں اپنے اپنے کیبن میں رہنے اور بلا ضرورت اِدھر اُدھر نہ پھرنے کی تاکید کی گئی، پھر تنبیہہ

کی گئی، پھر سرزنش ہوئی اور تمام پبلک رومز، کو بند کر دیا گیا۔ ان کے فرنیچر کو جگہ جگہ اوندھا کر کے رسّیوں سے جکڑ دیا گیا اور ان کے دروازے کے آگے موٹے موٹے رسّے باندھ دیے گئے اور بار کو تالا ڈال دیا گیا۔ صرف تین وقت کھانا کھانے کے لیے چند لوگ ڈائننگ ہال میں جمع ہوتے جن کے آگے پیچھے خدّام کی ایک بھیڑ ہوتی، کیونکہ تین چوتھائی مسافر بیمار پڑ چکے تھے۔ اب جہاز پر ایک عجیب منظر تھا۔ نئے نئے نوجوان عشاق، جن کو اس بات کا شدید احساس تھا کہ وقت تیزی سے گزرتا چلا جا رہا تھا اور جہاز کی اس چند روزہ لا انہم اور اخلاقی نظم و ضبط سے پاک رومانوی دُنیا کا خاتمہ قریب تر آتا جا رہا تھا، تاریک کونوں کی تلاش میں کوریڈروں میں چکر پر چکر کاٹ رہے تھے اور کوئی جگہ نہ پا کر ہر طرف بندھے ہوئے رسّوں کے ساتھ بندروں کی طرح لٹک رہے تھے۔ لڑکیاں چھوٹے چھوٹے گروہوں میں کھڑی بیتابی اور حسرت کے ساتھ ہنسے جاتی تھیں۔ پرانے پرانے شرابی جہاز کے ملازموں کو رشوتیں دے کر شراب حاصل کرنے کی ترکیبیں کر رہے تھے۔ بچے کہیں نظر نہ آتے تھے۔

باہر سمندر کا اندھا خونخوار غصیل قوی الجثہ درندہ سات سو انسانی زندگیوں کے محافظ جہاز کے ساتھ زور آزمائی کر رہا تھا۔

ان پچاس گھنٹوں میں مَیں بہت کم سو سکا۔ اس کے علاوہ مَیں نے اپنے مختصر سے کیبن کو پانچ سو سے زاید بار اپنے قدموں سے ناپا، بارہ مصوّر رسالوں کی شروع سے آخر تک ورق گردانی کی، تمباکو کے دو ڈبے خالی کیے اور اکیس بار، پورٹ ہول، کے ڈھکنے کو اُٹھا کر تیزی سے چڑھائی کرتی ہوئی سمندر کی سیاہ گھاٹیوں کو شیشے میں سے دیکھا اور گھبرا کر ڈھکنا گرا دیا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ ڈھکنا بند کرنے کے بعد مَیں اپنے بے بنیاد خوف کو محسوس کر کے جھلّایا اور ہمت کر کے ڈھکنا اُٹھایا اور گول سبز شیشے کے ساتھ منہ لگا کر دانت نکال کر کے اس کا مُنہ چڑایا اور مکّا ہوا میں لہرا کر چلّایا: "ڈرپوک" اور جواب میں شیشے پر اس کی زوردار چپت کو محسوس کر کے پیچھے ہٹا اور ڈھکنا گرا کر تضحیکی قہقہہ لگایا بعد میں جس کی کھوکھلی آواز کو دیر تک کانوں میں گونجتے ہوئے سُنتا رہا۔ کئی بار میں نے یہ محسوس کر کے کہ وہ حسبِ عادت مجھ سے مخاطب ہونے کی کوشش کر رہا ہے شیشے سے کان لگا کر اس کی بات کو سُننا چاہا مگر صرف اس کی گونگی، وحشت ناک چڑھائی اور زور آزمائی کو اور اس کے بے بس جنون کو اور اس کے مجبور و معذور طیش کو ہی دیکھ سکا اور واپس لوٹ آیا اور دل ہی دل میں اس کی گویائی چھن جانے پر خوش ہوا۔ کئی بار (شیشے سے جھانکنے اور کیبن کے فرش کو قدموں سے ناپنے اور بیمار پڑنے سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے ساری قوتِ ارادی کو بروئے کار لاتے ہوئے) مَیں نے محسوس کیا کہ ہم دو گونگے نشہ زور کینہ پرور درندوں کی مانند اپنے اپنے پنجروں میں بند ہیں اور بار بار حملہ کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو گزند نہ پہنچا سکنے پر خفیف ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کی زد سے باہر ہونے پر خوش بھی ہوتے ہیں اور جب تھک جاتے ہیں تو آمنے سامنے بیٹھ کر ایک دوسرے پر زہریلے قہقہے لگاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ایک دوسرے کو مجروح کر رہے ہیں۔

صرف ایک بار مَیں باہر گشت پر نکلا۔ پہلی ڈیک لینڈنگ، پر میں کتنی ہی دیر تک رسّوں پر جھولتا ہوا ادھر سے اُدھر جاتی ہوئی لڑکیوں کی ٹولیوں کو دیکھتا رہا۔ پھر مَیں نے اس چھوٹے سے دفتر میں جھانکا جہاں دو روز پہلے ایلانٹز جیرالڈ کا ریکارڈ بجا تھا۔ دفتر خالی تھا۔ میں بغل کے کوریڈور میں داخل ہوا۔ مختصر سے کوریڈور کے تین چکر لگانے کے بعد ایک جگہ رُک کر مَیں نے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کچھ دیر کے بعد کھلا۔

"ہلو ——"

"ہلو ——"

آینا گلابی رنگ کے گھریلو لباس میں کھڑی تھی۔

"معاف کرنا میں ڈیوٹی پر نہیں ہوں۔" اُس نے بالوں کو جھٹک کر کہا: "کہو بیمار تو نہیں پڑے۔"

"نہیں۔ میں بالکل ٹھیک رہا ہوں۔"

"کہاں مارے مارے پھر رہے ہو۔ تمھیں پتا ہے باہر پھرنے کی اجازت نہیں ہے؟"

"تمھیں دیکھے ہوئے مہینوں ہو گئے ہیں۔"

"میں ڈیوٹی پر نہیں ہوں۔ جاؤ جا کر آرام کرو۔" وہ ہنسی۔

"میں —— اور —— رُکو۔ میں لائف بوٹ کی ڈرل میں نہیں تھا۔ اس کے لیے آیا ہوں۔"

"میں نے کہا نا کہ ڈیوٹی پر نہیں ہوں۔ پرسر سے ملو۔ خدا حافظ۔"

دروازہ آہستہ سے بند ہو گیا۔

"خدا حافظ ——" میں نے کہا۔

کچھ دیر کے بعد میں دوسرے کوریڈور میں چکر لگا رہا تھا۔ تین چار بار اُس دروازے کے سامنے سے گزرنے کے بعد میں آخر رُک گیا۔ پھر میں نے دستک دی۔

"ہلو ——" اس نے دروازہ کھولا۔ ایک نظر ڈال کر ہی میں جان گیا کہ اس عورت کا نفس شریف اور رویہ نسبتاً کم ظالمانہ ہو گا۔

"ہلو میڈم سی گل۔"

"بڑا طوفان آیا ہے۔" وہ آہستہ سے ہنسی۔

"بڑا سخت طوفان آیا ہے۔ اِی نِڈ کیسی ہے؟"

"اِی نِڈ تین روز سے بیمار ہے۔ تم سے سخت ناراض ہے کہ تم اُسے دیکھنے نہیں آئے۔ سو رہی ہے۔"

"بات یہ ہے کہ میں نے کئی بار ارادہ کیا مگر —— میری اپنی طبیعت بڑی خراب رہی ہے۔"

"اوہ، اچھا؟ بڑا رنج ہوا سُن کر۔ مگر ایسے سمندروں میں بھلا کون اللہ کا بندہ تندرست رہ سکتا ہے۔"

"درست ہے۔"

کچھ دیر تک ہم دروازے میں کھڑے باتیں کرتے رہے۔ پھر میں تنگ آ کر اس کے قریب کھسک گیا۔

"تمھارا کیبن ——" میں نے اُس کے کندھے کے اُوپر سے اندر دیکھتے ہوئے کہا: "میرے کیبن سے بڑا ہے۔"

"میرا خیال ہے سبھی کیبن ایک سائز کے ہیں۔"

"مگر یہ اور نقشے کا ہے صریحاً —— دیکھو ——"

"ڈاکٹر نے اِی نِڈ کو آرام کرنے کی تنبیہہ کی ہے۔" اس نے بڑے اخلاق بڑی مضبوطی سے کہا: "میں نہیں چاہتی کہ وہ جاگ جائے۔ خدا حافظ مسٹر فیروز۔"

"خدا حافظ ——" میں نے بند دروازے سے کہا۔

اپنے کیبن کو لوٹتے ہی میں نے سیدھا 'پورٹ ہول' کا رُخ کیا، ڈھکنے کو کھولا، ایک تیس فٹ اونچی سیاہ

مہیب لہر کو حملہ آور ہوتے ہوئے دیکھ کر جبلّی طور پر پیچھے ہٹا، پھر سہما ہوا میں لہرا کر اس پر گر جا۔
"تڑپو ——"

جس روز کہ رات کو طوفان تھما ہے میں بارہ گھنٹے تک سویا رہا ہوں۔ مجھے پتا نہیں کہ کس وقت سویر ہوئی اور گزر بھی گئی۔ گو لوپرٹ نے بعد میں مجھے بتایا کہ دو بار جب وہ جگانے کے لیے آیا تو مَیں نے اس قدر درشت اور چونکتے لہجے میں اُسے دفع ہو جانے کے لیے کہا کہ اُسے خیال ہوا کہ مَیں اپنے پورے ہوش و حواس میں بیٹھا کسی سخت خفیہ سرگرمی میں مصروف ہوں۔ اس کو شاید آج تک یہ یقین نہیں آیا ہوگا کہ مجھے اس ساری بات کی کوئی خبر نہیں۔

دوپہر کے کھانے سے ذرا پہلے جب مَیں سو کر اُٹھا تو ہشاش بشاش تھا۔ سب سے پہلا کام جو مَیں نے کیا وہ 'پورٹ ہول' کے آہنی ڈھکنے کو کھول کر دیکھنے کا تھا۔ باہر سمندر کی شوخ نیلے رنگ کی ننھی ننھی ہموار لہروں والی سطح سپاٹ تھی اور اُس پر دوپہر کی چمکدار دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے بڑے اطمینان سے، بڑی احتیاط کے ساتھ شیو کیا، ملحقہ غسل خانے میں جا کر نہایا، صاف کپڑے پہنے اور کھانے کے لیے چل دیا۔ کوریڈوروں میں، ڈیک لینڈنگ پر، سیڑھیوں پر اور ڈائننگ ہال میں رنگ و بُو اور آواز و قہقہہ کا ایک طوفان تھا جس نے یوں لگتا تھا کہ سمندر کے طوفان کی جگہ لے لی ہے۔ سمندری بیماری سے اُٹھے ہوئے زرد زرد چہرے گویا گزشتہ رات کے نیم بستہ پھول تھے جن کا سارا کہرہ صبح کی دھوپ نے اُڑا دیا تھا اور جو اب نکھرے نہائے اپنی ساری نزاکت اور رعنائی کے ساتھ کھڑے کھلکھلا کر ہنس رہے تھے۔ ڈائننگ ہال میں لوگ کھانا ختم کر کے باہر کی طرف لپک رہے تھے۔ بڈھا جوان عورت مرد۔ باہر باہر باہر۔

ایک دُنیا تھی جو عرشۂ جہاز پر اُمڈ پڑی تھی۔ ایک ہجوم تھا، ایک غلغلہ تھا، ایک شاہ گلاب کا پھول تھا جو ایک روز پیشتر نظر میں نہ جمتا تھا مگر رات کی رات میں جس نے کھِل کر صبح سویرے دیکھنے والے کو اپنے اچانک اور شدید ظہور سے اور اپنے غیر متوقع پھیلاؤ سے اور اپنے بولتے ہوئے چہچہاتے ہوئے رنگ و بُو سے حیرت زدہ کر دیا تھا، ایک رنگین پھلجھڑی تھی جس نے دھماکے کے ساتھ پھٹ کر چاروں طرف دُور دُور تک رنگ ہی رنگ بکھیر دیے تھے، اور رنگ! اور رنگ!! گہرا نیلا سمندر اور شوخ نیلا آسمان اور سفید مستول، اور سُرخ سکرٹ اور زرد بیل اور اودا اور سبز کوٹ اور قرمزی ٹوپیاں اور سیاہ جرابیں اور دودھیا جلد اور سنہرے بال اور نارنجی بال اور براؤن بال اور شہد کے رنگ کی آنکھیں اور گہرے گہرے شوخ شوخ چمکدار چندھیا دینے والے رنگ ہی رنگ تھے جن کی ایک چیخ و پکار تھی جس میں کان پڑی آواز سُنائی نہ دیتی تھی اور آنکھ ایک جگہ پر، کسی جگہ پر نہ رُکتی تھی اور دل خوشی سے اور آزادی سے اور حُسن کے احساس سے پھیلتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اس طوفان کے درمیان کھڑے کھڑے میں نے نظر اُٹھائی اور ٹھٹک کر کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ سامنے سے، ہمارے جہاز کے برابر سے ایک دوسرا جہاز گزر رہا تھا۔ بڑے سے جگمگاتے ہوئے راج ہنس کی طرح سفید براق جہاز، لمبا، نیچا، بانکا جہاز نیلے اور سبز پانی پر بڑی علیحدگی، بڑی آہستگی اور بڑے وقار کے ساتھ گردن اُٹھائے چلا جا رہا تھا۔ جہاں تک نظر جاتی تھی پانی ہی پانی تھا اور جہاں پانی ختم ہوتا تھا وہاں سے آسمان شروع ہوتا تھا اور پھر جہاں تک نظر جاتی تھی آسمان ہی آسمان تھا اور اس سارے وسیع، پُرسکوت روشن اور بے کراں خلا کے درمیان اُس اکلوتے تنہا سنگِ مرمر کے محل پر دھوپ چمک رہی تھی۔ ان آنکھوں نے دنیا کے حسین ترین قدرتی اور مصنوعی مناظر دیکھے ہیں، مگر یہ منظر حیران کن تھا۔ اس کے شدید حُسن نے مجھے عجیب طور پر بے چین کر دیا۔ اس بے چینی سے میں مانوس تھا۔

کئی لمحوں تک مسافر ڈیک پر دم بخود کھڑے گزرتے ہوئے جہاز کو دیکھتے رہے۔ پھر اچانک ایک غلغلہ بلند ہوا اور وہ دوسرے جہاز والوں کے جواب میں زور زور سے بازو ہلانے لگے۔
اب ہم پرسکون آئرش سمندروں میں تھے۔ ڈیک پر چلتے ہوئے میں نے بگلوں کو گنا۔ وہ تعداد میں چھبیس تھے اور شاید سو رہے تھے۔
"ہلو۔"
"ہلو۔"
میں کرسی پر بیٹھ گیا۔
"کیسی طبیعت ہے؟"
"بالکل ٹھیک ہوں۔ شکریہ۔ تم کیسے ہو؟"
"شکریہ۔ ای ٹنڈنسٹر نہیں آرہی۔"
"صبح پہلی بار نکلی تھی۔ اب آرام کر رہی ہے۔ ابھی تک پوری طرح صحت یاب نہیں ہوئی۔"
"افسوس ہے میں اسے مل نہ سکا۔ دراصل آج میں دوپہر تک سویا رہا۔"
"اچھا؟" وہ ہنسی۔
"میڈم سی گل۔"
"ہوں۔"
"تم نے یہ منظر دیکھا؟"
"کون سا منظر؟"
"یہ جہاز۔"
"ہاں بڑا دلکش منظر تھا۔"
"میڈم سی گل۔"
"کہو۔"
"کچھ نہیں۔" میں ہنسا: "بڑا دلکش منظر تھا۔"
ایک بگلا اڑ کر ٹولی سے پرے جا بیٹھا۔ دور پرے سرے پر آینا نے ڈیک کو پار کیا۔
"تم بہت اچھا بُن لیتی ہو۔" میں نے کہا۔
وہ ہولے سے مسکرائی۔
"میڈم سی گل۔"
"کہو۔"
"کچھ نہیں۔" میں ہنسا: "تم واقعی بڑا عمدہ بنتی ہو۔"
"میں نے بُننگ باقاعدہ اسکول میں سیکھی ہے۔"
"کینیڈا میں؟"
"نہیں جرمنی میں۔" اس نے کہا: "بہت پہلے کی بات ہے۔"

"جرمنی میں تمھارا گھر کہاں ہے ۔"

"ہیمبرگ کے قریب ہمارا گاؤں ہے ۔"

"وہاں تمھارے گھر والے رہتے ہیں؟"

"وہاں میری ماں رہتی ہے ۔"

"میڈم سی گل ۔"

"ہاں ۔"

"اِی بلڈ تو انگریزی نام ہے ۔"

اُس نے سُنی ان سُنی کر دی ۔

"میڈم سی گل ۔"

"ہوں ۔"

"تم رقص پر کیوں نہیں آتیں ۔"

اس کا چہرہ گلابی ہو گیا: "مجھے پسند نہیں ۔" اُس نے کہا ۔

دُور پرلے سرے پر آینا اوپر کے ڈیک کی سیڑھیاں اُتری اور غایب ہو گئی ۔ کچھ دیر بعد مَیں وہاں سے اُٹھ کھڑا ہوا ۔

اس کے بعد میرے متلاشی مجھے جہاز کے کونے کونے میں لیے پھرے ۔ کسی جگہ پر بیٹھ کر مَیں نے سہ پہر کی چائے پی، کسی شخص سے کوئی بات کی؛ کہاں پر، کس سے، یہ ٹھیک طرح سے یاد نہیں رہا ۔ دراصل اس شام کی کوئی بات مجھے ٹھیک سے یاد نہیں رہی سوائے اس وقت کے جس وقت کہ میں 'ڈیورن' میں داخل ہوا ہوں ۔

'ڈیورن' بار سے ملحق چھوٹا سا نیم روشن حجرہ تھا جس کی تاریک دیواروں کے ساتھ ساتھ لوہے کی میز کرسیاں اور صوفے پڑے تھے، جس میں صرف تین سازندے بیٹھتے تھے جو صرف 'جاز' کی تند اور اُداس دُھنیں بجاتے تھے؛ جہاں پر لوگ آدھی رات کے بعد سے آنے شروع ہوتے تھے اور صبح تین چار بجے تک ایک دوسرے سے بہت چمٹ کر ناچتے رہتے تھے اور صرف شراب پیتے تھے ۔ ڈنر کے بعد جب میں بڑے بال روم میں ناچنے والوں کی بھیڑ میں سے بمشکل گزر کر 'ڈیورن' میں داخل ہوا ہوں تو وہ وقت مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کیونکہ اُس وقت کونے کے ایک صوفے پر ایک لڑکا بیٹھا آینا کو بے تحاشا چوم رہا تھا اور وہ خاموش بیٹھی تھی مَیں نے آنکھیں جھپکا کر چاروں طرف دیکھا اور دوسرے کونے میں جا کر بیٹھ گیا ۔

جب میری آنکھیں تاریکی سے مانوس ہوئیں تو مَیں نے دیکھا کہ 'ڈیورن' تقریباً خالی تھی ۔ صرف ایک طرف کو دو بڈھے بیٹھے شراب پی رہے تھے اور آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے ۔ میں نے ڈرتے ڈرتے دوبارہ اس کونے میں دیکھا ۔ آینا کا گلاس بھرا ہوا اس کے سامنے رکھا تھا ۔ لڑکے کا گلاس خالی تھا اور وہ مکمل طور پر مدہوش نظر آ رہا تھا ۔ یہ وہی لڑکا تھا جس کو مَیں نے پہلے روز پاگلوں کی طرح ناچتے ہوئے اور دوسرے دن آینا کے دفتر میں اُس سے باتیں کرتے ہوئے پایا تھا ۔ اب وہ سوئی سوئی آنکھوں سے میز کو تک رہا تھا اور اُس کا ایک بازو آینا کے گلے میں پڑا تھا ۔ پھر وہ مڑا اور دوبارہ پاگلوں کی طرح آینا کو منہ پر گالوں پر ٹھوڑی پر ماتھے پر اور بالوں پر چومنے لگا ۔

چومتے چومتے اس نے دونوں بازو آینا کے گلے میں ڈال کر اُسے بھینچ لیا۔ جب تھوڑی سی کشمکش کے بعد آینا نے اسے بڑی آہستگی اور (میں نے حیرانگی سے دیکھا) بڑی بے حسی کے ساتھ اپنے سے جُدا کیا تو وہ اُس کی گود میں سر رکھ کر نڈھال ہو گیا۔ آینا نے گھبرا کر دو ایک بار مجھے دیکھا اور آنکھیں چرا لیں۔ لڑکے نے وہیں پڑے پڑے چند ایک سسکیاں لیں۔ پھر وہ اٹھا اور دوبارہ اسے چومنے لگا۔

بیس منٹ تک اسی طور تماشا کرنے کے بعد اچانک وہ اُٹھا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ آینا دونوں ہاتھ گود میں رکھے بے حس نگاہوں سے شراب کے گلاس کو گھورتی رہی۔ ایک بے وجہ، بے موقع اور لاحاصل غصّہ دھوئیں کی طرح آہستہ آہستہ میرے دماغ کو چڑھنے لگا۔ میں تاریک دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا اُس کے اوپر جا کھڑا ہوا۔ پھر میں نے اس پر جھک کر ایک مختصر سا قہقہہ لگایا۔

"مس ہمبرگر۔" میں رقص کی درخواست کے روایتی انداز میں جھکا۔

مگر یہ درخواست محض تمسخر تھا کیونکہ اُس کے جواب کا انتظار کیے بغیر میں نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا اور تقریباً کھینچتا ہوا اُسے کمرے کے وسط میں لے آیا۔

کچھ دیر تک وہ اُسی بے حسی سے ناچتی رہی۔ پھر رفتہ رفتہ اُس نے اپنے آپ پر قابو پا لیا۔ تب اس نے چونک کر اپنے آپ کو مجھ سے جدا کر لیا۔ ہم رقص کرتے رہے۔

"تم بڑا بنتی ہو۔" میں نے اُسے اپنی طرف کھینچا۔ وہ لکڑی کی مانند اکڑ گئی۔

"وہ کون تھا؟" میں نے کہا۔ اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔

میں نے کھینچا، وہ اکڑی رہی۔

"وہ کون تھا؟" میں نے کہا۔

ہماری خاموش جنگ جاری رہی۔ ٹرمپٹ بجانے والے سازندے کے گلے کی رگیں پھٹنے کے قریب تھیں۔

"نہیں نہیں۔" آخر اس نے کہا اور ہاتھ چھڑا کر کھڑی ہو گئی۔

"کیا بات ہے؟"

"میں اس طرح نہیں ناچوں گی۔"

"اچھا۔" میں ہنسا: "ٹھیک ہے۔"

"ہال میں چلو۔"

"نہیں یہاں۔"

"کبھی نہیں۔" اس نے قطعی لہجے میں کہا: "ہال میں۔"

ہم ہال میں آکر رقص کرنے لگے۔ یہاں پر کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ تین روز کی مسلسل بیکاری کے بعد آج ناچنے والے عروج پر تھے۔ کئی لوگوں نے آکر آینا کو مجھ سے چھیننا چاہا مگر میں نے بداخلاقی سے انھیں نظر انداز کر دیا۔ پہلی دُھن ختم ہوئی۔ تالیاں بجیں۔ پھر دوسری دُھن۔ تالیاں۔ پھر تیسری۔ پھر چوتھی۔ ہم مسلسل رقص کرتے رہے۔ ہماری خاموش جنگ جاری رہی۔

آخر اُس نے عاجز آکر میری طرف دیکھا: "اس سے کیا فائدہ آخر——!" اُس نے کہا۔

رقص جاری رہا۔

"میں سب جانتا ہوں۔" میں نے کہا: "کیا فرق پڑتا ہے آخر۔"

اُس نے تڑپ کر مجھے دیکھا۔ اب سازندوں نے ایک جرمن نغمے 'برلین کی گلیوں میں' کی دھن بجانی شروع کر دی تھی اور سارے جرمن جوڑے جذبات سے مست ہو کر بلند آواز میں ساتھ ساتھ گانے کے بول دہرا رہے تھے۔ میں نے آینا کی آنکھوں میں ایک عجیب سی جھلک دیکھی جس نے ایک لحظے کے لیے مجھے پریشان کر دیا۔ وہ ابھی تک خاموش تھی۔ گاتے ہوئے جرمنوں کی آواز لحظہ بہ لحظہ بلند ہوتی جا رہی تھی۔ آینا نے گانے کے لیے منہ کھولا، اس کے ہونٹ ہلے، پھر وہ دفعتاً ڈھیلی پڑ گئی اور بے جان شے کی طرح میری طرف کھنچی آئی۔ اُس کے قدم رُک گئے اور ٹانگیں جواب دینے لگیں۔ میں نے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر اُسے اُوپر کھینچا۔ اس نے دو بار آہستہ آہستہ میرے سینے پر سر مارا، پھر اُسے وہیں رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

گانے کے شور میں کسی نے ہماری طرف توجہ نہ دی۔ میرے ہاتھ پاؤں پھول چکے تھے۔ میں اسے چپ کرانے کی اوٹ پٹانگ کوششیں کرتا ہوا بمشکل تمام ہال میں سے نکال کر بار پر لے آیا۔ اُس نے اپنا گال بار کاؤنٹر کے سنگِ مرمر پر رکھ کر آنکھیں میچ لیں۔ بارمین نے دو ایک بار اُسے بلایا، پھر جرمن زبان میں کوئی بات کی جس کا بڑی دیر کے بعد آینا نے کوئی جواب دیا۔ بارمین نے جلدی سے گلاس میں وہسکی ڈال کر بڑھائی اور اس کے بالوں کو تھپتھپایا۔ وہسکی کا گلاس چند سانسوں میں خالی کرنے کے بعد اُس نے آنسو خشک کیے اور بولی:

"مجھے باہر لے چلو۔"

ڈیک تقریباً خالی پڑا ہوا تھا۔ اُس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ندامت سے، پریشانی سے، رُک رُک کر میں نے کئی بار معذرت کی۔ آخر وہ اُداسی سے مسکرائی اور ریلنگ پر جھک کر سمندر کے عمیق اندھیرے میں دیکھنے لگی۔

کچھ دیر کے بعد جب وہ بولی تو اُس کی آواز گہری اور حیرت انگیز تھی۔

"مسٹر فیروز۔" اس نے کہا: "تمھیں پتا ہے میں نے کیا کیا دیکھا ہے؟"

"نہیں۔" میں نے احمقوں کی طرح کہا۔

اُس نے شاید نہیں سُنا، کیونکہ وہ بولے گئی: "تم کو پتا ہے میں نے کیا کیا دیکھا ہے؟ ایک زمانے میں میں ایر ہوسٹس تھی۔ میں نے بیس ہزار فٹ کی بلندی سے طلوعِ سحر کا منظر دیکھا ہے۔" وہ رُکی: "اور میں نے پُرسکون سمندروں پر غروبِ آفتاب دیکھا ہے۔ اور پیرس میں مسلسل دس گھنٹے تک میں مونالزا پر نظریں جمائے کھڑی رہی ہوں، حتیٰ کہ وہ میری آنکھوں میں اُتر آئی ہے۔ اس کے بعد —— تم سمجھتے ہو کہ اس کے بعد انسان کے دل میں کسی جذبے کی خواہش رہ جاتی ہے؟"

میں نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

"وہ لڑکا مجھ سے عمر میں بارہ سال چھوٹا ہے اور اپنے گھر جا رہا ہے۔ جانتے ہو کہاں؟" وہ عجیب طریقے پر ہنسی: "کہیں بھی نہیں۔"

"کہیں بھی نہیں؟"

"وہ مشرقی جرمنی سے بھاگ کر آیا ہے اور اب وہاں نہیں جا سکتا مگر جانا چاہتا ہے اور جائے گا چاہے رستے میں مارا جائے چاہے پکڑا جائے مگر رات کے اندھیرے میں وہ سرحد کو پار کرے گا۔ کیونکہ وہاں اس کی ماں رہتی ہے اور ساری دُنیا میں وہی اس کا گھر ہے۔ تم بھی کبھی جوان رہے ہو گے مسٹر فیروز، اپنے آپ کو اُس کی جگہ رکھ کر سوچو۔ وہ بمشکل اٹھارہ برس کا ہوا ہے۔"

میں نے حلق میں سخت بدمزگی محسوس کی۔

"اور مشرقی جرمنی میں میرے باپ کا گھر تھا۔" وہ پھر بولی: "سامنے کی سیڑھیوں پر جب دھوپ پڑتی تھی تو میں وہاں بیٹھ کر اپنی بلّی سے کھیلا کرتی تھی اور کھانے کے وقت پر میری ماں اندر سے آوازیں دیا کرتی تھی اور بیک یارڈ میں میرا باپ بیٹھ کر اخبار پڑھا کرتا تھا۔ اسی بیک یارڈ میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ کھیلتے کھیلتے میرا لڑکپن گزرا ہے۔ گرمیوں کے دنوں میں جب شام پڑا کرتی تھی ——— مسٹر فیروز، زندگی میں سب کچھ دیکھ لینے کے بعد انسان کو صرف اپنے لڑکپن کا زمانہ یاد آتا ہے، اور وہ جگہیں ——— گرمیوں کے دنوں میں جب شام پڑتی تھی۔" وہ رک گئی، پھر اس نے آہستہ سے میرے بازو کو چھوا: "وہ دیکھو۔ ہماری ننھی دوست۔"

مَیں نے مڑ کر دیکھا۔ ہم سے کچھ دور اسی نڈ دیک پر بیٹھی کھیل رہی تھی۔ کُرسی پر اُس کی ماں بیٹھی پل اور بُن رہی تھی۔

"یہ وہ نسل ہے، جو بے گھر ہو چکی ہے۔" اس نے کہا۔

"مگر" مَیں نے تھوک نگلا: "ہیمبرگ کے قریب ———"

"اس کا گاؤں ہے۔" وہ لاپروائی سے بولی: "ہو گا ——— جانتے ہو یہ کیا کرتی ہے؟"

"نہیں۔"

"سٹرپ ٹیز۔"

"ایں؟" میرا مُنہ کھل گیا۔

"ہاں۔ اور اس بچّی کا باپ اس سے شادی کیے بغیر چھوڑ کر بھاگ گیا ہے۔" اس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا: "اس کا گھر کہاں ہے؟"

اس وقت مَیں نے پہچانا۔ یہ وہی جگہ تھی، جہاں پر ہم کھڑے تھے۔ یہ وہی جگہ تھی۔ مَیں نے سہم کر اندھیرے میں دیکھا۔ سمندر کی تاریک چھاتی اُٹھ رہی تھی اور بیٹھ رہی تھی، اُٹھ رہی تھی اور بیٹھ رہی تھی۔

پھر وہ آخری بار مجھ سے مخاطب ہوا:

"یہ وہ بہادر نسل ہے جس نے سب کچھ کھویا ہے مگر اپنا ذہن محفوظ رکھا ہے۔" اس نے کہا: "اور انسانی ذہانت حساب کتاب کا نہیں، انسانی ذہانت دوسرے کے دُکھ کو پہچاننے اور ہاتھ بڑھا کر اُس میں شریک ہونے کا نام ہے، اس لیے کہ تم محض شریک ہو سکتے ہو یا نہیں سکتے چاہے وہ دُکھ ہی کیوں نہ ہو، اس لیے کہ ہر وہ سانس جو تم لیتے ہو تم ضایع کرتے ہو، اُس وقت بھی جب وہ ابھی تمھارے اندر ہوتا ہے اور زندہ و سلامت و متحرک ہوتا ہے وہ ضایع ہو چکا ہوتا ہے پہلے ہی، اس لیے کہ چیزوں کی دُنیا میں ساری چیزوں کی نوعیت انسانوں کے واسطے سے اس طور واقع ہوئی ہے کہ وہ پائی نہیں جا سکتیں، کہ جب پائی جاتی ہیں تو ضایع ہو جاتی ہیں اور یہی چیزوں کا اسرار ہے۔ کہ جب آدمی پاتا ہے اور کھوتا ہے اور لیفندر رہتا ہے اور پاتا ہے اور کھوتا ہے تو پھر خود چیزوں میں شامل ہو جاتا ہے اور چیز چیز کو نہ چھو سکتی ہے نہ پا سکتی ہے نہ رسائی حاصل کر سکتی ہے کہ یہی چیزوں کی کمتری ہے۔ کہ ہر وہ سانس جو تم لیتے ہو، اس وقت بھی جب

وہ ابھی تمھارے اندر محفوظ و مستور ہوتا ہے کھو چکا ہوتا ہے اس لیے کہ کھینچا جا چکا ہوتا ہے اور پھر نہ تھم سکتا ہے نہ لوٹ سکتا ہے، صرف ہاتھ سے جا سکتا ہے اور چلا جاتا ہے؛ اس لیے کہ جب ایک بار تم چیزوں پر قابض ہو جاتے ہو تو پھر اور کچھ نہیں کر سکتے، صرف ان کو ضائع کر سکتے ہو۔ یہ ملکیت کا قانون ہے . . .

"کہ اوّلیں معصومیت کے کھو جانے کے بعد انسانی ذہانت کی سعادت صرف اُن کو نصیب ہوتی ہے جو دنیا کے حُسن کو دیکھ کر وصال کی نہیں توصیف کی سعی کرتے ہیں کہ یہی ایک راستہ اس میں شامل ہونے کا ہے۔ باقی سب تنہائی ہے . . ."

میری پرانی رفیق، بدمزگی، حلق سے نکل کر سارے بدن پر پھیلتی جا رہی تھی۔ آئینا پتا نہیں کب کی جا چکی تھی۔ مَیں بھاری قدموں سے جا کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

"ہلو ای نڈ۔" مَیں نے کہا۔

"ہم آپ سے نہیں بولتے۔"

"کیوں۔"

"تم اتنے دن مجھے دیکھنے کے لیے نہیں آئے۔"

"مَیں آیا تھا۔ تم سو رہی تھیں۔"

"ممی ممی۔ مسٹر نے روز آئے تھے؟"

"ہاں۔" میڈم سی گل نے کہا: "مَیں نے تمھیں بتایا تو تھا۔"

"کب بتایا تھا؟"

"تم بھول گئی ہو۔ مَیں نے بتایا تھا۔"

"اچھا۔" وہ خوش ہو گئی: "مسٹر نے روز، اب ہم آپ سے بولنے لگتے ہیں۔"

"ای نڈ۔"

"ہوں۔"

"آج بگلے چھبیس تھے۔"

"اچھا؟"

وہ اپنی گڑیا سے کھیلتی رہی۔

"ای نڈ۔"

"ہوں۔"

"آؤ۔" مَیں نے مری ہوئی آواز میں کہا: "باتیں کریں۔"

"اچھا۔" اُس نے کہا اور خاموشی سے کھیلتی رہی۔ تھوڑی دیر بعد وہ اُٹھ کر اپنی ماں کے پاس بھاگ گئی جو اُسے دیکھ کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر دونوں ماں بیٹی نے "شب بخیر" کہا اور نیچے چلی گئیں۔ سامنے سمندر سرد اور تاریک اور پُرسکون تھا۔ کوئی آواز بھی نہ تھی۔ اندر رقص ہو رہا تھا، سازندے ساز بجا رہے تھے، بار پر لوگ قہقہے لگا رہے تھے، نیچے جہاز کا انجن چل رہا تھا، ہر طرف بڑی خاموشی تھی ——— چوبیس گھنٹے کے اندر اندر ہم انگلستان کے ساحل پر ہوں گے۔ خاموشی کو کم کرنے کی خاطر میں نے سوچا، پھر جمائی لے کر اپنے کیبن کو لوٹ آیا۔

دُھوپ

نالے کا پُل بہت اونچائی پہ تھا۔ چڑھتے چڑھتے اس کا دم پھول گیا۔ پُل پر پہنچ کر وہ رُک گیا۔ یہ شہر کی آخری حد تھی۔ یہاں سے اب کھیت اور کھلی زمینیں شروع ہوتی تھیں۔ اس نے سُستانے کے انداز میں کمر پہ ہاتھ رکھے اور آنکھیں سکیڑ کر دُور دُور تک دوپہر کے چمکتے ہوئے رنگوں کو دیکھا۔ بہار کے موسم میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔

'یہ پھاگن ہے'، اس نے خوشی سے سوچا، اور ذہن پر زور دے کر یاد کرنے کی کوشش کی کہ بھلا پھاگن کی کون سی تاریخ تھی! تھوڑی دیر کے بعد ہار کر اس نے سوچا ——— 'بیس برس گزر گئے!' اور عمر کے گزرنے کو زبان کے نیچے سے اُبل کر نکلتے ہوئے لعاب میں محسوس کیا۔

پھر اس نے ماتھے پر سایہ کرتے ہوئے فیلٹ ہیٹ کو آنکھوں پر کھینچا اور پلٹ کر نظر ڈالی۔ پُل پر چڑھتی ہوئی سڑک پر اب اس کا سات سالہ بچہ چلا آ رہا تھا۔ چڑھائی کافی تھی اور بچہ ایک گول اور چکنے سلیٹی رنگ کے چمڑے کے فٹ بال کھیلتا ہوا دم لے لے کر چڑھ رہا تھا۔ پیچھے شہر تھا۔ شہر کے پیچھے سورج تھا۔ وسط میں اکبر بادشاہ کا قلعہ تھا جو سب سے اُونچا (اور اندر سے ویران) تھا جس کے دونوں جانب ایک کے ساتھ ایک بنے ہوئے مکانوں کی چھتوں اور دیواروں کی ٹوٹی پھوٹی سیاہ لکیر ایک خاص زاویے پر ڈھلتی تھی یوں کہ دُور سے شہر چمکدار آسمان کے مقابل ایک بہت بھاری اور سیاہ حجم والی اور بہت پھیلے ہوئے دامن والی مخروطی

پہاڑی کی طرح لگتا تھا جو جیتی جاگتی ہو۔ اس کے اوپر کہیں کہیں بہار کی چھوٹی چھوٹی بدلیاں تھیں ——— دھنکی ہوئی اور ریس کی ہوئی روئی کی گٹھی بھیٹی، نوکیلی، گول اور گھنی: تململا کر اُبل کر نکلتی ہوئی تند اور ٹھوس اور بھاری اور جامد چٹانیں ——— بہار کی بدلیوں کی اس مخصوص شکل سے وہ بچپن سے مانوس تھا۔ اس شہر میں وہ پیدا ہوا تھا۔ اس مہینے کے آسمان کے لش لش کرتے ہوئے زردی مائل نیلے رنگ سے بھی وہ ایک عمر سے واقف تھا جہاں نظر نہ ٹھہرتی تھی۔ اور گو آج صبح بیس سال کے بعد وہ اپنے شہر کو لوٹا تھا مگر اس وقت پل پر قدم رکھتے ہی اس کو اندازہ ہو گیا تھا کہ موسم بہار میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔

اب اس کا بیٹا اس کے پاس پہنچ چکا تھا اور باپ کی طرح کمر پر ہاتھ رکھے، سورج کے مقابل آنکھیں سکیڑے شہر کو دیکھ رہا تھا۔

"دم لے لو۔" اس نے بیٹے سے کہا۔

بچہ اسی گول کنکر سے فٹ بال کھیلتا ہوا پل کے دوسرے سرے پر جا کھڑا ہوا اور سورج کی طرف پشت کر کے پل سے اترتی ہوئی سڑک کو دیکھنے لگا۔

"بابا ———" دفعتاً وہ مڑ کر چلایا۔

اس نے سر سے ہیٹ اتار کر انگلی سے ماتھے کا پسینہ پونچھا، پھر کوٹ کا کالر جسے چڑھائے چڑھائے وہ شہر سے نکلا تھا نیچے کیا اور جا کر اپنے بیٹے کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔

"بابا!" بچے نے کہا: "زمین گول ہے نا؟"

"ہاں۔" اس نے کہا، اور پل سے ڈھلتی ہوئی سڑک پر نظر ڈال کر مسکرایا: "ہر چیز گول ہے بیٹے!"

"ہر چیز؟"

وہ بیٹے کے کندھے پر ہاتھ رکھے پل سے اترنے لگا۔ اب دونوں باپ بیٹے کی پشت سورج کی طرف تھی اور ان کے سائے آگے آگے سڑک سے لپٹے ہوئے چل رہے تھے۔ "چلو!" پھر اچانک اس نے نعرہ لگایا: "چلو!" اور بیٹے کو کندھے پر ٹھونک کر بھاگ کھڑا ہوا۔ بچہ آواز نکالے بغیر ہنسا اور باپ کے پیچھے پیچھے ڈھلان پر بھاگنے لگا۔ یہاں پر سڑک تقریباً سنسان تھی۔ صرف دور آگے ایک تانگہ دیہاتی سواریوں سے لدا ہوا جا رہا تھا۔ پہلے پہر کی ہوا ابھی تھمی نہ تھی اور جاڑوں کے گرے ہوئے پتے سڑک کے کنارے کنارے اڑتے جا رہے تھے۔ دوڑتے دوڑتے اس نے مکڑی کے ایک تار کو عین اپنی آنکھوں کے برابر دیکھا اور ہوا میں غوطہ لگا کر نکل گیا۔ جب ڈھلان ختم ہو گئی اور زمین ہموار آ گئی تو وہ رک گیا۔ بچہ دوڑ کی تیزی میں اس سے آ کر ٹکرایا اور اس کے بازو کے ساتھ جھول گیا۔ چند منٹ تک دونوں خاموش کھڑے ہنستے سانس برابر کرتے رہے۔ پھر اس نے بیٹے کے کندھوں کو اپنے بازوؤں کے گھیرے میں لے لیا اور سڑک چھوڑ کر کھیتوں میں قدم دھرا۔

"استرے کی دھار کبھی دیکھی ہے بیٹے؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں۔"

"کیسی ہوتی ہے بھلا؟"

"بڑی تیز ہوتی ہے۔"

"وہ بھی گول ہوتی ہے۔"

"گول ہوتی ہے؟"

"اگر اسے بہت بڑی خوردبین میں سے دیکھیں تو پتا چلتا ہے کہ اصل میں گول ہے۔"

"بہوت بڑی خوردبین میں سے؟"

وہ لفظوں کے غلط استعمال پہ دل ہی دل میں ایک ساتھ جھنجھلایا اور محظوظ ہوا: "میرا مطلب ہے کہ بہت طاقتور خورد بین میں سے۔" اس نے کہا۔

بچہ سمجھ گیا کہ اس کے ساتھ مذاق ہو رہا ہے۔ وہ بے یقینی سے ہنسا اور باپ کا بازو پکڑ کر جھول گیا۔

اب وہ ایک تنگ سی پگڈنڈی پر جا رہے تھے جس کے دونوں بازوؤں پر گیہوں کی فصل کھڑی تھی۔ گیہوں کی گہرے سبز رنگ کی فصل ابھی گھٹنوں گھٹنوں آئی تھی اور دُور دُور تک اُگی ہوئی تھی اور اس کی ہمواری اس بات کا پتا دیتی تھی کہ زمین بڑی لائق ہے اور پانی ہر بیج بوئے ڈھیلے کو وافر اور ایک سا ملا ہے۔ زردی مائل سبز رنگ کی لمبی لمبی مونچھوں والی ان گنت نازک بدن بالیاں قطار در قطار ہوا کے رُخ جھکی ہوئی تھیں اور رکوع میں گئے ہوئے عیدین کے نمازیوں کی یاد دلاتی تھیں۔

(جب بھی موسم بدلتا تھا اور سورج میں چمک پیدا ہوتی تھی اور گیہوں کی جڑوں پر زردی چڑھنے لگتی تھی یہی نرم گرم ہوائیں کہیں سے آتی تھیں اور جادو کی طرح ساری زمین پر چل جاتی تھیں ——— اس نے یاد کیا ——— اور سارے چرند پرند، پیڑ پودے حیوان اور انسان انھی زرد رنگ ہواؤں کے طلسم میں جیسے جکڑے جاتے تھے اور لہو کا سُست اُچھال اس تال پہ لہراتا تھا جو کہیں سُنائی نہ دیتی تھی، جس کی بے آواز دھمک وہ جذبہ جگاتی تھی جو صرف بدلتے ہوئے موسم کا جذبہ ہوتا ہے اور جو نہ اُداس کرتا ہے نہ مسرور، صرف نئے سرے سے پیدا کرتا ہے ——— اس نے یاد کیا ——— اور اسی موسم میں جب وہ سات برس کا تھا اور اپنی پہلی پہلی ایرگن کندھے پر رکھے پگڈنڈیوں پہ اپنے باپ کے ساتھ شکار کی تلاش میں گھوما کرتا تھا تو اس کا باپ ہاتھ بڑھا کر ایک پتّا توڑتا تھا اور اسے مُٹھا کر کے چپکے سے اس کے پاجامے میں گھُسا دیا کرتا تھا۔ اور پھر وہ جوں جوں اسے نکالنے کی کوشش کرتا وہ اُوپر ہی اوپر چڑھتا جاتا اور اس کا باپ مصنوعی تشویش کے لہجے میں کہتا: "کیا ہے بیٹے؟ ——— کیا بات ہے بیٹے؟" ——— اور ادھر اُدھر سے جھانکتا رہتا مگر بیٹے کے نکالنے میں اس کی کوئی مدد نہ کرتا بلکہ پیٹ ہی پیٹ میں ہنسے جاتا، ہنسے جاتا۔ پھر وہ تنگ آکر اپنی ایرگن کو پگڈنڈی پر رکھ دیتا اور دونوں ہاتھوں سے بیٹے کو نیچے کی طرف دھکیلتا اور وہ پاجامے کے اندر پھدک پھدک کر اوپر ہی اوپر چڑھتا جاتا یوں جیسے کوئی لمبی سی چڑیا ہو۔ اس طرح، گو بعد میں وہ بڑا ہو گیا اور اسے بیٹے کے اس عمل کا اصل پتا چل گیا، مگر ہمیشہ کے لیے اس کے ذہن کے اس حصے میں جو نامعلوم کی خبر رکھتا ہے اور شاید اصل سے زیادہ اصل ہوتا ہے بیٹے کا وہ روپ رہ گیا جو لمبی سی چڑیا یا اس کے طوطے ایسی کسی پھدکنے والی جاندار شے کا تھا۔)

اس نے ہاتھ بڑھا کر گیہوں کی ایک بالی توڑی اور اس کی مونچھوں کو اگلے دانتوں میں داب کر کنکھیوں سے پیچھے دیکھا۔ اس کا بیٹا نیکر کی جیبوں میں ہاتھ دیے تنگ پگڈنڈی پر سنبھل سنبھل کر چل رہا تھا۔

"تاریخ بھی گول ہوتی ہے۔" اس نے کہا۔

"کیسے؟"

"کہ اپنے آپ کو دوہراتی ہے۔"

"کیسے؟"

"ایسے ———" وہ بٹے کی مونچھوں کو اگلے دانتوں میں چباتے ہوئے بولا: "کہ بڑی بڑی فوجیں اٹھتی ہیں اور مُلک مُلک پر جھنڈے گاڑتی ہیں اور ایک ایک سپاہی فاتح بنتا ہے اور داستانوں میں نام پاتا ہے۔" اس نے کہا: "یہاں سے ان کا زوال شروع ہوتا ہے۔ اس لیے کہ مفتوح کمزور ہوتا ہے اور کمزوری میں بڑی قوت ہوتی ہے۔ وہ تحفے اور تصویرے سے، انعام اور اختیار کے لالچ سے اور غرور کے تحفے سے فاتح کو مار گراتا ہے۔ صرف وقت ذرا زیادہ لیتا ہے۔ ایک صرف یہی فرق پڑتا ہے اور بس، اور فاتح کو اس وقت ہوش آتا ہے جب اس کے رومانس کا خاتمہ ہو چکا ہوتا ہے۔ اس طرح تاریخ اپنے آپ کو دوہراتی ہے، اور ہر اس چیز کی طرح

جو اپنے آپ کو دوہراتی ہے گول ہوتی ہے۔" اس نے کہا: "چاند، سورج، تارے، زمین، آسمان، پیڑ پودے، لہو ـــــ"

"لہو؟" بچے نے پوچھا۔

"ہاں۔" اس نے کہا: "یہ سر کے بالوں سے پیر کے ناخنوں کو جاتا ہے اور پیر کے ناخنوں سے سر کے بالوں کو اور پھر پیر کے ناخنوں کو اور اس طرح بدن کے لامتناہی سفر میں چکر کاٹتا ہے، گول۔ گول۔ گول۔" وہ ہنسا۔

مگر اب بچہ سنجیدگی سے دلچسپی لے رہا تھا: "بابا ـــــ" اس نے پوچھا: "آدمی بھی گول ہوتے ہیں؟"

وہ حیران رہ گیا۔ منطقی طور پر اگلا سوال یہی ہو سکتا تھا۔ مگر عام لوگوں کی طرح وہ بھی اس غیر منطقی رویے کا شکار تھا جو بہت سی ہونے والی باتوں کے بارے میں انھیں خوش فہم بنائے رکھتا ہے۔ چنانچہ وہ یہ سوال سن کر حیران رہ گیا۔

"ہاں۔" اس نے کہا: "سویرے سے شام کرتے ہیں اور شام سے سویرا اور اپنی عادت کے اس چکر میں لگاتار گھومتے ہیں، لگاتار۔ چنانچہ گول ہوتے ہیں۔"

بچہ بے یقینی سے ہنسا۔

"اسی چکر کو توڑنا فن ہے۔" اس نے بات ختم کی۔

اب وہ ایک ایسے کھیت میں سے گزر رہے تھے جہاں سے گنے کی فصل ماگھ میں کاٹی جا چکی تھی۔ اس کھیت کی خشک مٹی پپڑیوں اور ڈھیلوں میں جمی ہوئی تھی۔ کمزور سفید زمین جگہ جگہ سے ترخی ہوئی اور ناہموار تھی اور گنے کی خشک جڑیں جگہ جگہ سے ابھری ہوئی تھیں اور ان میں مٹیالے رنگ کے کیڑے مکوڑے چل رہے تھے۔ گنے کی بکھری ہوئی چھال کے زرد ٹکڑے نیم گرم بگولوں میں ہلکا ہلکا شور کرتے ہوئے اڑ رہے تھے۔ بھوسلی چڑیوں کی ایک ڈار ان کے سروں سے شاں کر کے گزری۔

"اس کھیت میں اب تک ہل چل جانا چاہیے تھا۔" اس نے کہا۔

"پھر کیوں نہیں چلا؟" بچے نے پوچھا۔

"گنے کی جڑیں دوبارہ پھوٹ پڑتی ہیں۔" اس نے کہا: "پر فصل آدھی بھی نہیں اترتی۔ کام سے جی چرانے والے کسان اسی پر قناعت کر لیتے ہیں۔"

"بابا!" بچے نے کہا: "کسان تو کام سے جی نہیں چراتے۔"

"کسان بھی عام آدمیوں کی طرح آدمی ہوتے ہیں بیٹے۔" اس نے کہا: "چنانچہ گول ہوتے ہیں۔" بچہ بے یقینی سے ہنسا اور پگڈنڈی پر بھاگتا ہوا آگے نکل گیا۔ آگے ایک سہاگہ پھیر کر تیار کیا ہوا کھیت تھا۔ اس نے بچے کو دوڑ کے زور میں چند قدم کھیت کے اندر جاتے اور اس کے پاؤں کو جوتوں سمیت نرم زمین میں اترتے ہوئے دیکھا۔ اسے یاد آیا کہ بچپن میں اسے بھی سہاگہ پھرے ہموار کھیت میں ننگے پاؤں بھاگنا (جب پاؤں ٹخنوں سے اوپر اوپر تک روئی کی سی نرم اور بھربھری مٹی میں ہوا کی طرح دھنس جاتے تھے اور اندر تلووں کو کھیت کی دبی ہوئی نمی کی مخصوص ٹھنڈک اور حدت بیک وقت جادو کی طرح چڑھتی تھی) بڑا اچھا لگتا تھا۔ اس نے پگڈنڈی پر رک کر آنکھیں سکیڑ کر کھیت کی جھپاتی ہوئی سیدھی سطح پر نظر ڈالی اور اس کی طاقت ور سیاہ، سیراب مٹی کی قدیم، مانوس بو کو سونگھا اور اس کے نتھنے پھڑکنے لگے۔

"اس کھیت کا کسان محنتی ہے۔" اس نے کہا۔

"بابا!" بچے نے شرارت سے پوچھا: "گول بھی ہے؟"

"ٹھہرو ـــــ" اس نے نعرہ لگایا اور بیٹے کے پیچھے دوڑ پڑا۔

تنگ پگڈنڈیوں پر آگے پیچھے دوڑتے اور ہنستے ہوئے وہ کئی کھیتوں میں سے گزرے۔ اس کا بیٹا اس سے کہیں ہلکا اور پاؤں کا پکا تھا۔ وہ خرگوش کی سی پھرتی اور آسانی سے اس کے آگے آگے بھاگ رہا تھا جب کہ خود اس کا پاؤں کئی بار پگڈنڈی سے پھسل

کر ادھر ادھر گیلے اور خشک کھیتوں میں مڑ چکا تھا اور کیچڑ اور مٹی سے لتھڑ گیا تھا۔ جب ایک پگڈنڈی ختم ہو جاتی اور دوسری اسے زاویۂ قائمہ پر کاٹتی ہوئی ملتی تو بچہ رک جاتا اور ایک لحظے تک فیصلہ نہ کر سکتا کہ دائیں کو مڑے یا بائیں کو۔ پھر وہ مڑ کر دیکھتا اور اپنے باپ کو تیزی سے بڑھتے ہوئے پا کر اندھا دھند ایک طرف کو مڑ جاتا اور بھاگنے لگتا۔ مگر اسی ایک لحظے میں اس کا باپ درمیانی فاصلے کو چند قدم کم کرنے میں کامیاب ہو جاتا۔

اب وہ ایک نسبتاً چوڑی اور سیدھی پگڈنڈی پر ایک دوسرے کا پیچھا کر رہے تھے۔ اس پگڈنڈی کے دونوں جانب گیہوں کی فصل کھڑی تھی جسے شاید آخری پانی لگایا جا رہا تھا۔ ان کے قدموں کی دھمک سے ڈر کر دو خرگوش اور ایک جنگلی بلا ایک طرف سے نمودار ہوئے اور ان کے رستے کو پھلانگ کر دوسری طرف فصل میں غائب ہو گئے۔ ایک کھیت سے ننھی خاکستری چڑیوں کی ڈار اڑی اور فصل کے اوپر اوپر تیرنے لگی۔ ایک طرف کی بالیوں میں چلتی ہوئی ہوا اس کے جسم کو چھوتی، بال اڑاتی، اس کا لہو اچھالتی ہوئی دوسری طرف کی بالیوں میں گم ہوتی جا رہی تھی۔ وہ اپنے بیٹے سے صرف ایک قدم پیچھے تھا اور ہاتھ پھیلا کر تیزی سے قریب ہوتا اور بچے کے نرم اور گرم اور تڑپتے پھسلتے پیارے بدن کو قابو میں کرنے کے لیے بیتاب ہوا جا رہا تھا کہ دفعتاً پگڈنڈی ختم ہو گئی۔ آگے ایک کنواں تھا۔ وہ ٹھٹک کر رک گیا۔

اسی پگڈنڈی پر اسی موسم میں وہ سات سال کا تھا —— اس نے یاد کیا —— اور اپنے باپ کے آگے آگے دوڑ رہا تھا کہ پگڈنڈی ختم ہو گئی تھی اور وہ کنوئیں کے پانی کی نالی پھلانگ کر آگے نکل گیا تھا اور اس کا باپ کہ ہر قسم کی پھلانگ لگانے سے گھبراتا تھا وہیں رک گیا تھا اور مڑ کر ہوا میں جھوٹ موٹ غور سے دیکھنے لگا تھا جیسے اس کی کوئی بیش قیمت چیز پیچھے رہ گئی ہو۔ یہی زمین تھی اور یہی فصل تھی اور یہی پانی اور بالیوں میں سرسراتی ہوئی تازہ نیم جوشش ہوا تھی اور خاکستری رنگ کی ننھی ننھی چڑیوں کی ڈار فصلوں کے اوپر اوپر تیرتی تھی اور باپ اور بیٹا تعاقب میں تھے —— اس نے یاد کیا —— باپ اور بیٹا اور زمین اور باپ اور بیٹا! واقعات کیسے اپنے چکر کو پورا کرتے تھے اور کیسے اختصار اور ضابطے اور نوناسنس کے ساتھ جیسے گھڑی کی سوئیاں! وہ حیران رہ گیا۔

پھر وہ گھٹنا ٹیک کر زمین پر بیٹھ گیا اور بہتے ہوئے شفاف پانی میں ہاتھ ڈال کر ہاتھ کو دیکھا اور انگلیوں کی پوروں پر اس ٹھنڈک اور حدت کو بیک وقت محسوس کیا جو گہری مٹی اور بہتے ہوئے پانی اور انسانی بدن کی پراسرار خاصیت ہوتی ہے اور جو اس وقت سے تھی جب وہ سات برس کا تھا، اور اس نے گیلی خنک مٹی اور ادھ پکی فصل کی بے نام خوشبو کو سونگھا جو وہیں کی وہیں قائم تھی —— اب بھی جب وہ پینتیس برس کا ہو چکا تھا، اور اس پر زندگی کے اس خوفناک منشی اور لامقام جادو کے چکر کا انکشاف ہوا اور اس نے سوچا: صرف پانی لہو میں بدل جاتا ہے اور زمین کے رستے نسل سے نسل کو منتقل ہوتا ہے اور ساتھ ساتھ سرگرداں رہتا ہے، باپ سے بیٹے کو، باپ سے بیٹے کو!

پانی میں تیرتے ہوئے سفید لمبی لمبی پتلی انگلیوں والے ہاتھ کو دیکھ کر اسے یاد آیا کہ اس کنوئیں کی پشت پر جہاں سے یہ پگڈنڈی دوبارہ شروع ہوتی تھی، ایک نجومی بیٹھا کرتا تھا جس کے آگے ایک میلا سا کپڑا پھیلا ہوتا تھا جس پر عجیب و غریب قسم کے سکے اور پیتل کے چھوٹے چھوٹے نمبروں والے مکعب بکھرے رہتے تھے۔ اس نے پانی سے ہاتھ نکال کر چہرے پہ پھیرا اور پھر بالوں سے پونچھ کر خشک کیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ کنواں ریں ریں کی مدھم، یکساں، خواب آلود آواز نکالتا ہوا چل رہا تھا اور اس کا بیٹا اچک کر گادھی پر سوار ہو بیٹھا تھا اور ایک کھوپے چڑھے بیل کی دم پکڑ کر کھینچ رہا تھا۔ دائیں طرف جامن اور شہتوت کے پیڑوں کا جھنڈ تھا جس میں کاشتکار کا کچا مکان تھا۔ کاشتکار اپنے مکان کے سامنے بیٹھا ٹوکے سے چارہ کتر رہا تھا۔ مکان کی دیوار کے ساتھ کھولی پر بھینس بندھی تھی جس کی پشت پر ایک کوا بیٹھا چونچ مار رہا تھا۔ اس سایہ دار، خاموش اور پرامن منظر کو آنکھوں میں اتار کر اس نے ایک لمبا چکر کاٹا اور ڈیرے کی پشت پر جا نکلا۔ جو تنشی کی جگہ خالی تھی۔

اس کے پیچھے کنوئیں کے چلنے اور پانی کے بہنے اور کسان کے ٹوکے کی آواز تھی اور گہری سایہ دار جگہوں میں گرے ہوئے پرانے

پتوں کی تیز بو تھی اور سامنے چلچلاتے ہوئے رنگ تھے اور گیہوں کی لاکھوں جھومتی ہوئی بالیوں کی سرسراہٹ تھی۔ ساری جگہوں میں سے جوتشی نے صرف اسی جگہ کا انتخاب کیوں کیا تھا؟ اس نے سوچا۔ حالانکہ یہاں سے صرف پیدل دہقان گزرا کرتے تھے اور اس نے کبھی کسی دہقان کو جوتشی کے پاس بیٹھے ہوئے نہ دیکھا تھا۔ یہ ایک ایسی ہی پُراسرار بات تھی جیسی بچپن کی ساری سرزمین ہوتی ہے، اس نے سوچا، اور جوتشی جب تک وہاں رہا تھا ہمیشہ بڑے اطمینان اور فراغت سے وہاں بیٹھا ہوا ملتا رہا تھا۔ اس کے پاس پرانی سی سیاہ صندوقچی پڑی رہتی تھی جس پر چند بوسیدہ کتابیں اوپر نیچے رکھی ہوتی تھیں جن کے ساتھ ایک چوکور گتا کھڑا ہوتا تھا جس پر انسانی ہاتھ کی شکل بنی ہوئی تھی اور ہتھیلی پہ چند لکیریں کھنچی تھیں اور نیچے بڑے بڑے لفظوں میں لکھا تھا: جوتش۔ رمل۔ نجوم۔ ابجد۔

"ابجد؟" ایک روز اس نے اپنے باپ سے پوچھا تھا: "یہ کیا ہوتا ہے بابا!" اور اس کا باپ کہ اور ساری باتوں کے علاوہ ابجد کا بھی علم رکھتا تھا (اس کے باپ کی بڑی بڑی ڈھلکی ہوئی شفیق مونچھیں تھیں اور وہ دُنیا کے سارے علموں کا ماہر تھا) بولا تھا: "اسموں کا علم ہوتا ہے بیٹے۔"

"اسموں کا؟" اس نے پوچھا تھا۔

"ہاں۔" اس کے باپ نے کہا تھا: "ناموں کا۔"

"ناموں کا کیسے بابا؟"

"ہر شخص کے نام کا اثر اس کی ساری زندگی پہ پڑتا ہے بیٹے۔ اسے ابجد کہتے ہیں۔"

"نام کا اثر کیسے پڑتا ہے بابا؟" اس نے پوچھا تھا، اور اس کا باپ آرام سے پگڈنڈی پر بندوق کو گود میں رکھ کر بیٹھ گیا تھا اور اسے پاس بٹھا کر بولا تھا:

"یہ لفظوں کا علم ہے بیٹے۔ اور لفظ میں بڑا جادو ہوتا ہے۔"

"جادو ہوتا ہے؟"

"ہاں۔"

"کیسے؟"

"ایسے ــــــ" اس کا باپ ایک بالی توڑ کر اسے دانتوں میں چباتے ہوئے بولا تھا: "کہ جیسے تمھارا نام ہے جسے سویرے سے شام تک میں اور تمھاری ماں اور بہن اور سکول میں تمھارے استاد اور ہم جماعت ان گنت بار پکارتے ہیں اور تم اس نام پر بولتے ہو مگر نام اسی پر ختم نہیں ہو جاتا۔ نام جتنی بار بھی پکارا جاتا ہے اس کا ایک لفظ بنتا ہے اور منہ سے نکل کر ہوا میں جاتا ہے کہ اس کی ایک شکل ہوتی ہے، اور ہم سمجھتے ہیں کہ ضایع ہو گیا مگر کبھی ضایع نہیں ہوتا کیونکہ لفظ زندہ ہوتا ہے اور اس کا رشتہ تمھارے ستارے سے ہوتا ہے، اور ہر بار جو پکارا جاتا ہے تو آواز کی رفتار سے اُڑتا ہے اور آٹومیٹک (بابا کو یہ لفظ استعمال کرنے کا بہت شوق تھا۔ وہ دل میں ہنسا) سیدھا تمھارے ستارے تک پہنچتا ہے اور اُس سے جا ٹکراتا ہے، ہر بار، اور یوں تمھاری زندگی پہ اثر انداز ہوتا ہے۔"

"ستارہ کیا ہوتا ہے بابا؟"

"ہر شخص کا ایک ستارہ ہوتا ہے جس کے زیرِ اثر وہ پیدا ہوتا ہے اور زندہ رہتا ہے اور مرتا بھی ہے۔"

دونوں اُٹھ کر پھر آگے پیچھے پگڈنڈی پر چل پڑے تھے، اور جب کچھ دیر بعد اور باتیں کرتے ہوئے، اس کے باپ نے کہا تھا: "اب دو چار برس میں تمھیں نپولین کی سوانح عمری پڑھ لینی چاہیے۔" تو اسے وہ پھیکے سُرخ رنگ کی جلد والی، خستہ بھورے کاغذ اور باریک سہ کالمی لکھائی کے صفحوں والی موٹی سی کتاب یاد آ گئی تھی جو ہر وقت اس کے باپ کی کرسی کے پاس تپائی پر پڑی رہتی تھی اور

جسے اس کا باپ موقع بموقع اُٹھا کر پڑھتا اور حاشیوں پر کچھ لکھتا رہتا تھا اور جس سے پُرانے کاغذ کی مخصوص تیز بُو آیا کرتی تھی۔ اس کو وہ کتاب جس سے وہ ایسے ہی مانوس تھا جیسے اپنے جوتے یا اپنے بستر سے، یاد آگئی تھی۔ اس نے بے سوچے سمجھے کہہ دیا تھا: "بابا! میں بھی بڑا ہو کر کتابیں لکھوں گا۔" اور اس کا اتنا کہنا تھا کہ اس کے باپ نے آنکھیں پھیلا کر، تقریباً اُداسی سے اس کی طرف دیکھا تھا اور پھر پگڈنڈی پر بندوق کو گود میں رکھ کر بیٹھ گیا تھا اور اس کو پاس بٹھا کر بولا تھا:

"لفظ میں بڑا جادو ہوتا ہے بیٹے۔" اس نے کہا تھا: "مگر لفظ لکھنا بڑا مشکل کام ہے۔"

"مشکل کیسے ہے بابا؟" اس نے پوچھا تھا۔

"ایسے ——" اس کا باپ آنکھیں سکیڑ کر آسمان پر دیکھتا ہوا بولا تھا: "کہ جیسے یہ بادل۔"

"بادل؟"

"ہاں۔" اس کے باپ نے کہا تھا: "یہ بدلیاں دیکھ رہے ہو؟ پچھلے ایک گھنٹے سے کیسی دُھلی دھلائی دھنکی ہوئی اور ریشم کی ہوئی رُوئی کی ٹھوس چٹانوں کی طرح آسمان میں سر اُٹھائے کھڑی ہیں اور نہ ہلتی ہیں نہ جلتی ہیں نہ شکل بدلتی ہیں۔ دیکھا تم نے؟"

"ہاں بابا۔"

"دیکھا تم نے کہ ان کی ایک ایک نوک اور ایک ایک قوس اور ایک ایک لکیر جیسے پتھر سے کاٹ کر بنائی گئی ہے؟"

"ہاں بابا۔"

"اور اپنے اختصار اور اپنی خاموشی کے باوجود ان میں اتنی تندی اور اتنا تشدد اور اتنی زندگی اور قوت ہے کہ دل پر نقش ہو جاتی ہیں اور ایک بار دیکھ لو تو سارا سال نہیں بھولتیں؟" اس کی آنکھیں یکبارگی چمک اُٹھی تھیں: "دیکھا تم نے؟"

"ہاں بابا۔"

"مگر ——" اس کی آنکھوں کی چمک یکبارگی غائب ہو گئی تھی اور وہ ایک بالی توڑ کر اداسی سے اُسے سونگھتے ہوئے بولا تھا: "یہ بدلیاں صرف بہار کے بہار آتی ہیں، چند روز کے لیے بس۔ پھر سارا سال وہی میلے میلے مٹیالے، غیر معین اور غیر واضح اور مکڑی کے جالے کے سے بدرنگ بادلوں کا چکر چلتا ہے جو آتے ہیں اور گرجتے ہیں اور دھوپ۔" وہ بالی کھیت میں پھینک کر اُٹھ کھڑا ہوا تھا: "اور دھوپ کے آنکھوں میں کھب جانے والے رنگوں کو ختم کر دیتے ہیں۔"

وہ پھر پگڈنڈی پر آگے پیچھے چلنے لگے تھے اور اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تھا کہ اس کا باپ کیا کہہ رہا ہے۔ مگر اس نے اس کی پروا بھی نہ کی تھی اور بھلا دیا تھا اس لیے کہ کتابیں لکھنے کی بات اس نے بے سوچے سمجھے، بالکل سرسری طور پر کی تھی اور اصل میں اس کا مطلب یہ نہ تھا۔ مگر بعد میں —— بہت بعد میں —— جب وہ واقعی بڑا ہو گیا اور اس نے کتابیں لکھنے کے لیے قلم اُٹھایا تو اپنے باپ کی کہی ہوئی بات اپنے سارے معنی کے ساتھ بڑے واضح طور پر اس کے سامنے آگئی۔ اس لیے کہ جب کبھی وہ کسی خیال کے جادو کو محسوس کر کے چونک کر اُٹھتا اور قلم اُٹھا کر کاغذ پر جھکتا تو خیال کو لفظ میں منتقل کرتے کرتے اس کا سارا جادو غائب ہو گیا اور اس نے اپنے آگے کاغذ پر پڑے مکوڑوں کی طرح پھیلے ہوئے بے جان، بے اثر لفظوں کو بدمزگی سے دیکھا اور سکتے میں آگیا۔ اور پھر اس نے سر اُٹھا کر بہار کی ان بدلیوں کو تلاش کیا جن کے آنے میں ابھی دیر تھی۔ اور ہمیشہ اس نے حیران ہو کر سوچا کہ اس کا باپ جس نے کبھی ایک کتاب بھی نہ لکھی تھی کیسے ان سب باتوں کا علم رکھتا تھا!

وہ بدلیاں کبھی نہ آئی تھیں۔ وہ لفظ کبھی اس کو نہ ملا جس کی تلاش میں وہ تھا —— وہ کاٹا چھانٹا ہوا، دُھلا دھلایا ہوا، صاف ستھرا، مختصر اور تند اور توی، ٹھوس دھات کا گھڑا ہوا لفظ جس پہ نظر ڈالو تو سانس لے اور زبان پہ لاؤ تو جی اُٹھے اور دل کی طرح دھڑکے۔ وہ لفظ صرف اس کے خیال میں جادو جگا رہا تھا۔ اس کے دل میں یہ علم رہا تھا کہ لفظ میں بڑا جادو ہوتا ہے،

مگر اس بات کا اسے پتا چلا تھا کہ لفظ لکھنا بڑا کٹھن کام ہے۔ اس نے ہزاروں کیڑے مکوڑے پھیلائے اور مشہور بھی ہوا مگر دوسرے بڑے بڑے اور مشہور کتابیں لکھنے والوں کی طرح ہمیشہ ناکام رہا تھا۔

"بابا" اس کا بیٹا اس کی ٹانگوں کے گرد بازو لپیٹ کر کھڑا ہو گیا: "کیا کر رہے ہیں؟"

"سوچ رہا ہوں بیٹے۔"

"کیا سوچ رہے ہیں بابا؟"

"کیا سوچ رہا ہوں؟" اس نے آنکھیں سکیڑ کر فصل کے اوپر اوپر دیکھتے ہوئے ذہن پر زور ڈالا: "کچھ نہیں۔"

"کچھ نہیں؟" بچے نے دہرایا۔

وہ زمین پر بیٹھ گیا: "بیٹھ جاؤ بیٹے۔" اس نے کہا۔ پھر اس نے ایک ٹوٹی ہوئی خشک ٹہنی اٹھا کر اس سے سہاگہ پھرے ہوئے کھیت کی سطح پر ایک گول دائرہ کھینچا: "میں تمھیں ایک مثال دیتا ہوں۔" اس نے کہا: "یہ دائرہ آدمی کا بنیادی رویہ ہے۔ اور اسی دائرے میں آدمی کی ساری سوچ بند ہے۔ اس دائرے سے باہر نامعلوم کی دنیا ہے، اندھیرا ہے۔" پھر اس نے دائرے کے محیط پر قریب قریب دو نشان لگائے: "ان نشانوں کے درمیان یہ مختصر سا علاقہ بھلائی کا علاقہ ہے۔ یہاں سے پھر" اس نے دائیں طرف محیط کے ساتھ ساتھ لکڑی گھمائی: "ظلم شروع ہوتا ہے۔ اور یہاں سے" اس نے بائیں طرف لکڑی گھمائی: "منفی اچھائی شروع ہوتی ہے۔ ان تینوں علاقوں کی آپس کی حدیں بڑی باریک اور تقریباً بے معلوم ہوتی ہیں، اتنی کہ یہاں سے دیکھنے پر سب آپس میں گڈمڈ ہوتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ مگر ان میں ایک چیز مشترک ہوتی ہے: آدمی کا بنیادی رویہ۔ بھلائی ہو، برائی ہو یا ظلم ہو، آدمی کا بنیادی رویہ جاری رہتا ہی رہتا ہے۔ چنانچہ ہم سوچتے بھی ہیں تو کچھ نہیں سوچتے۔"

"کچھ بھی نہیں؟" بچے نے دہرایا۔

"ہاں۔ جب تک آدمی کا بنیادی رویہ بدل نہیں پاتا تب تک یہ دائرہ نہیں ٹوٹتا اور تب تک اس سے باہر کے نامعلوم علاقے میں ہماری رسائی نہیں ہوتی جو بہت بڑا علاقہ ہے اور اس دائرے کی جس کے سامنے کوئی حقیقت نہیں اور جہاں زندگی کی اصل نسل باتوں کا علم رہتا ہے۔ سمجھے؟"

بچہ بے یقینی سے ہنسا۔

وہ ٹوٹی ہوئی ٹہنی پھینک کر اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر اس نے بیٹے کی گردن میں بازو ڈالا اور وہ واپس شہر کو مڑے۔ اسے پتا تھا کہ بچے کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا مگر وہ یہ سوچ کر طمانیت سے دل میں مسکرایا کہ عمر میں کبھی نہ کبھی وہ ضرور، کہیں نہ کہیں، ان باتوں کے روبرو آ کھڑا ہوگا اور سمجھ جائے گا اور پھر وہ اپنے باپ کو یاد کرے گا۔

واپسی پر اب وہ دوسرے راستے پر، دوسری پگڈنڈیوں پر چل رہے تھے جو بہر حال سڑک پر اُسی جگہ جا کر نکلتی تھیں جہاں سے انھوں نے کھیتوں میں قدم رکھا تھا۔ بچہ اب اس کے بازو کے حلقے سے نکل کر دوڑتا ہوا بہار کے خود رو پھول توڑ توڑ کر جمع کر رہا تھا۔ پگڈنڈی کے دونوں کناروں پر السی کے شوخ سُرخ رنگ کے ننھے ننھے نازک پھول ہزاروں کی تعداد میں اُگے ہوئے تھے جن پر نظر نہ ٹھہرتی تھی۔ بیچ میں لالہ کے کئی بڑے بڑے سُرخ پھول تھے جن میں کہیں کہیں بنفشی پھولوں کے چھینٹے بھی تھے۔ ایک جگہ جنگلی گلاب کا پودا تھا جس کا پھول توڑتے توڑتے کانٹا اس کے بیٹے کی اُنگلی میں چبھ گیا اور وہ ہلکی سی چیخ مار کر انگلی کو اس جگہ سے چوسنے لگا جہاں پر خون کا ننھا سا قطرہ اُبھر آیا تھا جس میں سورج چمک رہا تھا۔ اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر بچے کی انگلی کو دیکھا اور اسے خون چوس جانے کی ہدایت کر کے احتیاط سے گلاب کا پھول توڑا اور بچے کو دیا جو اس نے لے کر اپنے گلدستے میں لگا لیا اور انگلی چوستے ہوئے آگے آگے چلنے لگا۔ اس نے اپنے داہنے ہاتھ کی اُنگلیاں ناک تک لے جا کر انھیں سونگھا، اس

گلاب میں خوشبو نہیں تھی، جو دوسرے گلاب میں ہوتی ہے، اس نے سوچا۔ اسے اپنا باپ یاد آیا جو جب تک زندہ رہا اپنے شکار کے مہنگے شوق میں پیسے اُڑانے اور کوئی کام کاج نہ کرنے کی بنا پر کنبے بھر میں اچھی نظر سے نہ دیکھا جاتا رہا جس کی غیر ذمہ داری اور نکھٹوپن کی شکایتیں اس نے اپنی ماں تک سے سُنیں، جس کو عمر بھر صرف بھرپور طور پر زندگی گزارنے اور اس کے فلسفے پر غور کرنے کا شوق رہا، جس نے وہی کیا جو چاہا اور جو درست خیال کیا اور جو شاید تھا بھی عین درست ہی آخر کار ——— اس نے جنگلی گلاب کے پودے کے پاس کھڑے کھڑے دُور آگے پگڈنڈی پر اپنے بیٹے کو دوڑ دوڑ کر خود رو پھول جمع کرتے ہوئے دیکھا اور اس نے سوچا: بیٹوں کو باپ کے شکرانے کے لیے اس کی دولت اور عزت اور اس کے رتبے اور شاید اس کے کارناموں کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ ان کو صرف اس خوشبو کی ضرورت ہوتی ہے جو صرف ایک بار سچے گلاب کو چھونے سے ہاتھوں میں لگی رہ جاتی ہے اور جس کا آدمی کو پتا بھی نہیں چلتا۔ مگر بعد میں جب انجانے طور پر ہاتھ کہیں سانس کے سامنے سے گزرتا ہے تو خوشبو کا احساس ہوتا ہے اور آدمی چونک کر سارے بدن پر اسے تلاش کرتا ہے اور پوروں تک پہنچ جاتا ہے اور انھیں سانس پر رکھ کر سونگھتا ہے اور اسے یاد آتا ہے کہ اس کے ماضی میں کہیں ایک گلاب کا پھول بھی تھا، اور وہ خدا کا شکر ادا کرتا ہے۔

بچہ اس کو پیچھے پگڈنڈی پر رُکے دیکھ کر ٹھہر گیا: "بابا!" اس نے آواز دی۔ وہ غیر ارادی طور پر داہنے ہاتھ کی اُنگلیوں کو ناک کے قریب لے گیا۔

"بابا" اس کے قریب آنے پر بچے نے پوچھا: "وہاں کیا کر رہے تھے؟"

"سوچ رہا تھا بیٹے۔"

"کیا سوچ رہے تھے؟" بچے نے شرارت سے سوال کیا اور بھاگ اُٹھا۔

دوڑ شروع کرنے سے پہلے اس نے حلق سے خوشی کی گہری گونج دار آواز پیدا کی جو کچھ کچھ بیل کے ڈکرانے سے مشابہ تھی ابھی تیز، ابھی ہولے دوڑتے ہوئے انھوں نے کئی کھیت پار کیے۔ اس رستے پر گیہوں اور چنے کے کھیت تھے اور ایک کھیت میں چند بچے کچے سبز چنوں کو آگ لگا کر، ان کی ہولیں بنا رہے تھے۔ کھیت کے کنارے کنارے بھاگتے ہوئے اسے ہولیں بنانے کی گرم گرم رس دار خوشبو آئی اور اس نے چند لمحے رُک کر خوشی اور اُداسی کے ملے جلے احساس کے ساتھ چنے کے جلتے ہوئے پودوں کو اور اُٹھتے ہوئے دھوئیں کو اور اس کے چاروں طرف گھیرا ڈالے، گھٹنوں پر ہاتھ رکھے پاؤں کے بل بیٹھے ہوئے مشتاق چہروں والے بچوں کو دیکھا۔ اس کا بیٹا بھی رُک کر کمر پر ہاتھ رکھے انھیں دیکھ رہا تھا۔ وہ پھر دوڑ پڑا۔ آگے خود رو پھولوں کی بہت سی کیاریاں اور کئی خالی اور تیار کھیت آئے اور بہار کی اٹھتی ہوئی ہوائیں ان کے چہروں کو چھوتی ہوئی گزرتی رہیں۔ آخر وہ کھیتوں کو چھوڑ کر سڑک پر آ نکلے اور پاس پاس کھڑے ہو کر ہانپنے اور ہنسنے لگے۔ اس کے بیٹے نے کس کر دو تین مکے اس کی رانوں پر لگائے اور اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ اب سورج ڈھل رہا تھا۔ سڑک تقریباً خالی تھی اور دھوپ میں گرم ہو کر چمک رہی تھی۔ صرف چند کسان اپنی عورتوں کے ہمراہ شہر سے خریداری کر کے لوٹ رہے تھے۔ مرد لاٹھیاں کندھوں پہ رکھے اور ان سے گٹھڑیاں لٹکائے اور عورتیں مٹی کی ہانڈیاں ایک کے اوپر ایک سروں پہ رکھے جوتیاں ہاتھوں میں پکڑے۔ سڑک کے کنارے کنارے پل کی ڈھلان اُتر رہی تھیں۔ اس نے اپنے بیٹے کی گردن میں بازو ڈالا اور آہستہ آہستہ چڑھائی چڑھنے لگا۔ پل پر پہنچ کر وہ رُک گیا۔ سامنے اس کا شہر تھا جس پہ اب سُورج چمک رہا تھا۔ اس نے سُستانے کے انداز میں کمر پر ہاتھ رکھے اور مُڑ کر آخری بار دور دور تک سہ پہر کے چمکتے ہوئے رنگوں کو دیکھا۔ گیہوں اور چنے کا سبزہ اور السی کے پھولوں کا لالہ اور بے بو خود رَو پھولوں کا زردہ اور ہل چلی ہوئی زمین کی بادامگی اور پھل دار درختوں کی سیاہی اور اُوپر آسمان کا نیلم اور بہار کی بدلیوں کا براق ——— ایک ایک کر کے اور پھر سب کے سب ایک ساتھ اس کی آنکھوں میں کھب گئے اور اس نے ایک طویل لمحے تک اس دھڑ دھڑ دھڑکتی سانس لیتی ہوئی عجیب و غریب سرزمین کو دیکھا اور اسے اس شخص کا خیال آیا جسے ایک دفعہ اس نے دیکھا تھا۔ اس شخص کے چہرے پہ رنگ اور آنکھوں میں بے پناہ چمک عود کر آئی تھی اور وہ آخری دموں پہ تھا اور بڑا صحت مند اور

خوبصورت دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے ہاتھ سے آنکھیں ڈھانپ لیں اور کئی لمحوں تک کھڑا اس منظر کو دل میں جذب کرتا رہا، پھر پلٹ کر پل کو پار کرنے لگا۔

آج صبح سویرے وہ اس شہر میں موسمی پرندے کی مانند وارد ہوا تھا۔ علی الصبح جب بازار اور گلیاں ابھی خالی تھیں اور صرف فجر کی نماز سے لوٹنے یا صبح کی سیر کو جانے والے اکا دکا لوگ خاموشی سے کیکر کی داتن چباتے ہوئے آ جا رہے تھے اور ابھی دن کا اُجالا ابھی نہیں پھیلا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کا ہاتھ پکڑے اور اپنا سوٹ کیس اُٹھائے اجنبیوں کی طرح ادھر اُدھر دیکھتا ہوا اپنے گھر کے دروازے پر آ کھڑا ہوا تھا۔ میونسپلٹی کے بھنگی (ازلی طور پر جھکے جھکے) بازاروں میں جھاڑو دے رہے تھے اور گلیوں کی نالیاں صاف کر رہے تھے۔ ایک گوالا دودھ کے بڑے بڑے کمنڈل دونوں ہاتھوں میں لٹکائے، ان کے بوجھ سے جھومتا ہوا تیز تیز چلا جا رہا تھا۔ ایک فقیر بلند خوابیدہ آواز میں بھیک مانگتا پھر رہا تھا۔ اس نے سوٹ کیس آہستہ سے گھر کے دروازے کے آگے اینٹوں کے تھڑے پر رکھ دیا اور رُک کر ان پرانی، مانوس آوازوں کو سننے لگا۔ بیس برس گزر گئے تھے مگر دن کی یہ ساری اوّلیں آوازیں وہی تھیں جن کو وہ اپنے لڑکپن میں فجر کے وقت (اپنے بستر میں کسمساتا ہوا) سُن کر جاگا کرتا تھا، یا جاگ کر سُنا کرتا تھا۔ دروازے کے آگے سر نہوڑائے کھڑے کھڑے چند لمحوں کے لیے اس کے پاس نیم خوابیدگی کا وہ لذیذ اور غیر حقیقی عالم لوٹ آیا تھا جس میں سونے اور جاگنے اور سننے کے عمل کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا تھا، اور جو یہاں سے جانے کے بعد اس کو کسی خوابگاہ میں اور کسی بستر میں کبھی نصیب نہیں ہوا تھا۔ اس نے ہاتھ اُٹھا کر دو انگلیوں سے ہولے ہولے دروازہ کھٹکھٹانا شروع کیا۔ ایک بار، دو بار، تین بار ——— اس کا بیٹا حیرانی سے چاروں طرف محلے کے اونچے اونچے مکانوں کو دیکھ رہا تھا۔ دو سفید کبوتر کسی منڈیر سے اُڑ کر مدھم آسمان پر سے گزرے۔ کسی نے اوپر کی منزل کی کھڑکی کھولی۔

"کون ہے؟" ایک لڑکی نے کھڑکی سے سر نکال کر سوئی سوئی آواز میں پوچھا۔

"میں ہوں۔" وہ سر اُٹھا کر احمقوں کی طرح بولا۔

لڑکی کا چہرہ غائب ہو گیا اور کھڑکی کے بند ہونے کی آواز آئی۔ اس نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔ پھر زینے پر قدموں کے اُترنے کی آواز اُبھری۔ پھر دروازہ کھلا۔

"ماموں جان۔" لڑکی نے سانس روک کر زیرِ لب کہا۔

اس نے تلاشی نظروں سے اس لمبے قد اور چھریرے بدن کی نوجوان لڑکی کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور پہلی بار شعوری طور پر اسے اتنی عمر کے گزر جانے کا احساس ہوا۔ اس نے سوٹ کیس اُٹھا کر ڈیوڑھی میں رکھا اور اس اجنبی لڑکی کو اپنے ساتھ لگا لیا۔ اوپر کی منزل پر ایک دروازے کے کھلنے اور بند ہونے کی مدھم سی آواز آئی۔ اس نے سیڑھیوں پر قدم رکھا۔ پتھر کے زینے اور دیواروں کے لاوقت رنگ و روغن کو دیکھ کر آناً فاناً وہ بیس برس کو جیسے ایک جست میں پھلانگ کر اپنے لڑکپن میں جا کھڑا ہوا اور سر جھکا کر آہستہ آہستہ قدم قدم سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس کو اجنبیت اور مانوسیت کا وہ عجیب و غریب ملا جُلا احساس ہوا جو لمبی جلاوطنی کے بعد گھر آنے والے کا ہوتا ہے اور جو صرف کان اور آنکھ ہی میں نہیں، بدن کی ساری جلد پر اور اس کے نیچے لہو کی سرسراہٹ تک میں محسوس کیا جاتا ہے اور جس سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور وقت یکسر گم ہو جاتا ہے۔ اس نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ زینے کے اُوپر اس کی بہن چوکھٹ کا سہارا لیے اس کی منتظر کھڑی تھی۔ اس کا سر آدھے سے زیادہ سفید ہو چکا تھا اور اس کے چہرے کی جلد ڈھیلی پڑ گئی تھی اور اس کی بڑی بڑی پھیلی ہوئی آنکھوں میں وہ خلا تھا جو دکھی عورتوں کی آنکھوں میں پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ اس سے دوسری سیڑھی پر رُکا دن کے بڑھتے ہوئے اُجالے میں چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔ وہ اس سے صرف پانچ سال بڑی تھی اور اس کو وہ لمبے قد اور چھریرے بدن کی چلبلاتی ہوئی جوان لڑکی کے روپ میں چھوڑ کر گیا تھا۔ اس وقت دوسری بار اسے عمر کے گزرنے کا دھچکا لگا۔

پھر اس کی بہن کی کانپتی ہوئی کمزور آواز آئی: "سعید ——" اور اسے پتا بھی نہ چلا کب وہ اٹھا اور آخری دو سیڑھیوں کو پھلانگ کر اس کے قریب پہنچا اور ڈھیلے لباس میں ہڈیوں کے اس ڈھانچے کو محسوس کر کے اس کا دل جیسے لہو سے بالکل نچڑ گیا اور وہ بچوں کی طرح اس کے ساتھ لپٹ گیا۔ اسے صرف اتنا پتا چلا کہ وہ خستہ ہڈیوں کے ہلکے پھلکے، ہچکیاں لیتے اور ہچکولے کھاتے ہوئے ناطاقت بدن کو اپنے جسم کے ساتھ تھامے کھڑا ہے اور اس خوشبو کو سونگھ رہا ہے جو فجر کی سوتی جاگتی آوازوں کی طرح پرانی اور لذیذ اور مانوس ہے اور جو صرف دودھ پیتے بچوں یا اپنی بہنوں سے آتی ہے جن کے ساتھ آپ بچپن میں سوئے اور لڑکپن میں کھیلے ہوں۔ ایک بار جب اس نے سر اٹھا کر بے مدعا سامنے دیکھا تو اسے صرف اتنا پتا چلا کہ چھریرے بدن کی لڑکی اور اس کا بیٹا ساتھ ساتھ کھڑے آنکھیں پھیلائے پریشانی سے ان دونوں کو دیکھ رہے ہیں اور صحن کے کونے سے جو آسمان کا ٹکڑا نظر آرہا ہے اس پر دو سنہری کبوتر خوشی سے قلابازیاں کھا رہے ہیں۔ اس طرح اس کو جاننے کی خواہش کیے بغیر پتا چلا کہ سورج نکل آیا ہے اور دل گیلا کپڑا ہے جو بل دے کر نچوڑا جا رہا ہے۔ دراصل اسے کچھ بھی پتا نہ چلا تھا، کہ ایک ہی رنگ و بو کے دو جلاوطن بدنوں میں وقت یکسر گم ہو چکا تھا۔

پھر بعد میں وہ بڑے کمرے میں بیٹھا ناشتہ کر رہا تھا اور اس کی بہن اس کے سامنے بیٹھی اس کے بچے کو گود میں لیے باتیں کر رہی تھی: "تمہارا خط مل گیا تھا ——" وہ کہہ رہی تھی اور وہ گھونٹ گھونٹ چائے پیتا ہوا کمرے میں چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ کمرے کے سارے سامان میں سے صرف ایک وہ کونے میں کھڑی ہوئی اخروٹ کی لکڑی کی بھاری الماری تھی جس سے وہ واقف تھا۔ باقی سب بدل چکا تھا۔ وہ دن اسے آج بھی یاد تھا جس روز یہ الماری ان کے گھر میں وارد ہوئی تھی اور اوپر کی منزل تک پہنچتے پہنچتے تنگ زینے میں پھنس کر رہ گئی تھی اور زینے کے اوپر اس کا باپ کھڑا پسینے میں شرابور آٹھ زور لگاتے ہوئے مزدوروں کو یوں تندہی سے ہدایات دے رہا تھا جیسے میدانِ جنگ میں شاید کوئی جرنیل! اس روز وہ اسکول سے ذرا دیر سے لوٹا تھا اور جلد از جلد اوپر پہنچنا چاہتا تھا کہ اسے سخت بھوک لگ رہی تھی مگر آدھے زینے میں یہ بہت بڑی اور بھاری سی الماری پھنسی پڑی تھی جو نہ اوپر جاتی تھی، نہ نیچے اور نہ ہی گزرنے کا کوئی راستہ دیتی تھی کسی کو، اور آٹھ بیچارے، جن کے پسینے میں بھیگے ہوئے بھجے بے لنگ بے تھے اور پھڑکتے ہوئے گیلے پٹھے نیم تاریکی میں چمک رہے تھے اور جن کے جسموں سے محنت اور غربت کی تیز بساند آ رہی تھی، چار الماری کے آگے اور چار پیچھے اپنے حماقت زدہ چہرے لیے بوکھلائے کھڑے تھے اور اس کے باپ کی غصیلی، کڑک دار آواز پر تھک تھک کر غیر یقینی ہاتھوں سے الماری کو ٹٹول رہے تھے —— وہ آہستہ سے مسکرایا —— اس الماری کے دروازوں کی وارنش شدہ سطح پر اخروٹ کی لکڑی کی ٹیڑھی میڑھی سیاہ دھاریاں اوپر سے نیچے تک چلتی تھیں، اور اس کے اندر سالہا سال تک کھیس اور دریاں اور چادریں اور پتلی پتلی دلائیاں اور نیچے کے خانے میں پلنگ کے روغنی پائے (اور ایک پرانا اور ٹوٹا ہوا بینجو) رکھے جاتے رہے تھے اور جب اسے کھولتے تھے تو اندر سے اخروٹ کی لکڑی اور کچے سوت کی ملی جلی تیز بو آیا کرتی تھی جو باہر کی کسی بو سے میل نہ کھاتی تھی۔ چائے کا آخری گھونٹ بھرتے ہوئے بے اختیار اس کا جی چاہا کہ اٹھ کر جائے اور الماری کا دروازہ کھول کر دیکھے کہ اب اس میں کیا رکھا جاتا تھا اور اس کی بو اب بھلا کیسی تھی؟

"تم اپنی بیوی کو نہیں لائے ——؟" اس کی بہن کہہ رہی تھی اور وہ جواب میں پتا نہیں کیا کہے جا رہا تھا کیونکہ اس کی عمر ساری ناک اور کان اور آنکھ میں سمٹ کر آگئی تھی اور وہ نظروں سے اس لمبی اور چھریری لڑکی کا تعاقب کر رہا تھا جو اس کی بہن کا پہلا روپ تھا جو اس کمرے میں جو سالہا سال تک اس کا کمرہ رہا تھا، آ جا رہی تھی اور جھجکی ہوئی، اجنبی اور مانوس نظروں سے اسے اور اس کے بیٹے کو تاک رہی تھی۔ اس کے کمرے کی ایک دیوار لکڑی کی تھی جو غسل خانے کو الگ کرتی تھی اور جس پر ہاتھ مارو تو ساری لرزتی تھی۔ دوسری دیوار میں شیشے کی الماری جڑی تھی جس میں آدمی پورے قد سے کھڑا دکھائی دیتا تھا اور اسے کھولو تو اندر قرآن مجید پڑا ہوتا تھا اور نچلے خانے میں پتا نہیں کس کی ایک ٹوٹی ہوئی تسبیح پڑی رہتی تھی۔ گلی والی دیوار میں دو کھڑکیاں کھلتی تھیں جن میں جالی لگی ہوئی تھی اور جن کے رستے فجر کی دھندلی خوابیدہ آوازیں آیا کرتی تھیں اور —— ایک بار بہت فجر کو

سامنے والے گھر میں مہمان اُترے تھے اور ان کا لونڈا خوشی کے مارے گلی میں سے گاتا ہوا گزر رہا تھا: "دل والے ——— " اور اس نے اپنے بستر میں سوئے سوئے تقریباً خواب میں یہ آواز سُنی تھی اور آہستہ آہستہ جاگ پڑا تھا اور اس کُسر کو بار بار دل میں دہرا تا رہا تھا حتیٰ کہ اس آواز کا ایک بدن بن گیا تھا اور ایک رنگ نکل آیا تھا جو پیلا تھا اور ایک عمر کے گزرنے پر بھی پیلا ہی رہا تھا اور یوں اسے پتا چلا تھا کہ ماضی کا رنگ پیلا ہوتا ہے۔ اس کا جی چاہا کہ وہ ناشتے کی طشتری اُلٹ دے اور بھاگ کر جائے اور اپنے کمرے کے دروازے سے جھانک کر دیکھے کہ اب وہ بھلا کیسا تھا اور اس میں کیا کچھ رکھا تھا۔

"تیرے سر میں سودا تھا سعید" اس کی بہن تاسف سے کہہ رہی تھی: "تو اپنے باپ پر گیا ہے"

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ آتش دان پر اس کے ماں باپ کی بڑی بڑی تصویریں رکھی تھیں جن کے چہروں پر لازوال مسکراہٹیں تھیں اور جو عرصہ ہوا مر چکے تھے۔ اسے یہ بھی علم تھا کہ اس کی بہن کا شوہر جسے اس نے کبھی دیکھا تک نہ تھا آیندہ بھی کبھی دکھائی نہ دے گا چنانچہ اب وہ اس سے کیا کہہ سکتا تھا بھلا۔ اس نے جمائی لی اور چپکے سے جا کر پلنگ پر لیٹ گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ جوتے اتارے بغیر گہری نیند سو گیا۔

جب وہ سو کر اٹھا تو اس کے جوتے اترے ہوئے ترتیب سے پلنگ کے آگے رکھے تھے اور کمرے کے سارے دروازے بند تھے اور باہر صحن میں اور باورچی خانے میں اس کی بہن اور بھانجی اور کام کرنے والی عورت سب دبے پاؤں چل پھر رہے تھے اور اس کا بیٹا کھلکھلا کر ہنس رہا تھا۔ دوپہر کا کھانا کھا کر اور اپنے بیٹے کو ساتھ لے کر اس نے اپنی بہن سے دو گھنٹے کی اجازت لی اور باہر نکل آیا۔ بازار تک آتے آتے اسے چار آدمی ملے جنھوں نے دونوں باپ بیٹوں کو غور سے اوپر نیچے دیکھا اور خاموشی سے گزر گئے۔ بازار میں داخل ہونے سے پہلے اسے شدید حجاب آلود اجنبیت کا احساس ہوا اور اس نے فیلٹ ہیٹ کو آنکھوں پر کھینچا اور کوٹ کا کالر اٹھا لیا اور جیبوں میں ہاتھ دیے دیے بازار اور سارے شہر میں سے گویا سلیمانی ٹوپی پہنے پہنے گزر گیا۔ کسی نے اسے نہ پہچانا تھا اور اس سے اسے عجیب سے رنج مگر عجیب سی طمانیت کا احساس ہوا تھا۔ چنانچہ اس وقت بھی دوبارہ شہر میں داخل ہونے سے پہلے اس نے فیلٹ ہیٹ کو آنکھوں پر کھینچا، کوٹ کا کالر اُٹھایا اور ہاتھ جیبوں میں ٹھونس کر پُل سے اترنے لگا۔

اسی طرح اپنے فیلٹ اور کوٹ کی آڑ میں اس نے گول سڑک کے کنارے کنارے آدھے شہر کا چکر کاٹا اور بازار میں داخل ہوا۔ سڑک پر گھوڑوں اور موٹر گاڑیوں کی گرد اُڑ اُڑ کر اس کے ہیٹ اور کوٹ کے بازوؤں پر جم گئی تھی اور اس روز کی آخری دھوپ میں ذرہ ذرہ چمک رہی تھی۔ سورج کے گرد بادل جمع ہو رہے تھے۔ بازار میں اُس نے رحیم شربت والے کو پہچانا جس نے داڑھی رکھ لی تھی اور داڑھی سفید تھی۔ وہ اپنے پرانے مستقل انداز میں گدی پر بیٹھا تھا اور اس کے ہاتھ میں پنکھی تھی جس سے وہ اپنے آگے پڑی ہوئی رنگ برنگے دیسی شربتوں کی بوتلوں پر بھنبھناتی ہوئی مکھیوں کو اُڑاتا جا رہا تھا۔ رحیم شربت والے نے ایک دفعہ اسی جگہ پر تن تنہا سات ڈاکوؤں کا مقابلہ کیا تھا۔ مگر اس زمانے میں رحیم ململ کا کرتہ پہنتا تھا اور اس کے پٹھوں کی مضبوط ڈھلان اور شانوں کی گولائی اور بازوؤں کی مچھلیاں ململ میں سے صاف دکھائی دیتی تھیں۔ اب اس کے چہرے پہ سفید داڑھی تھی اور وہ مشکل سے پہچانا جاتا تھا۔ فیلٹ کی آڑ میں اس نے کئی اور لوگوں کو پہچانا جو اپنی پرانی دوکانوں پر اپنے مستقل انداز میں بیٹھے تھے۔ کئی لوگوں نے اُسے دیکھا اور گزر گئے اور پھر مڑ کر اس کی چال سے کچھ اندازہ کرنے اور کچھ یاد کرنے کی کوشش کی مگر بیس سال ایک عمر ہوتی ہے جو بچوں کو جوان اور جوانوں کو بوڑھا اور یادوں کو کند کر دیتی ہے۔ وہ سیدھا گھر جانے کے بجائے داہنے ہاتھ کی ایک گلی میں مڑ گیا۔

گلی کا فرش، اونچی نیچی اینٹوں والا، اس کا سارا لا پروا ماضی تھا جس پر ان گنت پرانے قدموں کے نشان تھے جن میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ اس نے گلی کو تقریباً خالی پا کر ہیٹ ماتھے پر اونچا کیا اور انگلیاں اپنے بیٹے کے بالوں میں دوڑائیں۔ بازار کی اونچی نیچی آوازوں

والا اُٹھتا اور دبتا ہوا شور پیچھے رہ جا رہا تھا۔ اب یہاں پہ گلی کی مخصوص آوازیں تھیں۔ دونوں طرف کے چوباروں کی کھڑکیوں میں آمنے سامنے بیٹھ کر سبزی بناتی اور آہستہ آہستہ باتیں کرتی اور گلی میں سے گزرنے والوں کو جھانکتی ہوئی عورتوں کی مخمور آوازیں اور اندر کسی کسی کواڑ کے کھلنے اور بند ہونے کی پُراسرار دھمک (ٹھنڈے، اندھیرے کمروں میں ان گنت سُستاتے اور ان دیکھی محبت کرتے ہوئے مردوں اور عورتوں کی پُراسرار دھمک!) اور سہ پہر کا سناٹا! اس کا جی چاہا کہ وہ پُرانے وقتوں کی مانند بازو پھیلا کر بھاگتا اور شور مچاتا ہوا اس گلی میں سے گزرے، مگر وہ حجاب آلود اجنبیت کا احساس پھر اس کے آڑے آ گیا اور وہ بازو اپنے بیٹے کی گردن میں ڈالے احتیاط سے پُرانے نشانوں پہ قدم رکھتا ہوا کڑی مستقل چال سے جو ادھیڑ عمری کی اور زیارت کے سفر کی چال ہوتی ہے گزرتا رہا، اور چوباروں کی کھڑکیوں میں ٹیک لگائے بیٹھی لڑکیوں نے سانس روکے بغیر گردن لمبی کر کے اس باپ بیٹے کو جھانکا اور دھیان ہٹا لیا۔ اور دوپہر کے کھانے کے بعد خنک تاریک کمروں میں محبت کرنے اور پھر گہری نیند میں بڑبڑانے والے ان گنت مردوں اور عورتوں کو ان کا پتا بھی نہ چلا۔ اب یہ اس کے دوست اوم کا گھر تھا جس کی بہن پُشپا ہر سال اس کے راکھی باندھا کرتی تھی اور اب وہ لوگ پتا نہیں کہاں تھے۔ اس وقت وہ سب پرائمری اسکول میں پڑھا کرتے تھے۔ اور ہفتے میں ہمیشہ ایک دو روز پُشپا اس سے کہتی: "آج ہم نے ترکاری پکائی ہے۔" اور وہ سیدھا ان کے گھر چلا جاتا اور ان کے دالان کے ٹھنڈے فرش پہ بیٹھ کر وہ تینوں ہلکی ہلکی گول چپاتیوں کے ساتھ تیل کے جھلملاتے ہوئے برتنوں میں ترکاری کھاتے اور بعد میں ان کے چوبارے کی سیڑھیوں پہ بیٹھ کر کھیلتے اور اس کے گھر والوں کو اس کی فکر بھی نہ ہوتی، کیونکہ اس زمانے میں اس کے دو گھر تھے ——— ایک اپنا اور ایک اوم اور پُشپا کا۔ اس نے رک کر کھلے دروازے میں سے اندر جھانکا: دالان اور چوکا اور ایک کوٹھڑی اور دائیں طرف کو اوپر جاتا ہوا زینہ سب جگہیں وہی تھیں، صرف کنبہ اجنبی تھا۔ دالان کے فرش پہ بیٹھ کر چرخہ کاتتی ہوئی بوڑھی عورت نے اپنی بے رنگ آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

"کیا ہے بھائی ———"

وہ چھت کی کڑیوں پہ نظر دوڑاتا رہا۔

"کس کو دیکھتے ہو بھائی ——— ؟" بڑھیا نے دوبارہ پوچھا۔

"کسی کو نہیں بی بی" اس نے آہستہ سے کہا۔ چرخے کے پاس روئی کے ڈھیر کو دیکھ کر اس نے بے خیالی سے سوچا، 'یہ شاید اس سال کی ہے!' پھر اس نے اپنے بیٹے کے بالوں میں انگلیاں دوڑائیں اور چل پڑا۔

اس گھر سے ایک خنک سی، نامعلوم سی بُو آیا کرتی تھی جو اوم اور پُشپا سے بھی آتی تھی ——— اس نے یاد کیا ——— اور جب کبھی وہ دوپہر کا کھانا کھا کر سو جایا کرتا تو پھر جاگنے پر، آنکھیں کھولنے سے پہلے ہی، اسے پتا چل جاتا تھا کہ وہ اس گھر میں ہے۔ اور پھر آنکھیں کھول کر پیتل کے کٹوروں اور تھالیوں کو تاریک چوکے کی دیواروں پر جھلملاتے ہوئے دیکھتا تھا اور اٹھ کر بیٹھ جاتا تھا اور اب یہ گھر اجنبی اور بے بو ہو چکا تھا جو کبھی اس کا اپنا تھا۔ اس نے سوچا سب چیزیں وہی تھیں صرف بُو اڑ چکی تھی، اس نے دل میں کہا، بُو جو لامقام ہوتی ہے مگر بدن ضرور رکھتی ہے، جو سفر کرتی رہتی ہے مگر مرتی بھی ہے۔

اب وہ اپنے اسکول کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ اس اسکول کا سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ ان کے گھروں کے پاس تھا چنانچہ اس علاقے کے سب بچے یہیں سے تعلیم شروع کرتے تھے۔ یہ اسکول کا پچھواڑا تھا جہاں اس کا ایک دروازہ اور باقی کھڑکیاں تھیں۔ دروازہ لوہے کی سلاخوں کا بنا ہوا تھا جیسے جیلوں یا خزانوں کا ہوتا ہے، اور کھڑکیوں میں بھی سلاخیں لگی تھیں۔ سکول کا اصل گیٹ پیچھے کی طرف تھا جہاں سے گول سڑک گزرتی تھی۔ اس نے بچے کے کندھے سے ہاتھ اٹھایا اور جا کر کھڑکی کی سلاخوں کو پکڑ کر کھڑا ہو گیا اور قیدیوں کی طرح ان سے منہ لگا کر اندر دیکھنے لگا۔ سکول میں چھٹی ہو چکی تھی اور چپراسی کمروں کو بند کر رہے تھے اور برآمدوں میں ماسٹر اپنی اپنی سائیکلوں پہ جھکے گپیں مار رہے تھے۔ یہ چوتھا درجہ تھا، اس نے کمرے میں نظر دوڑائی۔ بے ترتیبی سے پڑے

ہوئے بدرنگ ڈیسکوں پر سیاہیوں کے دھبے تھے اور بلیک بورڈ پر تقسیم کا ایک سوال حل کیا ہوا تھا جو پھر ڈسٹر سے آدھا مٹا دیا گیا تھا سامنے دیوار پر علامہ اقبال کی تصویر ٹیڑھی ہو کر لٹک رہی تھی۔ یہ چوتھا درجہ ہے، اس نے دل میں دوہرایا۔ یہاں وہ ایک سال تک بیٹھتا رہا تھا اور اس کے ساتھ ایک لڑکا بیٹھتا تھا جس کے کپڑوں سے گندے سوف کی سیاہی کی بُو آیا کرتی تھی۔ مگر اس سے آگے جو لڑکا بیٹھتا تھا اس سے گیلی گاچنی اور تازہ تراشی ہوئی قلموں کی کھری کھری خوشبو آیا کرتی تھی جو اسے بڑی اچھی لگتی تھی۔ مگر اس کی دوستی صرف اوم اور پشپا سے تھی جو دوسری قطار میں بیٹھتے تھے اور ان کے اپنے دوست تھے جو دوسری قطار کے تھے۔ اور آدھی چھٹی کے وقت نلکے کے گرد سب جمع ہو کر اپنی اپنی تختی پر گاچنی ملتے تھے اور جب کوئی تختی پر ہاتھ پھیرنے کے لیے گاچنی کی ڈلی کو ایک طرف رکھتا تو چپکے سے اسے اٹھا کر اپنی تختی پر مل لیتے تھے اور پھر وہیں رکھ دیتے تھے اور ہجوم کی گڑبڑ میں کسی کو پتا بھی نہ چلتا تھا۔ اس نے آہستہ سے سلاخوں سے منہ اٹھایا اور ہاتھ سے اس جگہ کو ملا جہاں اس کے ماتھے پر سلاخوں کے نشان پڑ گئے تھے۔ پھر اس نے اپنے بیٹے کے بالوں میں انگلیاں دوڑائیں اور آہستہ سے ہنسا اور وہ دونوں پھر گلی میں چلنے لگے۔ اب یہ وہ مکان تھا جو سکول کے ساتھ لگتا تھا اور جو اس کے لیے بڑا اسرار رکھتا تھا۔ اس مکان کو دیکھتے ہی اسے وہ شخص یاد آگیا جو یہاں رہا کرتا تھا۔ وہ پینتالیس پچاس کے لگ بھگ، دبلا پتلا اور لمبے قد کا آدمی تھا جو خاکساروں کی وردی پہنے رہتا تھا جس کی جیبوں میں ہر وقت اُردو کی اخباریں اور پرچے ٹھنسے رہتے۔ اس کے پاس ایک سائیکل ہوتی تھی جس میں چند پرانی عینکیں لٹکتی رہتی تھیں۔ کہنے کو وہ عینکوں کا کاروبار کرتا تھا مگر کسی نے اس کو کبھی عینکیں بیچتے ہوئے نہ دیکھا تھا۔ اس کا صرف ایک کام تھا کہ بازار میں سائیکل لے کر چلتے چلتے چند قدم پر رک جاتا اور اپنی گہری آواز میں نعرہ لگاتا ——— "پورا چکا چودھری اور غنڈی رن پردھان" اور پھر بچوں کے معصوم فاتحانہ انداز میں ادھر اُدھر دیکھتا تھا اور ارد گرد کے دکاندار اور گزرنے والے لوگ اس کی طرف اپنائیت سے دیکھتے تھے اور کھسیا کر ہنستے تھے کہ جیسے وہ اس نعرے کا نشانہ نہ ہونے کے باوجود اس میں شریک تھے۔ وہ شخص بھی نعرہ لگانے کے بعد خوشدلی سے ہنستا اور گزر جاتا۔ اس شخص کے لہجے میں اور چہرے پر کوئی کڑواہٹ نہ ہوتی بلکہ صرف خوش دلی اور بے ضرر طنز کے آثار ہوتے تھے جو اس کی شکل صورت اور چال ڈھال سے ذرا میل نہ کھاتے تھے۔ وہ ہر ایک کا دوست معلوم ہوتا مگر کسی نے اس کو کبھی کسی کے پاس رکتے نہ دیکھا تھا۔ وہ لوگ صبح سویرے سکول پہنچنے پر اس کو اپنی سائیکل کے ساتھ گھر سے نکلتے اور دروازے کو تالا لگاتے ہوئے دیکھتے اور کھڑے رہتے جب تک کہ وہ گلی میں اُتر کر اپنی گہری اور بلند آواز میں بلاناغہ "پورا چکا چودھری اور غنڈی رن پردھان" کا نعرہ لگا کر اور اپنے معصوم فاتحانہ انداز میں سارے بچوں پر نظر ڈال کر بازار کی طرف نہ چلا جاتا۔ جس روز وہ مرا اسے کسی کو پتا بھی نہیں چلا۔ تین روز تک دروازہ اندر سے مقفل رہا تھا ——— اس نے یاد کیا ——— حتیٰ کہ تیسرے روز بُو باہر نکل کر چاروں طرف پھیل گئی تھی اور سب سے پہلے سکول کے ماسٹروں نے دروازہ کھٹکھٹایا تھا اور چند بچوں نے جو اس آواز پر جمع ہو گئے تھے انھیں بتایا کہ آج تین روز سے انھوں نے پورا چکے چودھری کو نہیں دیکھا تھا۔ چنانچہ پہلے محلے کے لوگ جمع ہوئے، پھر پولیس آئی اور کافی دیر تک دروازہ کھٹکھٹانے اور آوازیں دینے اور درزوں میں سے جھانکنے کی کوشش کرنے کے بعد دروازہ توڑا گیا اور اندر وہ کرسی پر بیٹھا تھا جیسے عام لوگ کھانا کھانے کے لیے بیٹھتے ہیں۔ صرف اس کا سر ایک طرف کو ڈھلک گیا تھا اور میز پر ایک کاغذ اور قلم رکھا تھا اور کاغذ پر ——— یہ اس کو بہت بعد میں پتا چلا تھا ——— لکھا تھا: "پورا چکا چودھری اور غنڈی رن پردھان۔" اس نے اندر داخل ہوتے ہوئے لوگوں کی ٹانگوں میں سے اس کی ایک جھلک دیکھی تھی اور بُو کا بھبکا اس کے منہ پر پڑا تھا اور اس نے پلٹ کر نالی میں قے کر دی تھی، اور گو اس روز پشپا نے ایک چھوڑ دو دو بار کہا تھا: "آج ہم نے ترکاری پکائی ہے۔" مگر وہ اس کی سُنی اَن سُنی کر کے سیدھا اپنے گھر چلا آیا تھا اور اس کے بعد کئی روز تک کچھ کھا پی نہ سکا تھا۔ وہ جلدی سے مڑا اور اپنی گلی میں داخل ہوا جس کے آخر پر اس کا گھر تھا۔ گلی میں دروازوں اور کھڑکیوں پر بیٹھی سہ پہر

کی گپیں مارتی ہوئی عورتوں نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔ اس نے جھجک کر کوٹ کا کالر اُٹھایا اور ہیٹ کو ماتھے پر کھینچ کر ہاتھ جیبوں میں دیے اور سامنے دیکھتا ہوا چلنے لگا۔ کوٹ کی دائیں جیب میں اُنگلیوں کی مدد سے اس نے پورے پونے چھ آنے کے سکے گنے جو اب ساری دنیا میں اس کی کل دولت تھی۔ اب بادل سورج کے سامنے آ چکے تھے اور بارش کی خبر لانے والی مرطوب ہوا چلنی شروع ہو گئی تھی جب وہ اپنے دروازے پر پہنچا تو بارش کے پہلے قطرے اس کے ہیٹ پر پڑے۔

اس کا بیٹا دھپ دھپ کرتا اس کے آگے آگے سیڑھیاں چڑھ گیا۔ کھڑکیوں کے چھجوں پر شور مچاتے ہوئے بارش کے قطرے بڑی تیزی سے گر رہے تھے اور انھیں جذب کرتی ہوئی خشک دیواریں سوندھی سوندھی خوشبو چھوڑ رہی تھیں جو ایک بیش بہا خوشبو تھی اور صرف موسم کے پہلے چھینٹوں پر اُڑتی تھی اور پھر نکل جاتی تھی، کہیں کی کہیں ——— اس نے زینے میں رُک کر کئی لمبے لمبے سانس لیے اور گھر میں عورتوں کے ہنسنے کی مسرور آوازیں سنیں۔ اُوپر پہنچ کر اس نے اپنی بھابھی کو دیکھا جو صحن میں لپک لپک کر رسّی پہ پھیلے ہوئے گیلے کپڑے اُتار رہی تھی اور چارپائیوں کو گھسیٹ رہی تھی اور ہنسے جا رہی تھی۔ اس کی بہن جو ایک دوسری عورت کے ساتھ برآمدے میں چارپائی پر بیٹھی تھی اسے دیکھ کر بسم اللہ کر کے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ دوسری عورت نے مُڑ کر دلچسپی سے اسے دیکھا۔ وہ جیبوں میں ہاتھ دیے، کندھے جھکا کر چلتا ہوا صحن پار کر کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ مگر پھر کمرے کی دہلیز پر قدم رکھتے رکھتے وہیں کا وہیں جم کر رہ گیا۔

اس کا دل یکبارگی اُچھلا اور پھر بیٹھ گیا اور پھر جیسے ہوا میں معلق ہو گیا اور وہ مُڑ کر دیکھ بھی نہ سکا، صرف سر جھکائے دروازے میں کھڑا یاد کرتا رہا اور بارش کے قطرے اکا دکا اس کے ہیٹ پر بجتے رہے۔

نوری! ——— اس کا ذہن گونج اُٹھا۔ نوری!!

اس نے لمبے لمبے سانس لینے شروع کیے مگر دیواروں کی وہ اوّلیں نایاب خوشبو اب نکل چکی تھی۔ بہت آہستہ آہستہ وہ مُڑا اور برآمدے کی چارپائی پر بیٹھی ہوئی اس موٹی سی ادھیڑ عمر عورت کا پورا سامنا کر کے کھڑا ہو گیا۔

'نوری!!' اس کے ہونٹ ہلے مگر آواز پیدا نہ ہوئی۔ عورت مانوسیت اور حجاب کے ملے جلے تبسم کے ساتھ اسے دیکھتی رہی۔ وہ آنکھیں پھیلائے کھڑا دیکھتا رہا، دیکھتا رہا اور بارش کے قطرے لمحوں کی طرح اس کے بے تاثر چہرے پر گرتے رہے، ٹپ، ٹپ، ٹپ۔

"سعید! پانی پڑ رہا ہے:" پھر اس کی بہن نے کہا۔

وہ جیسے خواب کی حالت میں مُڑا اور دہلیز پر قدم رکھ کر اندر داخل ہوا اور جا کر کمرے کے وسط میں کھڑا ہو گیا۔ اس کا بیٹا بانہیں پھیلائے کرسی پر بیٹھا بے خیالی سے باہر بارش کو دیکھ رہا تھا۔ وہ ہاتھ جیبوں سے نکالے بغیر کھڑا رہا اور پانی کے اکا دکا قطرے اس کے ہیٹ پر سے کندھوں پر اور آستینوں سے فرش پر گرتے رہے، ٹپ، ٹپ، ٹپ! ——— وہ اس وقت صرف گیارہ سال کا تھا اور یہ بیل کی طرح بل کھاتی، پل پل تھرکتی، دھم دھم کرتی سیڑھیاں چڑھتی اور اُترتی اور بھاگ کر گلی سے گزرتی ہوئی شہد کے رنگ کی لڑکی تھی جو گیارہ سالہ دل کا اکلوتا سحر تھی، نوری! ——— وہ بے خیالی سے ہنسا اور اس کا دل جیسے واپس اپنی جگہ پہ آ گیا اور وہ آسانی سے ہولے ہولے سانس لینے لگا ——— وہ اس سے کئی سال بڑی تھی اور اس سے بات بھی نہ کرتی تھی مگر وہ گھنٹوں ——— پہروں اپنے دروازے سے لگ کر کھڑا (چوبارے پہ، کھڑکی میں، دروازے پر، گلی میں، اپنے گھر، اس کے گھر، کہیں، کہیں!) اس کی ایک جھلک کا منتظر رہتا تھا، اور دیکھ لیتا تو بہت اُداس ہو جاتا تھا۔ اس گیارہ سالہ بچے کے لیے اس لڑکی میں ایک ایسا جادو تھا جو شاید سنہرے سے رنگ کا تھا اور جو اس کی ماں یا بہن یا باپ یا کسی اور مرد اور عورت میں نہیں تھا۔ دن بہ دن، ماہ بہ ماہ، سال بہ سال ——— اس نے

یاد کیا ——— وہ اس کی ایک ایک جھلک کا منتظر رہا تھا اور وہ اس سے بے خبر رہی تھی، قطعاً۔ حتیٰ کہ جب وہ گھر سے گیا تھا تو اس کے ساتھ ہی وہ بھی گئی تھی، وہی پل پل تھرکتی ہوئی سنہرے رنگ کی سدا بہار شبیہہ کہ اس کی اوّلین عورت تھی جو کبھی نہیں بھولتی۔ (وہ دوبارہ ہنسا، جیسے کسی ان دیکھی گرج کو سُن کر ان سُنی کر رہا ہو) اس کے بعد کتنی ہی عورتیں اس کی زندگی میں آئیں اور نکل گئیں اور ایک کے بعد ایک کا سحر ٹوٹا، مگر ایک سحر قایم رہا اور ایک شبیہہ لازوال رہی جو اس کے دل کے ایک کونے پر روشنی کے مینار کی مانند کھڑی رہی اور ہر پرانے سحر کے ٹوٹنے پر نئے سحر کی جانب اسے چلاتی رہی اور جس کی جوانی کے زور پر وہ سدا جوان رہا تھا۔ اپنی ساری عمر اور عقل اور فہم اور تجربے کے باوجود اس کو کبھی اس بات کا خواب میں بھی خیال نہ آیا تھا کہ ایک روز دوبارہ وہ اسے دیکھے گا اس طرح ——— جیسے کوئی پتھر اُڑتا ہوا آ کر ایک جڑے ہوئے شیشے پہ لگے تڑاخ ——— اور شیشہ تڑخ کر کرچی کرچی ہو جائے مگر اپنے فریم میں کھڑا رہے جڑا جڑایا، جیسے ثابت و سالم، صرف سطح پر کرچیوں کی لکیریں پھیل جائیں چاروں طرف اور ہر کرچی سے ایک ٹوٹی پھوٹی شکل جھانکے الگ الگ۔ کہیں آنکھ کہیں ناک کہیں کان کہیں ہونٹ۔ جیسے کوئی خوفناک تصویر!

وہیں کھڑے کھڑے اس نے آہستہ سے گردن موڑ کر دروازے سے باہر دیکھا۔ برآمدے میں چارپائی اب خالی پڑی تھی۔ اس کی بہن ایک کرسی اُٹھائے چلی آ رہی تھی جو اس نے لا کر اس کے پاس رکھ دی۔

"نوری ———" اس نے اپنی بہن کو کہتے ہوئے سُنا: "تم نے پہچانا؟ بیچاری کا میاں ———"

وہ سیدھا سیدھا کرسی پر بیٹھ گیا اور گریبان کے بٹن کھول کر آہستہ آہستہ چھاتی پر ہاتھ پھیرنے لگا، جیسے کرچیوں کی لکیروں کو تلاش کر رہا ہو۔ باہر بارش لگاتار ہو رہی تھی اور دیواروں پر بچوں کے چاک اور گاچنی سے لکھے ہوئے نام اور نشان مٹتے جا رہے تھے۔ اس وقت بالکل ناقابلِ تشریح طور پر اس کو وہ شاندار مرغ یاد آیا جو شاید سنہرے سُرخ رنگ کا تھا اور ایک دفعہ دریا کے کنارے پکنک پہ جا کر انھوں نے ذبح کیا تھا۔ اور ذبح کر کے رکھا ہی تھا کہ اُٹھ کر بھاگ کھڑا ہوا تھا اس طرح کہ گردن کٹی ہوئی تھی اور ایک طرف کو لٹکا ہوا سر گیند کی طرح اُچھل رہا تھا اور وہ پر پھیلائے بھاگا جا رہا تھا۔ وہ سب کے سب اس کے پیچھے بھاگے تھے مگر ان کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ دریا میں جا گرا تھا اور دریا وہاں سے ایک دم گہرا تھا اور ان میں سے جو دو ایک تیرنا جانتے تھے وہ آگ جلانے کے لیے لکڑی کی تلاش میں اِدھر اُدھر جا چکے تھے چنانچہ مرغ پانی کی سطح پر تیرتا تیرتا دریا کے بہاؤ میں شریک ہو گیا اور دُور تک انھیں نظر آتا رہا تھا۔ وہ سب بیوقوفوں کی طرح منہ کھولے صم بکم کنارے پر کھڑے دیر تک اسے دیکھتے رہے تھے اور پھر بعد میں خوب ہنسے تھے۔ اور اس نے حیرت سے سوچا تھا کہ مرغ پانی میں گرنے کے بعد ہلا تک نہ تھا تو پھر وہ اُٹھ کر بھاگا کیسے تھا!

اور پھر اس کے بعد ایک دفعہ ——— کئی سال گزرنے پر وہ مرغ اسے دوبارہ یاد آیا تھا اور اس وقت وہ منظر ذرا بھی مضحکہ خیز نہ رہا تھا بلکہ بڑا شدید المناک ہو گیا تھا جس نے اسے بہت اُداس کر دیا تھا۔ اور اس نے ذرا حیرت سے سوچا تھا کہ چیزوں کے ساحل کہاں ہوتے ہیں کہ اتنی عمر تک نظر ہی نہیں آتے؟

وہ دوبارہ بے خیالی سے، بے تاثر طور پر ہنسا، جیسے کوئی بچہ ڈری ڈری ہنسی ہنستے ہوئے قدم قدم کسی پالتو جانور کی طرف بڑھتا ہے۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

اس کا بچہ کرسی کی پشت سے لگا لگا سو چکا تھا۔ اس کا سر ایک طرف کو ڈھلکا ہوا تھا اور ہاتھ کرسی کے بازوؤں پہ پھیلے تھے اور وہ گہرے گہرے، لمبے لمبے سانس لے رہا تھا جیسے باہر بارش ہو رہی تھی۔ اور باہر بارش لگاتار ہوئے جا رہی تھی، جیسے سحر ٹوٹ جاتا ہے۔

اُس نے میلے ماتھے پر اُونچا کیا، کوٹ کا کالر چڑھایا اور کھونٹی سے برساتی اُتار کر پہنی۔

"اب کہاں جا رہے ہو؟" اس کی بہن نے پوچھا۔

"ذرا باہر جا رہا ہوں۔" اس نے کہا۔

"بارش ہو رہی ہے سعید!"

"بس ابھی آتا ہوں۔"

"سعید!" اس کی بہن نے ملتجی نگاہیں اٹھا کر ڈرتے ڈرتے پوچھا: "اب یہاں رہو گے نا؟"

"ہاں۔" اس نے بے خیالی سے بے ماں کے بچے پر ایک نظر ڈالی اور دروازے کی طرف چل پڑا۔ پھر اچانک جیسے کچھ یاد آ جانے پر مڑا اور بڑی بے باکی سے بہن کی آنکھوں میں دیکھ کر ہنسا۔

"ہاں۔" وہ بولا: "اب میں یہاں رہوں گا۔" اور صحن پار کر کے سیڑھیاں اتر گیا۔

ڈیوڑھی میں اسے اپنی بھانجی ملی جو ہاتھ میں ایک خالی برتن لیے، دوسرے ہاتھ سے شلوار کے پائنچے اٹھائے بارش میں بھیگتی ہوئی گھر میں داخل ہو رہی تھی۔ اس نے دو انگلیوں سے اس کی ناک پکڑ کر آہستہ سے دبائی۔

"کہاں گئی تھی بلی؟"

لڑکی بیل کی طرح بل کھا کر مڑی اور پہلی بار پوری مانوسیت سے ہنس کر بولی: "ذرا ادھر گئی تھی ماموں۔"

دروازے میں رک کر اس نے دو پارہ بیٹ اتارا اور اسے خوب دبا کر سر کے پچھلے حصے پر رکھا۔ پھر اس نے ہاتھ پھیلا کر بارش کے زور کا اندازہ کیا۔ سامنے کے گھر میں ایک نوعمر لڑکا دروازے سے لگ کر کھڑا بڑی مشتاق مگر اداس نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ باقی سب گھروں کے دروازے ادھ کھلے یا بند پڑے تھے اور دور دور تک کوئی بشر نہ دکھائی دیتا تھا، سوائے چند چڑیوں کے جو بارش سے بچنے کے لیے کھڑکیوں کے چھجوں میں آ کر چھپ گئی تھیں اور دھیمی، خواب آلود آوازوں میں باتیں کر رہی تھیں۔ وہ بے خیالی سے مسکرایا اور گلی کے سرخ اینٹوں والے فرش پر ہلکے ہلکے خوشدل قدم رکھتا ہوا بازار کی جانب چل پڑا جہاں اب اسے اپنے پرانے جاننے والوں سے ملنا ملانا تھا۔ گلیاں اور محلے تقریباً ویران پڑے تھے۔ بارش شرانٹے سے ہو رہی تھی اور دن کا اجالا گھٹتا جا رہا تھا۔ اس کے اندر کوئی شے بڑی نازک مگر قدیم اور زور آور ٹوٹ کر آزاد ہو چکی تھی اور لہو کے ساتھ گردش میں تھی۔ وہ دل کے سر ہونے تک جیتا رہا تھا اور اس بات پہ نہ خوش تھا نہ خفا۔ بس بارش کے ان گنت قطروں کی تھاپ کو اپنے چہرے پر محسوس کر رہا تھا اور دل میں جانتا تھا کہ ان میں نہ رنگ ہے نہ بو نہ لے، صرف حیات ہے۔

رات

"شوکی، کہاں چلے جا رہے ہو؟" لڑکی نے پوچھا۔
"کہیں بھی نہیں!" وہ خوش دلی سے بولا۔
"بھئی آہستہ چلو،" وہ بولی: "میں تھک گئی ہوں۔"
"بہت اچھا۔"
دونوں خاموشی سے چلتے رہے۔
"شوکت،" وہ پھر بولی: "خدا کے لیے . . ."
"ہنہہ۔"
"کہاں جا رہے ہو؟"
"چلے پون کی چاآ آ آ آل۔" وہ گا کر بولا۔
"شوکی چپ رہو۔" وہ سختی سے بولی: "لوگ سن رہے ہیں۔"
"جگ میں چلے پون کی چاآل ل۔" وہ گاتا رہا۔ رفتہ رفتہ وہ بہت پیچھے رہ گئی۔

پھر ایک جگہ پر اچانک رُک کر وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ پاؤں میں اُلجھتی ہوئی ساری کو دو انگلیوں میں تھامے وہ ہانپتی ہوئی اس کے پاس آکر رک گئی۔ اس کی ناک کی پھننگ پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔

"چلو اب گھر چلیں۔" وہ بولی۔

اس نے مڑ کر غور سے اس لڑکی کو دیکھا، جیسے اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔

"چلو گھر چلیں۔" وہ سانس روک کر بولی۔

"چلو۔" وہ جیبوں میں ہاتھ ڈال کر پھر چلنے لگا۔

لیکن ان کا فلیٹ پیچھے کی طرف تھا اور وہ آگے کو جا رہے تھے۔ اسی لیے جب وہ بولی تھی: "چلو گھر چلیں" تو اس کی آواز میں ایک انجانے خوف کی لرزش تھی۔ اس لیے کہ وہ یہ جانتی تھی کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔ وہ اتنے عرصے سے اس کی بیوی تھی!

اب یہ اس عظیم الشان ساحلی شہر کا سب سے بڑا بازار تھا جسے وہ پار کر رہے تھے۔ پھر وہ اسے پار کرنے کے بجائے اس کے بیچوں بیچ چلنے لگے۔ وہ بازار میں چلے جا رہے تھے اور دو رویہ بجلی کی ٹیوبوں کی دودھیا سفید، ہلکے ابر آلود آسمان کی سی روشنی تھی اور دکانیں اور شو کیس جگمگا رہے تھے اور رکشا اور موٹریں اور گدھے اور ہر طرح کے لوگ ان کے ساتھ ساتھ بازار کے بیچوں بیچ چل رہے تھے۔ اگلے چوک تک پہنچتے پہنچتے اس نے ایک آخری کوشش کی:

"شوکی،" وہ بولی: "ابھی تو چائے پی کر چلے ہیں۔"

"مجھے بھوک لگی ہے۔" اس نے کند آواز میں کہا۔

"گڈو ——— گھر میں اکیلا ہے۔"

"مجھے بھوک لگی ہے۔" اس نے کہا۔

چوک کو پار کر کے وہ دل کشا ہوٹل میں داخل ہوئے اور اپنی مخصوص میز پر پہنچ کر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔

"شوکی،" وہ بولی: "میری بات سنو۔"

اس نے سر اٹھا کر غور سے اپنی بیوی کو دیکھا۔

"چلو،" وہ بولی، "پانی پی کر چلتے ہیں۔"

"چلو۔" اُس نے کہا اور مینو پر جھک گیا۔

"یا بس چائے پی کر . . ." لڑکی نے دوبارہ بات شروع کی، مگر اسی دم اس کا وہ انجانا خوف، جس کے باعث کچھ دیر قبل اس کی آواز لرزی تھی اور جو بار بار اس کے حلق میں آکر اٹک جاتا تھا، یکسر غائب ہو گیا اور اس کی جگہ اتنی ہی قدیم اور اتنی ہی مانوس بدمزگی اور شدید مایوسی نے لے لی۔ (بہت بعد میں جا کر ایک دفعہ اس کو پتا چلا کہ یہ انجانا خوف اس شخص کا نہیں اس جذبے کا تھا۔) اس موڈ سے اس کی آشنائی پچھلے ایک برس سے تھی، جب سے کہ اس کے خاوند کا تنزل شروع ہوا تھا، مگر برس بھر میں ہی اس نے ایک قدیم اور بھرپور جذبے کی شکل اختیار کر لی تھی جس سے کہ اب وہ زندہ رہنے کی قوت حاصل کر رہی تھی، وہ آزردگی جو ہوتے ہوتے ضد بن گئی تھی اور اب اسے سکون بخشنے لگی تھی، جیسے کہ سارے ہٹ دھرم جذبے اپنی اسی خصوصیت کے طفیل کسی نہ کسی حد تک سکون بخش ہوتے ہیں۔

"کیا کھاؤ گی؟" اس نے مینو سے سر اٹھا کر پوچھا۔

"کچھ نہیں۔"

"کچھ بھی نہیں؟" وہ آنکھیں نچا کر بولا: "کچھ نہ کچھ تو کھاؤ میری جان۔"

وہ دوسری طرف دیکھتی رہی۔ صرف اس کے ہونٹ بھنچ گئے اور آنکھوں میں سختی آگئی۔ چند میزیں چھوڑ کر ایک نوعمر لڑکا، جو انھیں ریستوراں میں داخل ہوتے دیکھ کر اپنی کرسی سے تھوڑا سا اٹھ کر پھر بیٹھ گیا تھا، پُرجوش لہجے میں اپنے ساتھی سے باتیں کر رہا تھا، لیکن وہ ابھی بہت نوعمر تھا اور شاید پہلی بار اتنی خوبصورت لڑکی کو ایسی بیباکی سے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پا کر سنسنا اٹھا تھا اور اس سے آنکھ ملا نہ پا رہا تھا۔ بس چہرہ سُرخ کیے زور زور سے باتیں کیے جا رہا تھا اور بار بار کرسی کو گھسیٹ رہا تھا اور بہرحال اتنے فاصلے پہ بیٹھا تھا کہ اس کی آنکھوں کی کشیدگی کو نہ دیکھ سکتا تھا۔

"زرد سیٹ بھی گیا۔" وہ بولی: "زرد چینی کا سیٹ۔"

"کس قدر افسوس کی بات ہے۔" وہ بڑے بڑے نوالے لیتا ہوا بولا: "تھ تھ تھ۔"

"پہلی چیز جو ہم نے خریدی تھی . . . ." وہ اپنے آپ سے بولی: "شادی کے بعد۔"

"کتنے پیسے ملے ہیں؟"

"تم پیٹ بھر کر کھاؤ شوکی۔" وہ بولی: "تمھیں اس سے کیا؟"

"تو کیا بھوکا مر جاؤں؟" وہ غرّایا۔

"نہیں،" وہ پہلی بار اس سے آنکھ ملا کر بولی: "پیٹ بھر کر کھاؤ۔"

وہ دوبارہ کھانے پر پل پڑا۔ اس کی لمبی لمبی نازک اُنگلیوں کو سالن میں تھرکتے اور بڑے بڑے لقموں کو بنتے اور بگڑتے اور اس کے لبوترے، سرد اور لاتعلق جبڑے کو تیزی سے کام کرتے ہوئے دیکھ کر وہ بددلی سے بولی: "کچھ تو تمیز سے کھاؤ شوکی۔"

"یہ آزاد مُلک ہے۔" اُس نے جواب دیا: "ہم آزاد مُلک کے باشندے ہیں۔" اور کھاتا رہا۔

لڑکی کی آنکھیں سکڑیں، پھر پھیلیں، پھر ان میں وہی کانچ کی سی سختی آگئی اور وہ دوبارہ مُنہ پھیر کر نوعمر لڑکے کی طرف دیکھنے لگی۔

آخر وہ سالن بھری انگلیوں کو نیپکن سے پونچھ کر کرسی کی پشت کے ساتھ سیدھا ہو بیٹھا۔ اس کی بیوی نے سفید کھدر کے براق دُھلے ہوئے، تہ مُڑ کیے ہوئے، خالی پلیٹ میں پڑے نیپکن کو دیکھا اور انھی ٹھنڈی نظروں سے اس پر پھیلے ہوئے لمبے لمبے میلے سُرخ اور زرد نشانوں کو دیکھتی رہی۔

پھر اس کا ہاتھ اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ کر وہ گود میں پڑے ہوئے پرس کو مضبوطی سے پکڑ کر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر تک وہ سیاہ چمڑے کے اس بلبے سے پرس کو اپنی اپنی طرف کھینچتے رہے۔ پھر وہ بھینچے ہوئے ہونٹوں کو نیم وا کر کے دانتوں کے بیچ سے پھنکاری:

"میں دوں گی۔"

وہ آہستہ سے ہنسا: "اچھا۔" اس نے کہا: "تم ہی دو۔" اور ہاتھ کھینچ کر کرسی کی پشت سے لگ کر بیٹھ گیا اور سامنے اس لڑکے کو دیکھنے لگا۔ لڑکی نے مٹھی بھر ریزگاری پرس میں سے نکالی اور پیسے گن گن کر بل ادا کیا۔ بیرا خاطر خواہ ٹپ نہ ملنے پر اکڑا اکڑا میز صاف کرنے لگا۔ وہ جلدی سے اُٹھ کھڑی ہوئی: "چلو۔" وہ بولی۔

"ذرا رکو۔"

"چلو۔" وہ بولی۔

دونوں آگے پیچھے چلتے باہر نکل آئے۔ انھیں جاتے ہوئے دیکھ کر نوعمر لڑکا باتیں بند کر کے ذرا سا کرسی سے اُٹھا، پھر بیٹھ گیا اور اُداس نظروں سے اس وقت تک انھیں دیکھتا رہا جب تک کہ وہ آنکھوں سے اوجھل نہ ہو گئے۔ باہر فٹ پاتھ پر اور بازار میں برقی ٹیوبوں کی دودھیا سفید، ہلکے ابر آلود آسمان کی سی روشنی تھی اور ستمبر کا موسم تھا اور بھاری، نمدار سمندری ہوا آ آ کر ان کے

چہروں سے ٹکرا رہی تھی۔ چاروں طرف انسانوں اور گدھوں اور گاڑیوں کا ہجوم اسی طرح رواں تھا۔ وہ چلتا چلتا جا کر بس سٹاپ پر رک گیا۔

"چلو۔" وہ بولی۔

وہ پتلون کی جیبوں میں ہاتھ دے کر ہونٹوں سے سیٹی بجانے اور ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔

"شوکی،" وہ ذرا نرمی سے بولی: "پیدل چلتے ہیں۔"

"میں تھک گیا ہوں۔"

لڑکی نے لمبا سانس چھوڑا: "اچھا،" وہ بولی: "بس میں سوؤ گے تو نہیں؟"

"نہیں۔"

تھوڑی دیر کے بعد دو منزلہ بس کو آتے دیکھ کر وہ بچوں کی طرح خوش ہو گئے۔ وہ اس کے آگے آگے، اُچھل اُچھل کر سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اوپر کی منزل میں جا کر سب سے آگے والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ بس کی دوسری منزل پر سفر کرنا ان دونوں کو بیحد بھاتا تھا۔ پہلے پہل جب ان کی شادی ہوئی تھی اور اپنے پیارے پُرانے شہر کی ساری جگہیں چپہ چپہ پیدل چل کر گھوم چکے تو بس ٹکٹ خرید کر اس کی دوسری منزل میں آگے والی سیٹ پر بیٹھے شہر بھر کی سیر کیا کرتے تھے بیکار میں۔ پھر وہ اپنے شہر کو چھوڑ کر اس شہر میں آ گئے جہاں دو منزلہ بسیں بہت کم تھیں اور صرف چند ایک خاص خاص راستوں پر چلتی تھیں۔

"اب ہم اُڑ رہے ہیں۔" وہ خوشی سے بولی۔

"ہاں،" اس نے بھی کہا: "اب ہم اُڑ رہے ہیں۔"

اب وہ بڑے بازار سے نکل کر ایک بازو کی سڑک پر جا رہے تھے جہاں پر کہ زیادہ تر دکانیں بند ہو چکی تھیں یا ہو رہی تھیں اور دو رویہ تاریکی میں لگے اکا دُکا کھلی دکانوں کے روشن پیوند پیچھے کی طرف اُڑتے جا رہے تھے۔ فٹ پاتھ پر اور سڑک پر کی ملگجی روشنی میں فاصلے کا احساس بڑھ گیا تھا اور ان دونوں کے چہرے، جو پُرانے وقتوں کی رہی سہی خوشی سے پل کے پل کو جگمگا اٹھے تھے، اوپر بس کی روشن کھڑکی میں جڑے دُور نیچے سائیکل سواروں اور رکشاؤں اور پیدل چلنے والوں کو پیچھے کی طرف اُڑتا ہوا دیکھ رہے تھے۔

"دو ٹکٹ؟" کنڈکٹر نے پوچھا۔

جب وہ ٹکٹ کے پیسے نکال رہی تھی تو شوکت نے جھک کر اس کے پرس میں نظر ڈالی اور مکاری سے مسکرایا جب کنڈکٹر چلا گیا تو وہ بولی:

"پتا ہے یہ کہاں سے آئے ہیں؟"

"زرد جینی کا سیٹ . . ."

"نہیں۔"

"پھر؟"

"اس کے پیسے تو ابھی ملے ہی نہیں۔"

"پھر؟"

"سرخ ساری کے ہیں۔"

"کون سی والی؟"

"جو پارسال عید پر تم نے دی تھی۔"

بس ایک دھچکے سے اسٹاپ پر رک گئی۔ انھوں نے اپنے پاؤں کے قریب شیشہ لگی طاقچی میں سے دیکھا کہ ڈرائیور نے ابنِ صفی کا ناول پلٹ کر وہاں سے پڑھنا شروع کر دیا جہاں پچھلے اسٹاپ پر اس نے چھوڑا تھا۔ چند لوگ اوپر آئے اور ادھر اُدھر بیٹھ گئے۔ ڈرائیور نے ناول اُٹھا کر کے اسٹیرنگ کے پاس رکھا اور بس پھر روانہ ہوئی۔

"یہ ساری،" اُس نے ہاتھ بڑھا کر سبز رنگ کی مہین ریشمی ساری کو چھوا: "میں نے ڈیڑھ سو میں خریدی تھی شوکی،" اس کی آنکھوں کی کانچ کی سی سختی آن کی آن میں غائب ہوگئی اور وہ اس کی طرف جھک کر جذباتی لہجے میں بولی: "یہ اکلوتا تحفہ ہے جو شادی سے پہلے تم نے مجھے دیا تھا۔"

"میں چھ ماہ تک اس کے لیے پیسے جمع کرتا رہا تھا۔" اس نے کہا: "گھر سے خرچ اتنا کم ملتا تھا۔"

"اور یہ سب سے پہلا تحفہ ہے جو تم نے مجھے دیا تھا۔ یاد ہے؟"

"تمھیں سبز رنگ بھاتا تھا۔"

"اور تمھیں چھوٹے چھوٹے تحفے دینے سے ایسی شرم آتی تھی۔" وہ آہستہ سے ہنسی: "تم مجھے کوئی قیمتی تحفہ دینا چاہتے تھے۔"

"اب بھی۔" اس نے دوبارہ ہاتھ بڑھا کر چھوا: "بالکل نئی ہے۔"

"شوکت ——" وہ دہل کر بولی، پھر اس نے نرمی سے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا: "میں اسے کبھی نہیں بیچوں گی شوکی۔"

"اب بھی یہ بالکل نئی ہے۔"

"میں اسے کبھی نہیں بیچوں گی۔" وہ پھر بولی: "شوکی یہ تمھارا سب سے پہلا . . ."

"تمھارے پاس اور بھی ہیں۔" وہ یک لخت چڑ کر بولا۔

"کہاں ہیں؟"

"جو ریاض نے تمھیں دی ہیں۔" اس نے کہا: "ہرے رنگ کی سستی سستی۔"

"وہ ——!" اچانک صدمے سے ایک لحظے کو اس کی پتلیاں پھیلیں، پھر اپنی جگہ پر آگئیں اور وہ اپنے آپ پر قابو پا کر بولی: "وہ بھی گئیں۔"

"کہاں؟"

"جہاں اور سب گیا۔"

وہ سامنے دیکھتا رہا: "اُن کا کیا ملا ہوگا۔" اس نے کہا۔

وہ خاموش بیٹھی خفت سے ہونٹ کاٹتی رہی۔

"ہرے رنگ کی سستی سستی۔" اس نے دہرایا۔

"سستی نہیں تھیں۔"

"ایسا سستا آدمی ہے،" وہ بدمزگی سے ہنسا: "ہمارا دوست۔"

"شوکت!" وہ کانچ کی سی آنکھیں سکیڑ کر نیچی آواز میں چیخی۔

اس کے بعد دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ اگلے اسٹاپ پر وہ کلدار گڑیا کی طرح چلتی ہوئی اس کے پیچھے پیچھے سیڑھیاں اُتر کر فٹ پاتھ پر آگئی۔ دونوں ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ جب وہ اپنے فلیٹ کی طرف مڑنے لگے تو وہ رک کر بولی:

"شوکت، میں نوکری کرنا چاہتی ہوں۔"

"کہاں؟"

"جہاں بھی مل جائے۔"

"مبارک ہو۔"

پتھر کا اندھا سا زینہ چڑھ کر دوسری منزل پر اس نے اپنے فلیٹ کے دروازے کو چابی لگائی اور وہ اندر داخل ہوئے۔ بڑے سے کمرے کا فرش اور دیواریں ننگی اور کھڑکیاں بند تھیں۔ دیوار کے ساتھ ایک میز پر چند کتابیں پڑی تھیں اور ٹیبل لیمپ جل رہا تھا۔ فرش پر دو تین کھلونوں کے درمیان ایک بچہ سو رہا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی وہ بھاگ گرگئی اور اس کے اوپر جھک گئی۔ بچے کے میلے گالوں پر آنسوؤں کی لکیریں بنی تھیں۔ اس نے اس کا ماتھا چھوا، پھر گال پر ہاتھ پھیرا، پھر احتیاط سے بازوؤں میں اٹھا کر اسے چوما اور دوسرے کمرے میں لے گئی۔ وہ کمرے کے وسط میں کھڑا خالی خالی اکتائی ہوئی نظروں سے ادھر اُدھر دیکھتا رہا۔ پھر اس نے انتہائی آلکس کے ساتھ وہیں کھڑے کھڑے اپنے کپڑے اتار اتار کر فرش پر گرانے شروع کیے۔ جب سارے کپڑے اتار چکا تو دوسرے چھوٹے کمرے میں جا کر بستر پر لیٹ گیا۔ ایک چھوٹے سے بستر پر بچہ سو رہا تھا۔ دیوار کے ساتھ چند صندوق رکھے تھے۔ دو چار کھونٹیاں تھیں جن پر کپڑے ٹنگے تھے۔ ایک میز تھی جس پر ہینڈ بیگ پڑا تھا۔ دیوار پر لیمپ جل رہا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر تک چھوٹے بستر پر بیٹھی بچے کے جسم پر ہاتھ پھیرتی رہی۔ پھر اس نے اٹھ کر ساری اتاری اور اسے احتیاط سے تہہ کر کے میز پر رکھا، پھر دونوں کمروں کی بتی بجھانے اور سڑک پر کھلنے والی کھڑکی کو کھولنے کے بعد خاموشی سے جا کر اس کے برابر لیٹ گئی۔

اب ایک پتنگا بڑی دیر سے کھڑکی کے شیشوں پر سر مار رہا تھا اور اندھیرے میں اس کے پروں کی کند، مدھم آوازیں اور سوتے جاگتے ہوئے انسانوں کی سانسوں کی بھنکار ابھر رہی تھی۔ کبھی کبھی کوئی گاڑی مدھم سی روشنی پھیلاتی ہوئی سڑک پر سے گزر جاتی۔

"اوں ہنک!" پھر وہ بولی: "نہیں۔"

وہ بلے کی طرح حلق میں غرایا۔

"نہیں شوکی،" وہ پھر بولی: "میرا جی نہیں۔"

"فاختہ۔" وہ خوشامد کے لہجے میں بولا: "میری ننھی سی، پیاری سی فاختہ!"

"خدایا۔" اس نے زاری کی: "خدایا۔"

پھر پتنگے کو شاید باہر جانے کا راستہ مل گیا اور اندھیرے میں صرف سانسوں کی مدھم بھنکار رہ گئی جو بلند ہوتی ہوتی کچھ دیر کے بعد ماتمی سرد آہوں میں تبدیل ہو گئی۔ کمرے میں سخت حبس ہو گیا۔

پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ چند لمحے تک کمرے کے وسط میں بازو لٹکائے کھڑا رہنے کے بعد وہ اندھیرے میں چلتا ہوا بڑے کمرے میں گیا اور ٹیبل لیمپ جلا کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ کہنیاں میز پر رکھے اور بازو سیدھے میز پر پھیلائے اور سفید کاغذ پر نظریں جمائے وہ دیر تک وہیں بیٹھا رہا۔ اب اس کے بدن میں مکمل امن تھا۔ ایک ایک جوڑ ایک ایک پور ایک ایک نس اپنی اپنی جگہ پر عین فٹ ٹھیک ٹھاک بیٹھی تھی اور خون یوں دوڑ رہا تھا جیسے کسی جدید ترین سٹریم لائنڈ مشین میں تیل ایک سرے سے دوسرے سرے تک دوڑتا ہے اور سانس یوں چل رہی تھی جیسے نیم کے پیڑ میں ہوا ایک ایک پتی، ایک ایک ریشے سے لپٹتی ہوئی بڑی روانی سے نکلتی چلی جاتی ہے۔ وہ ایک ذہین آدمی تھا اور ابھی ابھی ایک اٹلکچوئل کی سی تندی سے اپنی بیوی کے ساتھ محبت کر کے

چکا تھا - اور بڑی آسانی سے اپنے آپ کو سنبھالے بے دم ہوا بیٹھا تھا اور خیالات بغیر کسی دقت کے، بغیر کسی کوشش یا ارادے ہی کے، آپ سے آپ ذہن میں آتے چلے جا رہے تھے۔ "اب میں لکھوں گا!" اس نے سوچا - وہ ہمیشہ یہی سوچتا تھا اور کاغذ سفید کا سفید رہتا تھا، اس لیے کہ دل کی سوزش ابھی باقی تھی -

پھر متوحش آنکھوں سے وہ دروازے میں نمودار ہوئی اور ہولے ہولے چلتی ہوئی آ کر میز کے ایک کونے پر بیٹھ گئی اور اسے دیکھنے لگی - اور اسے اس کا ایک سال پہلے تک کا سنگ مرمر کی چمک والا تیر کی طرح سیدھا دبلا پتلا مگر مضبوط رگ و ریشے والا، پھڑکتے ہوئے، اُچھلتے اور کودتے ہوئے پٹھوں والا اور پوری طرح احاطہ کرتی ہوئی گردش والا اور نوعمر لڑکوں کی سی گریس والا محبوب اور مہربان بدن یاد آیا جو اب تند خو اور زہریلا ہو چکا تھا اور کوئی رابطہ کسی سے نہ رکھتا تھا اور مشین کی طرح سرد مہر تھا - پھر اس نے بھی آنکھیں اُٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور دیکھتا رہا -

زرد رنگ کی دیوار کے ساتھ ذرا سی ٹیک سے لگ کر بیٹھی ہوئی وہ "رتیوا" کی رس بھری، شاداب بدن کنواریوں کی یاد دلاتی تھی اور کوئی نہ کہہ سکتا تھا کہ اس عورت نے ایک بچہ جنا ہے اور دو سال تک اسے دودھ پلاتی رہی ہے - ٹیبل لیمپ کی گلابی روشنی میں اس کا انگ انگ جما ہوا بدن، بڑی اُٹھان والا اور بڑے جھکاؤ والا اور پُراسرار بدن مدھم مٹیالے سے زرد رنگ کا تھا اس طرح کہ دیوار کے ساتھ ایک ہو گیا تھا اور دیوار سے الگ بھی تھا - اس وقت اس گونگے اور بہرے اور بے خیال بدن، اس عاجز اور لاوقت بدن، اور باوجود ان سب کے بڑے ہی زرخیز اور تقریباً جلا وطن بدن کو دیکھ کر اس کے دل میں افسوس پیدا ہوا - اور اس وقت اسے ماضی کی یاد آئی -

اس لیے کہ ماضی کا بھی اپنا ایک رنگ تھا، مدھم مٹیالا زرد سا رنگ جو ان ساری چیزوں کا رنگ تھا جو ماضی میں رہتی تھیں ——— بہت پہلے جب وہ چھوٹا سا لڑکا تھا اور سویرے سویرے اُٹھ کر سکول کو جایا کرتا تھا اور نوکر ساتھ ساتھ بستہ لیے ہوتا تھا اور بستہ باندھنے کے بھی دو طریقے تھے - ایک دو گانٹھ والا تھا اور ایک ایک گانٹھ والا - یعنی دائیں بائیں کے پلوؤں کو بھی گانٹھ دیتے تھے اور آمنے سامنے کے پلوؤں کو بھی گانٹھ دیتے تھے اور یہ ایک طریقہ تھا - یا پھر آمنے سامنے کے پلوؤں کو نیچے اوپر تہہ کر کے رکھتے تھے اور دائیں بائیں کے پلوؤں کو اوپر گانٹھ دیتے تھے اور یہ دوسرا طریقہ تھا - اور کبھی ایک طرح سے باندھتے تھے اور کبھی دوسری طرح سے، اور جی کرتا تھا خود اُٹھاتے تھے جی کرتا تھا نوکر سے اُٹھواتے تھے اور اپنی مرضی کے خود آپ مالک تھے اور جو جی میں آتا تھا کرتے تھے - یعنی جی میں آتا تھا تو رستے میں رُک کر ننھے ننھے رنگدار کنکر جمع کرنے لگتے تھے اور پھر صاف سی جگہ پر بیٹھ کر ان کا نشانہ کرتے تھے اور نوکر کہے جاتا تھا: "بھیّا اسکول کو دیر ہو جائے گی!" "بھیّا ہیڈ ماسٹر صاحب ناراض ہوں گے!" اور اس کی بات کو ایک کان سے سُن کر دوسرے کان سے اُڑا دیتے تھے کہ اس کی اپنے سامنے کوئی طاقت نہ تھی - پھر وہ رستے میں نیم کا ایک پیڑ پڑتا تھا کہ جس پر چڑھتے ہوئے جانا گویا فرض تھا - اس لیے کہ اس کی بے شمار شاخیں تھیں جن پر چڑھنا بڑا آسان تھا اور اُوپر ان گنت پتیاں تھیں ہوا جن کے بیچ سے ہو کر بڑی آسانی اور روانی سے چلتی تھی اور دو موٹی موٹی شاخوں پر پیر جما کر پتوں کے اندر ہوا کے رُخ منہ کر کے کھڑے ہونا بڑا ہی اچھا لگتا تھا - پھر ایک روز آتا تھا کہ بقر عید ہوتی تھی اور اب تو گرمیوں میں آتی ہے مگر تب بڑے جاڑوں میں آیا کرتی تھی اور رات بھر مہندی لگے، اخبار کے کاغذوں میں لپٹے ٹُنڈ مُنڈ ہاتھوں کو گود میں دبے کبھی جاگے کبھی سوئے رہتے تھے اور سویرے اُٹھ کر دانتوں سے تاگوں کو کھولتے اور کاغذ اُتارتے تھے تو سوکھی مہندی کے پپڑے نیچے گرتے تھے اور انگلیاں سیدھی نہ ہوتی تھیں - مگر جب پانی میں ڈال کر ہاتھوں کو دھوتے تھے تو ان کا آتشی گلابی اور سُرخ رنگ نکلتا تھا جو فخر سے ایک دوسرے کو دکھاتے تھے اور ثابت کرنے کی کوشش کرتے تھے کہ ہمارا سب سے شوخ رنگ نکلا ہے - پھر اس کمرے میں جاتے تھے جہاں صندوق پڑے ہوتے تھے اور جہاں رات کو مہندی لگانے اور

سونے سے قبل سب کے عید کے نئے سِلے ہوئے جوڑے نکال نکال کر بکسوں، صندوقوں اور پیٹیوں پر پھیلا دیے گئے ہوتے تھے۔ نہانے سے پہلے ایک نظر اور ان کو ضرور دیکھ لیتے تھے۔ پھر نہا دھو کر اور نئے کپڑے پہن کر ابا کے ساتھ نماز کو جاتے تھے۔ نماز کے بعد گھر آکر صرف عیدی لینے کو رکتے تھے اور گلیوں میں بھاگتے ہوئے ماموں کے گھر پہنچتے تھے جہاں سے الگ عیدی لیتے تھے۔ پھر وہاں سے میلے کا رخ کرتے تھے۔ میلے پر میٹھی املی کھاتے تھے اور جھولوں پر خوب ایک دوسرے سے لپٹ کر آنکھیں میچ کر بیٹھتے تھے اور گھر واپس آتے آتے ابا کے نام کا بکرا ذبح بھی ہو چکا ہوتا تھا مگر اصل بات تو اگلے روز ہوتی تھی جب سویرے سویرے منہ اندھیرے ابا میاں آکر جگا دیتے تھے اور صبح سویرے یوں جگا دیے جانے پر دن بڑا خفا ہوتا تھا اور گرم گرم بستر ہی میں کسمسا کر سو جاتے تھے۔ مگر ابا میاں تھے کہ ننگی چھری ہاتھ میں لیے کھڑے رہتے اور کہے جاتے: "شوکی بیٹا، بس ذرا اس کو ہاتھ لگا دو۔ شوکی بیٹا ——" پھر جب آنکھیں مل کر کھولتے تو صبح سویرے کی ملگجی روشنی میں چمکتی ہوئی چھری کو دیکھ کر چونک پڑتے اور اٹھ کر بیٹھ جاتے اور ڈرتے ڈرتے ہاتھ بڑھا کر اُسے ذرا سا چھو دیتے اور ابا میاں اُسے پکڑے پکڑے باہر چل دیتے۔ مگر نیند اس کے بعد نہ آتی۔ چنانچہ مفلر کانوں پر لپیٹ کر، ہاتھ بغلوں میں دے کر سردی کے مارے کپکپاتے ہوئے ابا کے پیچھے پیچھے نکل آتے۔ باہر صبح کی روشنی اچھی خاصی ہوتی اور وہ نظارہ ہوتا، وہ جو دیکھنے کی ہمت نہ پڑتی مگر دیکھے جاتے۔ قصائی بکرے کو نالی پر گرائے اسی چھری سے ذبح کر رہا ہوتا اور ابا پاس کھڑے ہوتے اور خود ابا کے پیچھے چھپے ایک آنکھ نکال کر سُرخ سُرخ گاڑھے خون کو بہہ کر نالی میں جاتے، اور زمین پر ٹانگیں چلاتے پھڑکتے، کپکپاتے اور رکے ہوئے حلق سے گرر گرر کی آواز نکالتے اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے آسمان کو تکتے ہوئے بکرے کو دیکھے جاتے دیکھے جاتے اور دل میں بیک وقت خوف زدہ اور بڑا ہی اچھا محسوس کرتے —— اب یہ ساری چیزیں مدھم سے مٹیالے سے زرد رنگ کی تھیں اور ماضی کی اس عجیب و غریب سرزمین پہ رہتی تھیں جہاں سے اس کو دیس نکالا مل چکا تھا۔

پھر ایک روز پتا چلا کہ ابا فوت ہو گئے۔ ان کا لمبا سا تابوت صحن میں رکھا تھا اور گھر میں رونے چلانے کی آوازوں کے باوجود عجیب سی گونجتی ہوئی خاموشی تھی۔ ایک بڑی عجیب بات یہ تھی کہ اب تک ابا کے بارے میں اس کی یاد صرف اس تابوت کے حوالے سے تھی۔ جب بھی ابا کا ذکر آتا یا ان کی یاد آتی صرف وہ تابوت آنکھوں کے سامنے آتا اور وہ نہ آتے۔ اب یہ ساری باتیں بھی اسی زرد سے رنگ و بو کی مالک تھیں۔

پھر سب کچھ ختم ہو گیا۔ پھر وہ اچانک غریب ہو گئے۔ پھر وہ نوکر اور اپنے سامنے اس کی کم مایگی کا احساس اور وہ لاپروائی اور تبقر عید کے تبقر عید وہ دلدوز نظارہ —— کچھ بھی باقی نہ رہا اور وہ آہستہ آہستہ بڑا ہونا شروع ہوا۔ اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔

"جال،" اس نے پہلی بار بیوی کا نام لے کر نرمی سے کہا: "کپڑے پہن لو۔"

وہ اُٹھی اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولی: "چلو۔"

انھوں نے دونوں کمروں کی بتیاں گل کیں اور ساتھ ساتھ لیٹ گئے۔ اب چاروں طرف تاریکی تھی اور حبس سے دم گھٹا جا رہا تھا اور اسے پھر ماضی کی یاد آئی، کہ ماضی ایک وسیع و عریض، آسودہ حال اور زرد رنگ کی روشن سرزمین تھی جیسے صبح ہوتی ہے۔ اور ایک وہ لڑکی تھی گلی کے موڑ پر جس کا گھر تھا اور جس سے اس کی بڑی گہری نسبت تھی۔ ایسے کہ دونوں ساتھ ساتھ سکول کو جاتے تھے اور وہ چھٹے درجے میں تھا اور وہ پانچویں میں تھی اور کبھی ایک کے گھر میں اور کبھی دوسرے کے گھر میں دونوں پہروں مل کر کھیلتے رہتے تھے۔ اس کی جلد گائے کے مکھن کی سی اسی ہلکے زرد رنگ کی تھی اور اسی طرح ملائم اور چکنی اور بے داغ تھی۔ جب وہ ہنستی تھی تو اس کے گالوں میں گڑھے پڑتے تھے اور آنکھوں میں جگنوؤں کی قطاریں جلتی تھیں اور گلے سے گھنٹیوں کی آواز آتی تھی۔ اور وہ ہمیشہ سر پیچھے پھینک کر ہنستی تھی۔ اس کا نرخرہ اوپر نیچے کانپتا رہتا تھا اور اس کا جی بے اختیار اسے چھونے کو کرتا تھا۔ پہروں تک وہ اس کے گلے پر اور گلے سے نیچے سینے کی جلد پر اور بازوؤں پر انگلیاں دوڑاتا گدگدی کرتا نہ تھکتا تھا اور جب گھر کو لوٹتا تھا تو ہر روز بہت اُداس ہو جاتا تھا۔

وہ ہر دم ہنسا کرتی تھی اور اسی طرح ایک روز ہنستے ہنستے بولی تھی: "میرا پیٹ دیکھو گے؟" اور کپڑا ہٹا کر کھڑی ہو گئی تھی اور نیچے اس کا پیٹ بہت چپٹا، کمر کے ساتھ لگا ہوا، سنہرے زرد رنگ کا ملائم اور بے داغ تھا اور ناف کے اندر ہلکا سا سایہ تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کے پیٹ پر رکھ دیا تھا اور رکھے رہا تھا اور وہ کھڑی رہی تھی چپ چاپ۔ پھر اچانک اس نے پیٹ سے ہاتھ اٹھا کر اس کی قمیض پر رکھ دیا تھا: "اسے اتار دے۔" اس نے کہا تھا: "اور اسے بھی۔" وہ اس کے دوسرے کپڑے کو چھو کر بولا تھا: "تیرا بدن دیکھوں گا۔" اور اسی طرح ہنسی سے دہری ہوتے ہوئے اس نے کپڑے الگ کر دیے تھے اور ہاتھ آگے باندھ کر اس کی طرف پیٹھ کر کے کھڑی ہو گئی تھی اور خاموش ہنسی سے سارے بدن میں کپکپاتی رہی تھی، کپکپاتی رہی تھی۔ اور وہ سحر زدہ سا بیٹھا بیٹھا اس کے لمبی لمبی ٹانگوں والے اور تنگ محراب کولہوں والے اور کمان کی طرح تنی ہوئی ریڑھ کی ہڈی والے اور دُبلے پتلے شانوں والے اور سنہری روئیں والے ہلکے زرد بے داغ اور نوعمر بدن کو دیکھتا رہا تھا اور اس کا اپنا بدن ایک دم ہلکا سا ہو گیا تھا جیسے کہ وہ ابھی اُوپر اُٹھ کر اُڑنے لگے گا اور اسے دل میں بڑا ہی اچھا لگا تھا۔ اور یوں اس لڑکی کا یہ روپ اس کے دل پر نقش ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کے بعد جب بھی اس کا ذکر آیا یا اس کی یاد آئی اس کا یہی روپ نظر کے سامنے آیا وہ نہ آئی۔ ماضی کے نخلستان میں اس نیم کے پیڑ اور اس لڑکی کی ایک ہی رنگ و بو تھی کہ دونوں دل کو ہلکا کرتے تھے اور بدن میں اُڑان پیدا کرتے تھے اور جی کو بڑے ہی اچھے لگتے تھے۔

جس روز رات کو بیضے سے وہ مری بہ اسے کچھ پتا نہیں چلا۔ سویرے گھر میں کسی نے اس سے ذکر نہیں کیا۔ صرف ان کے گھر کے آگے سے نکلتے ہوئے اس نے ایک ہنگامہ سا دیکھا اور بے سوچے سمجھے سکول چلا گیا۔ پھر آدھی چھٹی کے وقت میں وہ اسے سارے میں ڈھونڈتا پھرا اور اسے کہیں نہ پا کر سخت مایوس ہوا۔ جب وہ سکول سے لوٹا تو وہ اسے دفنا کے بھی آ چکے تھے۔ وہ ان کے گھر بھر میں پھرتا رہا اور کسی نے اس کی طرف دھیان نہ دیا۔ پھر وہ ان کے کوٹھے پر جا چڑھا اور اس جگہ جا کر بیٹھ گیا جہاں اس نے اس کا وہ روپ دیکھا تھا۔ بڑی دیر کے بعد وہ وہاں سے اُٹھا اور چوبارے کی کھڑکی سے سر نکال کر بے مدعا اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اس وقت اس کی نظر اپنے مکان پر پڑی اور وہ حیران رہ گیا۔ اس نے بارہا یہاں سے اپنے مکان کو دیکھا تھا مگر پہلے کبھی اسے اس کی خستہ حالی کا ایسا احساس نہ ہوا تھا۔ ان کا مکان دھوئیں کے رنگ سے بدرنگ ہو رہا تھا اور اس پر بارش کے پانی کی لکیریں بنی ہوئی تھیں اور چوبارے کی ایک دیوار ٹوٹی ہوئی تھی اور اینٹیں اِدھر اُدھر بکھری پڑی تھیں۔ اس وقت اس نے دل میں ارادہ کر لیا کہ بڑا ہو کر وہ ایک امیر آدمی بنے گا۔

اپنی بیوی کے پیٹ پر ہاتھ رکھے رکھے وہ سو گیا۔

اگلے روز سویرے وہ ریاض کے چمکتے ہوئے دفتر میں بیٹھی تھی۔ وہ آگے کو جھک کر تقریباً کرسی کے کنارے پر بیٹھی تھی اور ساتھ والی کرسی پر اس کا بچہ بیٹھا پاؤں ہلا رہا تھا اور چھت کو گھور رہا تھا۔ سامنے ریاض گھومنے والی کرسی پر بیٹھا اپنی وسیع و عریض میز کے شیشے پر کہنیاں رکھے بالوں میں اُنگلیاں پھیر رہا تھا۔

"شوکت کیسا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ٹھیک ہے۔" وہ آہستہ سے بولی۔

"ٹھیک ہے؟"

وہ بے دلی سے اپنے ناخنوں کو گھورتی رہی۔

"انکل،" بچے نے کہا: "میں پڑھوں گا۔"

"کہاں پڑھو گے گڈو؟"

"کہاں؟" بچے نے کہا: "کتاب پڑھوں گا۔"

"ہاہا۔" ریاض ہنسا: "ابھی تو تم بہت چھوٹے ہو بیٹے۔"

"میں چار سال کا ہو گیا ہوں۔"

"ہاہا۔" اس نے میز کی دراز سے چند اور ٹافیاں نکال کر بچے کو دیں جو وہ لے کر کھانے لگا۔

"ریاض،" وہ اور آگے کو جھک کر بولی: "میں نوکری شروع کرنا چاہتی ہوں۔"

"کہاں؟"

"جہاں بھی مل جائے۔"

وہ بڑی دیر تک اسے گہری نظروں سے دیکھتا رہا، پھر بولا: "تم میرے ساتھ کام کر سکتی ہو، چاہو تو۔"

"نہیں۔" وہ بولی: "اپنی پرانی جگہ کا پتا کرتی ہوں۔"

"کالج میں؟"

"ہاں۔"

"وہ ابھی تک خالی تھوڑا ہو گی۔" اس نے کہا: "دو سال ہو گئے۔"

"شاید ہو۔"

"امی،" بچے نے کہا: "مجھ کو کتاب لے کر دو۔"

"اچھا۔"

"ڈی ڈل ڈی ڈل ڈی ڈل ڈو۔"

"گڈو۔" وہ بولی: "خاموش بیٹھو بچے۔"

"انکل مجھے کتاب لے کر دو۔"

"ابھی لے کر دیتے ہیں بیٹے۔"

پھر وہ اٹھا اور میز کے نچلے دراز سے ایک چوڑا سا، نفاست سے بندھا ہوا پیکٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا۔

"نہیں ریاض۔" وہ دہل کر بولی: "نہیں۔"

"جال ——"

"نہیں ریاض۔ اسے اپنے پاس رکھو۔"

"مگر آخر کیوں —— جال؟"

وہ اپنے سامنے میز پر پڑے پیکٹ کو گھورتی رہی۔ پھر آہستہ سے بولی: "ریاض اسے پتا چل گیا ہے۔"

"کس بات کا؟"

"ساری ساریاں جو تم نے مجھے دی ہیں۔"

"میں نے اس سے چوری تو نہیں دیں۔"

"میں نے اسے کبھی نہیں بتایا بہر حال۔"

"بہر حال۔" وہ لاپروائی سے بولا: "کیا فرق پڑتا ہے۔ آخر میں تم سے اتنی . . ."

"ریاض ——" وہ جیسے اپنے بچاؤ کے لیے ہاتھ اٹھا کر بولی۔

"اچھا چلو نہ سہی۔" وہ ہنسا: "مگر ہم اتنے پرانے دوست تو ہیں کم از کم ——"

"ریاض،" وہ بولی: "خدا کے لیے ــــــ"

وہ اُٹھ کر آفس میں پھرنے لگا۔

"امی؟" بچہ پیکیٹ سے کھیلتا ہوا بولا: "یہ کیا ہے؟"

"کچھ نہیں ہے۔"

"ڈی ڈی ڈی ڈل ڈو ڈول ڈا۔"

"گڈو چپ رہو۔"

"جمال،" وہ آکر اُس کے قریب میز پر بیٹھ گیا: "صرف ایک سال پہلے تک تم کتنی خوش تھیں، یاد ہے؟ میں تمھیں دیکھتا تھا تو میرے دل میں روشنی ہو جایا کرتی تھی۔ میں تمھیں کھو چکا تھا مگر خوش تھا، اس لیے کہ تم خوش تھیں۔"

"ریاض!"

وہ پھر اُٹھ کر کمرے میں پھرنے لگا: "جمال، آخر ہوا کیا ہے؟ بتاؤ۔ آخر ــــــ ہوا ــــــ کیا ــــــ ہے؟"

"مجھے کچھ پتا نہیں ریاض۔" وہ مایوسی سے سر ہلا کر بولی۔

"وہ ایک سیدھا سادہ نارمل اور ذہین انسان تھا، اور ــــــ" وہ اُداسی سے بولا: "بڑا خوش بخت آدمی تھا۔ ہم ساری عمر سے اُسے جانتے آئے ہیں، اس کے ساتھ رہے ہیں، پھر یہ بیٹھے بٹھائے اس کو آخر کیا ہو گیا ہے۔ جمال، مجھے شک ہوتا ہے کہ تمھیں سب پتا ہے مگر مجھ سے چھپاتی رہی ہو۔"

"مجھے کچھ پتا نہیں ریاض۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی: "میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ ہر وقت کھاتا رہتا ہے یا سویا رہتا ہے یا مسخرے پن کی حرکتیں کرتا رہتا ہے۔ میں سویرے سے شام تک باتیں کرتی ہوں اور میری کوئی بات نہیں سنتا، کسی بات کا جواب نہیں دیتا۔ جو پیسے ہوتے ہیں ضایع کر دیتا ہے، اور ــــــ" اس نے اس کی تندرست حیوانی محبت کا ذکر کرنا چاہا، مگر رُک گئی: "گھر میں کچھ بھی نہیں رہا۔" آخر وہ بولی۔

ریاض چلتا چلتا کھڑکی کے آگے رُک گیا۔ پھر اس نے کھڑکی کھولی اور دونوں ہاتھ اس پر رکھے رکھے نیچے سڑک پر دیکھتا ہوا بے خیالی سے بولا: "جمال یاد ہے وہ دن جب یونین کے الیکشن میں اس نے مجھے ہرایا تھا؟ اس روز ووٹنگ کے نتائج برآمد ہونے پر اس نے بڑی فراخ دلی سے میرے سامنے آکر مصافحے کو ہاتھ بڑھایا تھا اور میں نے مُنہ پھیر لیا تھا۔ تم سٹاف روم کے سامنے کھڑی ہمیں دیکھ رہی تھیں۔"

وہ خاموش بیٹھی میز کے شیشے پر ناخن سے لکیریں کھینچتی رہی۔

"بعد میں جب میں جھنڈیاں لگے ہال میں تنہا رہ گیا اور سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے اور شکست کی بہت ساری خفت میرے دل سے نکل گئی تو تیز زور کی آندھی آئی تھی اور میں نے برآمدوں میں اُڑتے ہوئے اپنے اور اس کے پوسٹروں کو دیکھ کر سوچا تھا: 'یہ شخص واقعی تمھارے قابل ہے۔' اس روز میں اپنی زندگی کے اس موڑ پر آگیا تھا جہاں سے پھر کبھی واپسی نہیں ہوئی۔ اس روز اس نے ہمیشہ کے لیے تمھیں مجھ سے جیت لیا تھا۔"

"ریاض،" وہ بولی: "ان باتوں کو یاد کرنے سے اب کیا فائدہ ہے؟"

"تمھیں پتا ہے جمال،" وہ مُڑ کر دیوار کے سہارے کھڑا ہو گیا: "نوجوانی کے دلیر دنوں میں گرا ہوا آدمی پھر کبھی جم کر کھڑا نہیں ہوتا۔"

وہ جھلملاتی ہوئی آنکھوں سے اُسے دیکھتی رہی۔

پھر وہ آہستہ سے ہنسا اور آکر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"مگر یہ بات،" اس نے ہوا میں ہاتھ پھیلا کر سوال کیا: "میرے لیے اب ایک راز بن چکی ہے۔ کوئی واقعہ، کوئی حادثہ، کچھ بھی تو نہیں ہوا، پھر یہ اسے کیا ہو گیا ہے؟ کیا ہو گیا ہے جمال؟"

"مجھے کچھ پتا نہیں۔" وہ رو کر بولی: "مجھے کچھ پتا نہیں۔"

"امی۔" بچے نے کہا: "امی۔" پھر اس نے کہا: "انکل۔" کسی نے اس کی طرف توجہ نہ دی۔

پھر وہ آنکھیں خشک کر کے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں ذرا کالج تک جا رہی ہوں۔" وہ بولی: "گڈو کو یہاں چھوڑے جاتی ہوں۔" وہ جھک کر بچے کے بال سیدھے کرتے ہوئے بولی: "گڈو جی، میں ابھی تھوڑی دیر میں آجاتی ہوں۔ آپ انکل کے پاس ٹھہریے۔ اچھا؟" اور اسے ماتھے پر چوم کر باہر نکل گئی۔

پیچھے گھر میں جب وہ سو کر اٹھا تو میز پر اس کا ناشتہ ڈھکا پڑا تھا اور کھڑکی کے راستے اندر آتی ہوئی دھوپ اس پر پڑ رہی تھی۔ اس نے اٹھ کر کلی کی اور ناشتہ کیا۔ پھر وہ ہاتھ سر کے پیچھے باندھ کر سیدھا لیٹ گیا اور کمرے میں داخل ہوتی ہوئی دھوپ کی اس چوڑی سی شعاع کو دیکھنے لگا جس میں گرد کے ذرات معلق تھے۔ گرد کے ذرات والی دھوپ کی شعاعوں کو دیکھنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ اس سے اسے بدن کے ہلکے پن کا احساس ہوتا تھا جس سے پھر اڑان کی یاد آتی تھی۔ سو کر اٹھنے کے بعد جو آسودگی کا مختصر سا وقفہ آتا تھا اس میں اس نے ناشتہ کیا تھا، اور کھانے کے بعد جو ایسا ہی تھوڑا سا وقت ملتا تھا اس میں وہ پھر سونے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے کروٹ لی اور دیوار کی طرف منہ کر کے لیٹ گیا۔ دیوار مٹیالے سے زرد رنگ کی تھی۔ سونے سے پہلے اس نے پھر اس زرد روشن رنگ کو یاد کیا۔ اب اس رنگ کی ایک بو بھی تھی: تازہ شہد کی سی، شریں کے زرد باریک تاروں والے پھولوں کی سی، جو گرمیوں کی شاموں کو کسی سڑک پہ چلتے چلتے اچانک ناک میں داخل ہوتی تھی اور پتا چلتا تھا کہ یہاں پاس ہی کہیں شریں کا پیڑ ہے، یا شاید سنتھے کی خشک جڑوں کو پانی دیا جا رہا ہے ———— یا کہ صرف ماضی ہے!

پرانے آبائی شہر میں اس کی اونچے اونچے دبلے پتلے سرو کے پودوں اور گھاس کے وسیع و عریض قطعوں والی یونیورسٹی تھی جس کی پرانی پرانی کائی جمی، عشق پیچاں کی بیلوں سے لدی عمارتیں تھیں جن کے موٹے موٹے چوکور ستونوں والے برآمدے تھے اور چوڑے چوڑے، پتھر کی سیڑھیوں والے زینے تھے اور اونچی اونچی چھتوں والے کمرے تھے اور ہر عمارت کا اپنا ایک مینار تھا جس کے اندر بل کھاتا ہوا تنگ سا زینہ چڑھتا تھا جو اوپر برجی میں جا کر نکلتا تھا جس کا دروازہ ہمیشہ بند رہتا تھا۔ پھر جب اس روز فلسفہ اینڈ کیمسٹری کے اس کھوئی کھوئی آنکھوں والے خوبصورت سے طالب علم نے ایک دروازہ توڑ کر برجی سے چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی تو ساری برجیوں کے دروازوں پر پلستر کروا دیا گیا تھا اور اس نے یونیورسٹی میگزین میں اس موضوع پر ایک کہانی لکھی تھی جس کا بڑا چرچا ہوا تھا اور اسی واقعے پر اس نے یونیورسٹی کے نامہ نگار کی حیثیت سے شہر کے سب سے بڑے اخبار میں ایک زبردست مضمون لکھا تھا جس نے اس کی دھاک بٹھا دی تھی۔ وہ یونیورسٹی میگزین کا ایڈیٹر تھا۔ وہ ڈی بیٹنگ ٹیم کا لیڈر تھا۔ وہ شعلہ بیان مقرر تھا۔ وہ چوٹی کا طالب علم تھا۔ وہ یہاں تھا، وہاں تھا اور ہر جگہ تھا۔ اس کی کہانیوں کی ایک دھوم تھی۔ اس کی اور ریاض کی جوڑی یونیورسٹی بھر کی نظروں میں تھی۔ ریاض اوّل نمبر کا اتھلیٹ، ہاکی ٹیم کا نائب کپتان اور چار سو چالیس گز کی دوڑ کا ریکارڈ ہولڈر تھا۔ اس کی بڑی خوش دل، ہنس مکھ اور لاپروا شخصیت تھی۔ ذاتی مقبولیت میں ایک دوسرے کے حریف ہونے کے باوجود دونوں کا آپس میں گہرا یارانہ تھا۔ ریاض کا باپ ایک انگریزی روزنامے کا مالک تھا اور اس نے شوکت کو اپنے اخبار کی پارٹ ٹائم نامہ نگاری دے

دی تھی کیونکہ اس کو پڑھائی کے لیے اخراجات کی ضرورت تھی۔ ریاض ہاکی اور دوڑ کی پریکٹس کے بعد شام کو اس کے گھر آجاتا اور پھر دونوں سائیکلوں پر سوار خبروں کی تلاش میں شہر بھر میں پھرا کرتے اور اجنبی لڑکیوں کا تعاقب کرتے (جان پہچان والی لڑکیوں کے تو وہ بیرے تھے چنانچہ لیے دیے رہتے)۔ ان دنوں اس کے دو مستقل ٹھکانے تھے: ایک اپنا گھر اور ایک ریاض کا گھر۔ ریاض کے گھر میں اس کی حیثیت کنبے کے ایک فرد کی سی تھی۔ وہ ریاض کی ماں سے بالکل بچوں کی طرح ضد کرتا اور اس کی چھوٹی بہنوں پر بڑے بھائیوں کی طرح رعب گانٹھتا۔ اکثر وہ رات کا کھانا ان کے گھر پر کھاتا اور بعد میں دیر تک ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھا ریاض کے باپ کے ساتھ سیاسی معاملات پر پرجوش بحثیں کیا کرتا۔ ریاض بیٹھا اونگھتا رہتا اور بعد میں اس کی پشت پر دھپڑ مار کر کہتا: ”عجب بور آدمی ہو یار۔ جانتے نہیں ابا جان کا بلڈ پریشر پہلے ہی ہائی ہے۔“ جس روز ریاض نے یونیورسٹی سپورٹس میں چار سو چالیس گز کی دوڑ کا ریکارڈ توڑا اس نے تین روز لگا کر ایک نوٹ لکھا تھا جو میگزین میں ریاض کی تصویر کے نیچے چھپا اور جس کا شکریہ ادا کرتے کرتے ریاض تقریباً رو پڑا تھا۔ پھر اس کے صلے کے طور پر ریاض نے انٹر ورسٹی ڈی بیٹ میں اس کی تقریر کے دوران ہوٹنگ بند کرانے کے لیے آدھے ہال سے لڑائی مول لی تھی۔ یہ نوجوانی کا وہ سنہرا زرد اور ہلکا سبز زمانہ تھا جب دل میں زور ہوتا ہے اور نگاہوں میں عزم ہوتا ہے اور آدمی دنیا کی سب سے اونچی چوٹی پر بیٹھا جیسے ہر وقت اڑنے کے لیے پر تول رہا ہوتا ہے۔ جب چھوٹی سے چھوٹی بات بھی ـــــــ رات کے سناٹے میں گم ہوتا ہوا کوئی الوداعی قہقہہ۔ کمر پر پڑتا ہوا پیار بھرا دھپ، ذہنوں کی وہ مخصوص بے تار برقی اور آنکھوں کی وہ مخصوص لمحاتی چمک (جیسے خاموش بیٹھے بیٹھے اچانک ایک ساتھ ایک ہی بات کو یاد کرکے چونک پڑنا اور پھر نظروں کا ملنا اور بالکل ناقابل تشریح طور پر ایک دوسرے کے دل کی بات کو جان لینا اور اطمینان سے خاموش بیٹھے رہنا)، یا باہر برآمدے میں کسی کے مانوس قدموں کی چاپ (جیسے گرمیوں کی لمبی لمبی سہ پہروں میں اکیلے بیٹھے بیٹھے کسی کو یاد کرنا اور دل میں اس کے ملنے کی خواہش کرنا اور اسی وقت بالکل انجانے طور پر اس کا وہاں پہ آنکلنا)، یا اپنے پرائیویٹ مذاق (جن کے حوالے سے بھری مجلس میں آپ ہی آپ میں محظوظ ہونا)۔ وہ زمانہ جب یہ چھوٹی چھوٹی باتیں بھی گہری رفاقت کا احساس دلاتی ہیں اور جب صرف دو ایک پسند کے دوست مل جانے پر ہی آدمی کے دل کے سارے جذبے پورے ہو جاتے ہیں اور ہوس کا دُور دور تک نشان نہیں ہوتا اور دل شکنی ابھی دل سے بہت دور ہوتی ہے۔ اس زمانے میں وہ اپنی دُنیا میں بڑے مکمل اور بہت خوش تھے۔

پھر ہسٹری ڈیپارٹمنٹ میں وہ لڑکی آکر داخل ہوئی۔ وہ دونوں آخری سال میں تھے کہ فِفتھ ایئر ہسٹری میں جمال افروز انصاری آکر داخل ہوئی جسے سب لوگ پیار سے جال کہتے تھے۔ وہ ہمیشہ سبز ساری پہنتی تھی (سیکنڈ ریٹ قسم کے لڑکوں نے اس کا نام سبز پری رکھ چھوڑا تھا) اور بات کرتے کرتے جب ذرا جوش میں آجاتی تو اپنی بھوری بھوری پلکوں کو سکیڑ کر بڑے جلال سے بات کرتی تھی۔ اس کا یہی انداز تھا جس نے اسے ایک بڑی اچھی ڈی بیٹر بنا دیا تھا۔ وہ اسے بہت پہلے سے جانتے تھے، جب وہ دونوں ابھی انٹر میں تھے اور وہ اپنے گرلز کالج کی طرف سے ایک مباحثے میں شرکت کرنے کے لیے آئی تھی۔ ان دنوں میں بھی وہ سبز لباس میں تھی اور نکلتے ہوئے قد کی، بڑے خوش نما اونچے چوکور ماتھے اور بھورے بالوں والی دبلی پتلی کمزور سی لڑکی تھی۔ چنانچہ اس کی تقریر کے آغاز میں دونوں نے خوب ہوٹنگ کی، مگر جب ایک دفعہ اس نے ان کو تاک کر بڑے اعتماد سے نظر جما کر اور آنکھیں سکیڑ کر بڑے کٹیلے انداز میں کوئی بات کہی تو وہ بھیگی بلی کی طرح سہم کر بیٹھ گئے اور پھر نہ بولے۔ اس کے بعد کئی بار ان کا آمنا سامنا ہوا۔ چنانچہ جب وہ پہلے پہل یونیورسٹی میں آئی تو وہ اس سے کچھ کچھ خائف رہے۔ مگر اب وہ پہلے سال کی وہ دبلی پتلی کمزور سی لڑکی نہ تھی۔ اب وہ ایک بھرپور جوان عورت تھی اور اس کی سنہرے زرد رنگ کی جلد تھی اور بڑا چوڑا اور اونچا ماتھا تھا اور جہاں سے اس کے ہلکے رنگ کے، جڑوں سے ابھر کر نکلتے ہوئے بال شروع ہوئے تھے بڑی سیدھی اور ہموار لائن تھی اور وہ اپنے گھنے بالوں کو لاپروائی سے ایک دم پیچھے کی طرف کنگھی کرکے ڈھیلا ڈھالا جوڑا بناتی تھی اور اسی طرح آنکھیں ہلکی سی سکیڑ کر بڑی سنجیدگی سے بات کرتی تھی اور

کسی کو لفٹ نہ دیتی تھی۔ ان باتوں کو اور دوسری ساری حوصلہ شکن باتوں کو اور اس کی چال کی گریس کو اور اس کی شخصیت کی دل کشی کو ان دونوں نے اپنی اپنی جگہ پر، الگ الگ، دیکھا اور محسوس کیا اور بڑھنے لگے ——— دور ہونے لگے۔ پہلے اس کا ذکر آپس میں بند ہوا، پھر طنزیہ جملوں پر نوبت آئی، پھر آہستہ آہستہ سب کچھ ختم ہو گیا اور وہ اپنے اپنے راستوں پر بڑھتے گئے۔ اس نے کہانیاں لکھیں اور تقریریں کیں اور ٹرافیاں جیتیں، مس جمال افروز انصاری کو ڈی بیٹنگ ٹیم کا نائب لیڈر بنوایا، اس کی تصویر میگزین کے پورے صفحے پر چھاپی اور بڑا شاندار نوٹ لکھا۔ ریاض نے ہاکی ٹیم کی کپتانی سنبھالی اور انٹر ورسٹی چیمپئن شپ جیتی۔ پھر اس نے اپنے باپ کے پیسے کا پورا پورا استعمال کیا۔ اس نے بڑھیا سوٹ سلوائے اور ایک چھوٹی سی کار خریدی جس پر بیٹھ کر روزانہ یونیورسٹی آنے لگا۔ دونوں مقبولیت اور کامیابی کی آخری سیڑھی پر کھڑے تھے اور سانس روکے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ جب ڈائس پر چڑھ کر "مسٹر پریذیڈنٹ، آنریبل ججز، لیڈیز اینڈ جنٹلمین" کہہ چکتا تو سیدھا اگلی قطار میں بیٹھی ہوئی زاہدہ پر روشن ماتھے کو اوپر اٹھائے آنکھیں ہلکی سی سکیڑ کر غور سے اسے دیکھتی ہوئی) اس کو ایک لمحے کے لیے بڑی شدت سے دیکھتا اور نظر اٹھا لیتا اور پھر الفاظ اس کی زبان سے ایسی روانی اور قوت سے نکلتے کہ اس کا بدن اڑنے لگتا۔ پھر جب میگزین سہ ماہی کی سہ ماہی چھپ کر آتا تو وہ دن بھر کنکھیوں سے اسے اس کی ورق گردانی کرتے ہوئے دیکھتا اور اس انتظار میں رہتا کہ کب وہ اس سے اس کا ذکر کرتی ہے۔ اور ریاض تھا، جو ہاکی کے میدان میں ایک 'پاس' بھی کام کا دیتا تو مڑ کر ایک نظر ہزاروں کے مجمعے میں اس سبز لباس پر ڈال لیتا۔ مقابلے کی کوئی دوڑ جیتتا تو ہانپتا ہوا ضرور اس کے سامنے سے گزرتا، اور دن دن بھر کسی نہ کسی طرح اس کی نظر کے سامنے رہتا۔ جب ڈی بیٹنگ ٹیم کراچی گئی تو وہ بھی ان سے الگ چھٹی لے کر وہاں پہنچا اور شوکت کی تقریر کے دوران اس نے کراچی یونیورسٹی کے لڑکوں کے ساتھ مل کر خوب ہوٹنگ کی۔ جب ان کی ٹیم نے بہرحال مباحثے کی ٹرافی جیت لی اور وہ لڑکے لڑکیوں میں گھرے ہوئے باہر نکلے تو وہ بے انتہا مسرور جمال کے سامنے آ کھڑا ہوا اور بولا: "مبارک ہو جمال۔" اور جمال نے اس کا شکریہ ادا کیا اور دونوں دیر تک کھڑے باتیں کرتے رہے۔ اس وقت وہ وہاں سے چلا آیا تھا اور دور برآمدے میں کھڑا انھیں دیکھتا رہا تھا۔ آخر جب وہ ریاض سے رخصت لے کر اس کے پاس پہنچی تھی تو اس نے پہلی بار بے اختیار ہو کر کہا تھا: "کیا باتیں ہو رہی تھیں؟" اور وہ ہنس کر بولی تھی۔ "مبارک باد وصول کر رہی تھی۔" اور سن کر اس کا دل بیٹھ گیا تھا اور حسد کا جلتا ہوا جذبہ اس کے دماغ کو جا چڑھا تھا اور وہ خفگی سے بولا تھا: "مبارک باد میں اتنی دیر لگ گئی!" اور پہلی بار اس نے رک کر آنکھیں سکیڑ کر غصے سے کہا تھا: "یہ مجھ پہ کیسا حق جتا رہے ہو شوکت!" اور اس کے بعد وہ ایک ہفتے تک اس کے قریب نہ پھٹکا تھا۔ (یہ چھوٹی چھوٹی باتیں تھیں جو بڑے انجانے طور سے دل کو دل شکنی کے قریب لا رہی تھیں۔)

پھر فیصلہ کن وقت وہ آیا جب اس نے اور ریاض نے یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین کی صدارت کے لیے انتخاب لڑنے کا اعلان کیا۔ ان کی بول چال تقریباً بند ہو چکی تھی، مگر اعلان سے چند روز پہلے وہ ٹک شاپ سے نکل رہا تھا کہ ریاض اسے دروازے پر کھڑا ہوا مل گیا۔ اس وقت وہ اکیلا تھا اور وہاں کھڑا شاید اسی کا انتظار کر رہا تھا۔ اسے دیکھ کر آگے بڑھا اور پرانے پیارے انداز میں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا:

"میں نے سنا ہے تم کھڑے ہو رہے ہو شوکی۔"

"ہاں۔"

"مت کھڑے ہو۔"

"کیوں؟"

"ہار جاؤ گے۔"

وہ بڑے اعتماد سے اور بڑے طنز سے ہنسا تھا: "اپنی خیر مناؤ میاں۔" اس نے کہا تھا۔
" تمھارا کوئی چانس ہی نہیں ہے شوکی۔"
" یہ تو پتا چل جائے گا بھئی۔" اس نے سنجیدہ ہو کر کہا تھا۔
دونوں ایک طویل لمحے تک ایک دوسرے کو دیکھتے رہے تھے۔ پھر ریاض نے اس کے کندھے پر سے ہاتھ اٹھا لیا تھا۔
"اچھا، تمھاری مرضی۔" وہ جاتے جاتے بولا تھا: "مگر ایک بات یاد رکھو" اس نے کہا تھا: "جمال تمھارا ساتھ نہیں دے گی۔"
اس کا دل بیٹھ گیا تھا، مگر وہ بڑے طنز سے کھوکھلی سی ہنسی ہنس کر بولا تھا: "دیکھا جائے گا۔"
پھر گروہ بندیاں ہوئیں اور سکیمیں بنیں۔ پوسٹر چھپے اور پارٹیاں ہوئیں اور ڈھیروں کیچڑ اچھالی گئی یا سکینڈل اڑے اور نعرے لگائے گئے اور جوان اور لاپرواہ دلوں نے خوب خوب ایک دوسرے پر وار کیے۔ مگر جمال کے پاس ان دونوں میں سے کوئی بھی نہ گیا۔ صرف دل تھامے دونوں انتظار کرتے رہے، انتظار کرتے رہے۔ آخراس نے خود ہی ایک روز اسے برآمدے میں روک لیا۔
"آج کل بڑا ہنگامہ ہو رہا ہے جناب۔" وہ ہنس کر بولی: "بڑے مصروف ہیں آپ!"
"نہیں تو۔"
"کون کون کھڑا ہو رہا ہے؟" اس نے انجانے پن سے پوچھا۔
"ہا ہا۔" وہ گھبرا کر ہنس پڑا۔
پھر وہ سنجیدہ ہو گئی: "مجھ سے تو تم نے کہا ہی نہیں شوکت۔"
"کیا؟"
"ووٹ کا۔"
"تمھارا ووٹ،" جواب دیتے دیتے وہ سرخ ہو گیا تھا: "تو میرا اپنا ہی ہے جال۔"
"اتنا اعتماد ہے تمھیں؟" وہ بولی تھی۔
"ہاں۔" اس نے کہا تھا، اور جواب میں وہ ہنس دی تھی، جیسے کہہ رہی ہو: "تو پھر ٹھیک ہے شوکی۔" اور ریاض جیسے اسی روز ہار گیا تھا۔
جس روز وہ منتخب ہوا اس کے ساتھیوں نے اسے کندھوں پر چڑھا کر ریاض کے کیمپ کے سامنے بھنگڑا ڈالا اور سٹاف کی نظروں کے سامنے پتلونیں نکال دیں اور اگر چند پروفیسر بیچ بچاؤ نہ کرتے تو شاید بلوہ ہو جاتا۔ اسی روز ریاض یونیورسٹی سے غائب ہو گیا تھا۔
پھر وہ کبھی وہاں لوٹ کر نہ آیا۔ چند روز کے بعد اسے صرف ایک خط ملا تھا جس میں ایک جملہ لکھا تھا: "شوکت اور جمال کو مبارک باد۔" جسے پڑھ کر وہ خوب ہنسا تھا اور جمال اداس ہو گئی تھی۔ پھر سنا گیا کہ وہ اپنے اخبار کا لندن کا رسپانڈنٹ ہو گیا ہے۔ اسی سال شوکت نے فرسٹ کلاس فرسٹ رہ کر امتحان پاس کیا اور اگلے سال چانسلر کے ہاتھ سے گولڈ میڈل وصول کیا اور پھر ان کی شادی ہو گئی۔ چند ہی برس کے اندر اندر وہ اپنے شہر کا سب سے مشہور اور بھاری معاوضہ پانے والا فری لانس جرنلسٹ بن گیا۔ پھر وہ نئی دنیاؤں اور نئی کامرانیوں کی تلاش میں اس شہر کو ہجرت کر آئے جہاں دو منزلہ بسیں چلتی تھیں اور صرف خاص خاص راستوں پر چلتی تھیں۔ شادی کے چند سال بعد تک وہ بہت خوش رہے تھے، بہت ہی خوش رہے تھے۔ فتح و کامرانی کے ان آفاق کا نام اب ماضی تھا جس کے سنہرے زرد رنگ کو یاد کرتے کرتے اب وہ سوچ رہا تھا۔

جب وہ سو کر اُٹھا تو سورج سر پر آن پہنچا تھا اور جمال ابھی نہ لوٹی تھی۔ اس نے اُٹھ کر کپڑے پہنے، جمال کے اٹیچی کیس سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر کچھ پیسے نکالے اور انھیں جیب میں ڈال کر باہر نکل آیا۔ فٹ پاتھ پر اُترتے ہی دوپہر کی تیز دھوپ اس کی آنکھوں کو لگی اور اس نے ہاتھ سے ان پر سایہ کر لیا۔ آنکھوں پر ہاتھ کا سایہ کیے وہ دُور تک چلتا گیا، پھر ایک چوراہے پر رُک کر اس نے ہاتھ ہٹایا اور کئی بار آنکھوں کو جھپک کر ادھر اُدھر دیکھا اور ایک طرف کو چل پڑا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ ساحلِ سمندر پر نکل آیا۔ ساحل پر کئی لوگ گھوم رہے تھے۔ اس نے کچھ لوگوں کو غور سے اور کچھ کو سرسری طور سے دیکھا اور ادھر اُدھر پھرتا رہا۔ پھر وہ ریستوران میں جا کر سمندر کے رُخ کھلنے والی کھڑکی کے پاس اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھ گیا اور باہر دیکھنے لگا۔ باہر ریتلے ساحل پر اور سطحِ سمندر پر دھوپ پھیلی ہوئی تھی، مگر فضا کا وہ گہرا گدلا نیلا سا رنگ، جو اب ہر طرف چھایا رہتا تھا، بدستور موجود تھا۔ اسی ہی رنگ کی بھاری نمدار ہوا، جس میں سمندر کی مخصوص بُو رچی ہوئی تھی، ڈائننگ ہال کے آر پار چل رہی تھی۔ وہ میز پر کہنیاں رکھے دیر تک بیٹھا ٹکٹکی باندھے باہر کے منظر کو دیکھتا اور چھاتی کے بوجھ کو ہلکا کرنے کے لیے لمبے لمبے سانس لیتا رہا۔ اندر ہال میں اب لوگ آ آ کر بیٹھنا شروع ہو گئے تھے اور کھانا لایا جا رہا تھا۔ کچھ لوگ بیئر پی رہے تھے۔ ہال کے دروازے پر سلیم، جو اس کا شاعر دوست تھا، اپنی بیوی جمیلہ اور ایک دوست کریم بھائی کے ہمراہ نمودار ہوا۔ (افواہ تھی کہ کریم بھائی آج کل اسے سپورٹ کر رہا تھا۔) وہ تینوں اِدھر اُدھر نظر دوڑاتے ہوئے آ کر اس کی میز کے گرد بیٹھ گئے۔

"ہلو شوکی۔" سلیم نے کہا۔

"ہلو،" وہ چونک پڑا: "ہلو ہلو۔"

"کہاں چھپے رہے اتنے روز تک؟"

"ملکِ عدن کی سیر کو گیا تھا۔" وہ بولا: "صحت بنا رہا تھا۔"

"ایں؟ اچھا ان سے ملو، کریم بھائی کراچی والا۔" سلیم نے تعارف کرایا: "کریم بھائی یہ میرا دوست ہے شوکت محمود۔ ملک کا سب سے بڑا اخبار نویس۔"

"پیپر والا؟" کریم بھائی نے پوچھا: "جرنلسٹ؟"

"ہاں، پیپر والا جرنلسٹ۔" شوکت اور سلیم ایک ساتھ بولے۔

"ویری گریٹ،" ادھیڑ عمر، غیر دلچسپ حلیے والا بوہرہ منہ کھول کو ہنسا: "ویری گریٹ جرنلسٹ۔" وہ اس وقت خاصا مدہوش تھا۔ پہلے دو چار بار اس نے قریب سے گزرتے ہوئے بیرے کو متوجہ کرنے کی کوشش کی، پھر ایک دم جھنجھلا کر زور زور سے میز پر ہاتھ مارنے لگا۔

"سالا کیا گڑبڑ ہے ادھر؟" وہ چیخا: "بیرا ——"

بیرے کو اس نے تین بیئر اور ایک لائم جوس کا آرڈر دیا۔

"میں کھانا کھاؤں گا۔" شوکت نے کہا۔

"کھانا بھی کھائے گا۔" وہ بولا: "سالا وہ بھی کھائے گا بعد میں۔"

"ویری گریٹ سالا۔" شوکت نے اس کے کندھے پر دھپ جمایا: "ہا ہا۔"

بیرا جب آرڈر لے کر آیا تو کریم بھائی نے بیئر کا مگ اُٹھا کر منہ سے لگا لیا اور غٹ غٹ پینے لگا۔ شوکت اور سلیم اپنے اپنے مگوں کو تھامے بیٹھے رہے۔ جمیلہ لائم جوس کے چھوٹے چھوٹے گھونٹوں کے درمیان گہری نظروں سے شوکت کو دیکھتی رہی۔

"ایک عرصے سے تمھارا نام نہیں دیکھا۔" سلیم نے کہا۔

"ایک عرصے سے میں نے بھی اپنا نام نہیں دیکھا۔" وہ بولا: "حیرت ہے۔"

"لکھتے کیوں نہیں؟"

"کیا لکھوں؟" اس نے معصومیت سے سوال کیا

"سالا سوپ پھیلا ہے اِدھر۔" کریم بھائی پھر زور زور سے میز پر مُکّے مارنے لگا: "بیرا ـــــ"

بیرا کریم بھائی کا مگ دوبارہ بھر کرلے آیا۔ سلیم آہستہ سے (' ہاہ' کرکے، جیسے کتّا کبھی کبھی بے خیالی میں مختصر سی آواز نکالتا ہے) ہنسا۔

"میں نے ایک نظم لکھی ہے۔" اس نے کہا۔

"نظم لکھنا بھی بڑا مفید ہوتا ہے۔ یہ بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا صحت بنانا۔ مبارک ہو۔"

"سالا سوپ مرگیا ادھر۔" کریم بھائی پھر میز بجانے اور شور مچانے لگا: "سوپ مرگیا۔ سوپ مرگیا سالا۔" یہاں تک کہ بیرا بھاگتا ہوا آیا اور بھرا ہوا مگ اس کے سامنے رکھ گیا۔

"یہ دارُالخلافے کا کیا چکّر ہے؟" سلیم نے پوچھا۔

"دارالخلافے کو پہیے لگائے جارہے ہیں۔" وہ بولا۔

"اس؟"

"پہیے لگ جانے کے بعد پیٹرول ڈال کر ہانکا جائے گا اور ملکِ عدن کو لے جایا جائے گا۔"

"تم اب لکھتے کیوں نہیں شوکی؟"

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔" وہ بولا: "حیرت کی بات ہے۔"

"تمہاری وہ عجیب وغریب دل چسپ سکینڈلس تحریر دیکھنے کو آنکھیں ترس گئی ہیں۔"

"سلیم،" وہ پہلی بار سنجیدگی سے دلچسپی لے کر بولا: "مجھے اپنی نظم سناؤ۔"

سلیم ہنسا: "بس ایسی ہی ہے۔"

"نہیں سناؤ۔"

سلیم نے کھانس کر گلا صاف کیا اور ایک منٹ تک فضا میں دیکھتا رہا: "تو فلک فلک کا والی ــــ" پھر اس نے نرم آواز میں کہنا شروع کیا: "تو فلک فلک کا والی، میں زمیں زمیں کا مولا . . ." دیر تک وہ اپنی آواز میں کھویا ہوا نظم سناتا رہا۔

نظم سنتے ہوئے اس کے چہرے پر رنگ جھلک آیا اور وہ باہر کے منظر کو تقریباً بھول گیا۔ جب نظم ختم ہوئی اور کریم بھائی نے پھر شور مچانا شروع کیا تو اس کا چہرہ پھر بے رنگ ہوگیا اور سیاہ مایل آنکھیں ٹھہر گئیں اور وہ باہر دیکھنے لگا۔ کانچ کی سی ٹھیری ہوئی نظروں سے وہ کھڑکی سے باہر نیلے ریتیلے ساحل پر بھڑکیلے پھول دار لباسوں اور چمکیلے سفید بدنوں اور سیاہ چشموں اور جوڑے جوڑے ربنوں والے سٹرا ہیٹوں کو دیکھتا رہا۔ سب خاموش بیٹھے بیئر پیتے رہے۔ پھر سلیم اپنی جگہ پر کسمسایا۔

"شوکت:" وہ آگے جھک کر بے چینی سے بولا: "کیا کر رہے ہو آج کل؟"

"کچھ نہیں۔"

"لکھتے کیوں نہیں؟"

"کیا لکھوں؟" اس نے کہا: "اب کیا لکھوں؟"

چاروں خاموش بیٹھے رہے۔ کریم بھائی اب آدھی بیئر پیتا اور آدھی کپڑوں پر گراتا جا رہا تھا۔ جمیلہ نے اپنا گلاس میز کے وسط میں دھکیل دیا۔

"بڑا خوش گوار دن ہے۔" سلیم نے اُداسی سے دوہرایا۔

پھر انھوں نے چونک کر شوکت کو دیکھا جس کے چہرے پہ رنگ جھلک آیا تھا۔ وہ چمکتی ہوئی مسرور آنکھوں سے دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

"تم نے 'دِن' پڑھا ہے؟" اس نے کہا۔

"ایں؟"

"بڑی نازک چیز ہے۔"

"کیا؟"

"دِن۔"

"دِن کیا؟"

"وہ ناولٹ!" اس نے مختصراً کہا۔

سلیم اور جمیلہ انجان نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ اس کی آنکھوں میں پھر ٹھیری ہوئی سختی اُبھر آئی اور وہ باہر دیکھنے لگا جہاں فضا کا گدلا نیلا رنگ تھا۔

ہال کے وسط میں ایک بیرے کے ہاتھ سے پانی کا بھرا ہوا شیشے کا جگ پھسل کر گرا اور ٹوٹ کر دور دور بکھر گیا۔ دفعتاً کریم بھائی اپنے مگ پر مُنہ رکھ کر بچّوں کی طرح رونے لگا۔ سلیم بڑے اطمینان سے میز پر کہنیاں رکھے چند لمحے تک اسے مگ میں مُنہ ڈال کر روتے اور بڑبڑاتے ہوئے ("سالا ایک دم گھپلا کر دیا ——— سالا ڈوپ کر دیا میرے پرنس کو ——— سالا میرے پرنس کو ہو ہو ہو ———") دیکھتا رہا، پھر اسے بازو سے پکڑ کر اُٹھاتے ہوئے بولا: "چلو۔"

کریم بھائی مگ کو مُنہ سے چپکائے اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے ساتھ ساتھ چل پڑا۔

"چلو۔" سلیم نے جمیلہ سے کہا۔ وہ خاموش بیٹھی میز پر انگلیاں بجاتی رہی۔

"یہیں بیٹھو گی؟"

"ہاں۔"

"اچھا شوکی ——— پھر ملاقات ہوگی۔" سلیم آہستہ سے ہنسا: "میری بیوی کا خیال رکھنا۔ اسے تم سے عشق ہے۔" وہ روتے ہوئے کریم بھائی کو بازو سے پکڑ کر چلاتا ہوا کاؤنٹر کی طرف لے چلا۔

شوکت نے ٹھیری ہوئی نظروں سے جمیلہ کو دیکھا۔

"پرنس کو آج گولی مار دی گئی۔" وہ بولی۔

"پرنس؟"

"کریم بھائی کا بہترین گھوڑا تھا۔" وہ میز پر جھک کر بیٹھ گئی: "آج ریس میں لیڈ کر رہا تھا کہ ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ اس کی دونوں اگلی ٹانگیں ٹوٹ گئیں۔ انھوں نے اسی وقت اس کے دماغ میں گولی مار دی۔ بڑا خوبصورت جانور تھا۔"

وہ کرسی سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور اس کے چہرے پر ہلکا سا رنگ جھلک آیا۔ ایک بڑا واضح اور روشن منظر وہ تھا جب وہ ہائی سکول میں تھا اور صبح صبح سائیکل پہ سوار سکول کو جا رہا تھا کہ سامنے سے ایک خوبرو جوان ایک مُنہ زور گھوڑے

کی ننگی پیٹھ پر بیٹھا، چاروں پاؤں پر اسے بھگاتا ہوا نمودار ہوا۔ سڑک کے چوک میں پہنچ کر گھوڑا دفعتاً ہنہنایا اور پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا اور اس کے نعل ننھے قمقموں کی طرح ہوا میں کپکپانے لگے۔ اس نے سڑک کے کنارے اپنی سائیکل روک لی اور ایک پاؤں زمین پر ٹکا کر دیکھنے لگا۔ سوار کے چہرے پر ہراس کا نام تک نہ تھا۔ وہ دانت بھینچ کر وحشیانہ قوت کی خوشی کے زیرِ اثر جیسے ہنس رہا تھا اور رکابوں پر اُٹھا، باگوں سے لٹکا ہوا جیسے گھوڑے سے کشتی لڑ رہا تھا۔ کچھ دیر کے بعد اس نے گھوڑے کو قابو میں کر لیا۔ گھوڑے نے اگلے پاؤں زمین پر لا رکھے اور زور سے ہنہنایا اور صبح کی زرد دھوپ میں گرد کے لاکھوں ذرات اُڑاتا ہوا ایک طرف کو بھاگ گیا۔ گھوڑے کے کوچ کے اس منظر میں کوئی خاص بات نہ تھی، مگر اس وقت وہاں بیٹھے ہوئے (کھڑکی سے باہر گدلے نیلے رنگ کو چاروں طرف سے اُمڈتے ہوئے دیکھ کر) اس کو اس سفید براق گھوڑے کی چوڑی، پلی ہوئی پیٹھ کی اور اس پر بڑے اعتماد اور توازن سے جم کر بیٹھے ہوئے اور اس کی اُڑان کے ساتھ اُڑتے ہوئے سوار کی بڑی واضح اور روشن یاد آئی کہ دل اس زمانے میں بُراشہ زور اور سبک پا اسپِ تازی تھا۔

اب سلیم بڑی کوشش کے بعد بیرے کے مگ کو کریم بھائی کے منہ سے جدا کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ پھر وہ بل ادا کر کے اسے بازو سے پکڑے پکڑے باہر نکل گیا۔

"کیا پیو گی فاختہ؟" شوکت نے پوچھا۔

"لائم جوس۔"

شوکت نے بیرے کو اپنے لیے کھانا اور جمیلہ کے لیے ایک اور لائم جوس لانے کا آرڈر دیا۔

جب وہ کھانا کھا رہا تھا تو جمیلہ نے اپنے گلاس سے ایک چھوٹا سا گھونٹ بھرا اور آگے جھک کر بیٹھ گئی۔

"شوکی،" اس نے کہا، "تم ریاض سے ملے تھے؟"

"نہیں۔"

"کیوں؟"

وہ خاموشی اور تندی سے کھاتا رہا۔

"تم نے وعدہ کیا تھا شوکی۔"

"کیا؟"

"کہ ایک بار اس سے ضرور ملو گے۔"

اس نے ناچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا اور بولا: "کب کیا تھا؟"

"کب کیا تھا!" وہ ہاتھ جھٹک کر مایوسی اور بے یقینی سے بولی: "ایک ہفتہ پہلے کی بات کو تم بھول بھی گئے ہو؟"

"نہیں تو۔"

"اوہ شوکی،" وہ مایوسی سے سر ہلا کر بولی: "اب تم جھوٹ بھی بولنے لگے ہو۔"

"جھوٹ بولنا کوئی مشکل کام نہیں!" وہ دوبارہ کھانے لگا۔

"شوکی ——" جمیلہ اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر بولی: "چلو مان لیا کہ تم نے —— میری بات سنو شوکت۔"

"سُن رہا ہوں فاختہ۔"

"ایک بار تو کم از کم ——" اس نے ڈرتے ڈرتے اس کے کندھے کو چھوا: "کم از کم بات تو کر کے دیکھو۔ مجھے یقین ہے کہ تم اسے راضی کر سکتے ہو۔ صرف ایک بار شوکی۔" وہ بولی: "میری خاطر۔"

"تمھاری خاطر میں کیا کیا کرتا پھروں بھئی؟"

"میری خاطر!" وہ پھٹ پڑی: "میری خاطر تم نے کیا کیا ہے؟ ہاں کیا کیا ہے؟ کبھی بھی۔"

وہ ہاتھ روک کر اسے دیکھنے لگا۔ یہ ایک اور سنہرے زرد رنگ کا چہرہ تھا جو جی کو اچھا لگتا تھا۔ وہ کئی سال تک کالج اور یونیورسٹی میں ساتھ ساتھ رہے تھے اور اس لڑکی نے ٹوٹ کر اس سے محبت کی تھی مگر کبھی منہ سے نہ بولی تھی۔ (وہ ان لڑکیوں میں سے تھی جو چپکے ہی چپکے محبت کر کے اپنی تکمیل کر لیتی ہیں اور پھر عمر بھر اسی قوت کے سہارے خوش رہتی ہیں۔) وہ سب جانتا تھا مگر کبھی اس کی طرف راغب نہ ہوا تھا کہ اس لڑکی میں اس کے لیے کوئی کشش نہ تھی۔ وہ اس کے لیے کچھ بھی نہ کر سکا تھا۔ اب اس کا اجلے زرد رنگ کا چہرہ جی کو بڑا اچھا لگتا تھا بہرحال۔

وہ کھانا ختم کر کے اٹھ کھڑا ہوا: "اچھا" اس نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا: "چلو۔"

وہ باہر نکل آئے۔

"شوکی،" فٹ پاتھ پر اس کے ساتھ ساتھ چلنے کی کوشش کرتے ہوئے وہ بولی: "بھئی آہستہ چلو۔"

تھوڑی دیر کے بعد وہ "روزنامہ . . ." کی سات منزلہ مہیب عمارت میں داخل ہوئے۔ وسیع ہال میں ہر طرف اخباروں کے ترتیب وار ڈھیر لگے ہوئے تھے اور پیکر لڑکے پھرتی سے ہاتھ چلاتے ہوئے انھیں چھوٹے چھوٹے بنڈلوں میں باندھ رہے تھے۔ تہہ خانے سے پریس کی مشینوں کے چلنے کی گڑگڑاہٹ سنائی دے رہی تھی۔ سب جگہ پر نیوز پرنٹ کی مخصوص بو رکی ہوئی تھی۔ وہ لفٹ پر سوار ہو کر چوتھی منزل پر جا اترے۔ برآمدوں اور گیلریوں میں چشموں والے مرد بریف کیس اٹھائے ادھر ادھر آجا رہے تھے، کھڑے باتیں کر رہے تھے اور پسینہ پونچھ رہے تھے۔

"ہلو سر۔" ایک رپورٹر اپنے ساتھی سے باتیں کرنا چھوڑ کر اس کی طرف بڑھا۔

"ہلو۔" وہ ناآشنا نظروں سے اسے دیکھتا ہوا آگے نکل گیا۔

"کون ہے؟" رپورٹر کے ساتھی نے پوچھا۔

"تم نہیں جانتے؟" وہ حیران ہو کر بولا: "شوکت محمود۔"

"ارے!" دوسرا رپورٹر چونک پڑا: "تو یہ، شوکت محمود ہے۔"

"ہاں، جدید رپورٹنگ کا بانی۔" پہلا طنز سے ہنسا: "غرور سے آسمان پر چڑھتا جا رہا ہے۔"

"مگر انور،" دوسرے نے کہا: "تم نے اس کی بنگال کی رپورٹیں پڑھی ہیں؟"

"ارے ہاں بھئی۔" انور نے اکتا کر کہا: "بہت کچھ پڑھا ہے۔"

"بڑے عرصے سے میری اس سے ملنے کی خواہش ہے۔" دوسرے نے کہا: "اب بہت کم لکھتا ہے مگر۔"

"اب بڑا آدمی بن گیا ہے۔"

"یہ اس کی بیوی ہے؟"

"ارے نہیں بھئی۔ اس کی بیوی تو،" انور نے انگوٹھا اور درمیانی انگلی ملا کر، ایک آنکھ بھینچ کر ہلکی سی سیٹی بجائی: "اے ون ہے اے ون!"

وہ جمیلہ کے ساتھ چلتا ہوا اس دروازے کے سامنے جا رکا جس پر "مینیجنگ ڈائرکٹر" کا بورڈ لگا تھا۔

"چلو۔" اس نے کہا۔

"نہیں تم جاؤ، میں اس کی سیکرٹری کے پاس بیٹھتی ہوں۔ اور شوکی،" وہ ملتجیانہ لہجے میں بولی: "پورے دل سے

کوشش کرنا۔ میری دعائیں تمھارے ساتھ ہیں۔"

"وی فار وکٹری۔" اس نے کہا اور دروازہ کھول کر ریاض کے ایئر کنڈیشنڈ دفتر میں داخل ہوا۔ ریاض میز پر جھکا سیاہ فریم کا پڑھنے والا چشمہ لگائے سفید کاغذ پر کچھ لکھ رہا تھا۔ وہ کرسی کھینچ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

"ہلو۔" ریاض نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور چشمہ اُتار کر میز کے شیشے پر رکھ دیا۔ پھر اس نے کرسی سے ٹیک لگا کر لمبا سانس چھوڑا اور اپنائیت سے بولا: "ہلو شوکی۔"

"ہلو ریاض۔" اس کی بے مقصد نظروں نے آفس کی دیواروں کا جائزہ لیا جہاں بڑی بڑی فریم شدہ تصویریں لٹک رہی تھیں۔

"بہت دنوں کے بعد نظر آئے ہو۔" ریاض نے کہا۔

"تم بھی تو دکھائی نہیں دیے۔"

"ہاہا۔" ریاض ہنسا: "میں تو یہیں پر تھا۔"

"ہاہا۔ گو میں بھی یہیں تھا۔"

ریاض نے بڑی فراغت سے پائپ میں تمباکو بھرا اور اسے سلگا کر ہلکے ہلکے کش لینے لگا۔

"کیسے رہے؟" پھر اس نے پوچھا۔

"اے ون۔" اس نے کہا۔

"جال آئی تھی۔"

"کب؟"

"آج سویرے۔" ریاض نے کہا: "اسے سروس مل گئی ہے۔"

"کہاں؟"

"وہیں کالج میں۔"

"کچھ دبلے نظر آ رہے ہو ریاض۔"

"میں؟" ریاض ہلکی سی پریشانی سے ہنسا: "نہیں تو۔ ذرا کام کا بڑا رش رہا پچھلے دنوں۔"

"بہت محنت کرنے لگے ہو۔"

"ہاہ۔"

"ریاض ــــــ" وہ کرسی پر کسمسایا اور میز پر کہنیاں رکھ کر بیٹھ گیا۔

"سکیم سے شروع کر رہی ہے۔" ریاض نے کہا: "گو ابھی عارضی طور پر۔ . . ."

"ریاض!" اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا، "میں کام کے لیے آیا تھا۔"

وہیں بیٹھے بیٹھے، آنکھ جھپکے بغیر ریاض کی نظریں جیسے بہت دُور اندر کو سمٹ گئیں۔ وہ دیوار پر لٹکی ہوئی ایک پینٹنگ کو گھورنے لگا۔

"یہ پینٹنگ میں نے صادقین سے آج ہی خریدی ہے۔" اس نے کہا: "کیسی ہے؟"

"اے ون۔"

ریاض اُٹھ کھڑا ہوا: "اب میں اس سے میورلز بنوا رہا ہوں یہاں۔" اس نے دائیں بازو کی دیوار کی طرف اشارہ کیا:

"کیا خیال ہے؟"

"ریاض،" وہ جلدی سے کھڑا ہوتا ہوا بولا: "مَیں کام کی تلاش میں آیا ہوں۔"

"کام؟" ریاض نے جیسے پہلی بار سُنا اور وہ چونک کر ہنسا۔ "بیٹھ جاؤ شوکی۔ کام کی تمھیں کمی ہے؟" وہ چپکے سے بیٹھ گیا۔

"تم تو بڑے نامور آدمی ہو۔" ریاض پھر بولا: "تمھارے قلم کی تو بڑی قیمت ہے ——— یا کم از کم ہوا کرتی تھی۔"

"قیمت مائی فٹ۔" اس نے کہا: "صرف تمھارے اخبار میں تھوڑی سی جگہ مانگنے آیا ہوں۔"

"تم تو ہمارے سٹار کارسپانڈنٹ تھے شوکی۔" ریاض اُداسی سے بولا: "تم خود ہی ہمیں چھوڑ گئے تھے۔"

"سٹار کارسپانڈنٹ مائی فٹ۔"

"پھر تم نے کہا کہ مُلک کا کوئی بھی اخبار تم سے لکھوانا اپنے لیے فخر سمجھے گا، اور تم ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔"

"اچھا اچھا۔" وہ بیک وقت ہنستا اور غصّے سے لرزتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا: "ٹھیک ہے۔ میں نے اپنے قلم پر ناز کیا اور منہ کی کھائی۔ ٹھیک ہے۔ مگر اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ میرا ناز غلط تھا۔ اس سے تمھی لوگوں کی ——— جرنلزم کے خداؤں کی جہالت کا علم ہوتا ہے۔"

"بیٹھ جاؤ شوکی۔" ریاض نے نرمی سے کہا: "کون کہتا ہے تمھارا ناز غلط تھا۔ آج بھی اگر تم چاہو تو فرسٹ ریٹ رپورٹنگ کر سکتے ہو۔ صرف اگر تم اپنے احمقانہ خیالات کو . . ."

"فرسٹ ریٹ؟" وہ چیخا: "یہ فرسٹ ریٹ رپورٹنگ ہے؟ یہ جو تم کر رہے ہو یا کروا رہے ہو یا جو مَیں کرتا رہا ہوں؟ یہ تھرڈ ریٹ سنسنی خیزی؟ یہ سیکنڈ ریٹ فکشن؟ فرسٹ ریٹ رپورٹنگ تم نے دیکھی ہی نہیں ریاض۔"

"مَیں دُنیا بھر کی اخبار پڑھتا ہوں شوکت۔ اگر نہ بھی پڑھوں تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جرنلزم ایک بزنس ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں اس بزنس کو آرٹ بنانا چاہتا ہوں۔ میں جرنلزم کو اوپر اُٹھانا چاہتا ہوں۔ اس سطح پر لانا چاہتا ہوں جہاں لکھنے والے میں اور پڑھنے والے میں براہِ راست تعلق قایم ہوتا ہے، جہاں دونوں فریق عمومیت کی زہریلی فضا سے نکل کر آزادی اور ذہانت سے ایک دوسرے کے ساتھ گفتگو کر سکیں، جہاں وہ ایک تہذیب یافتہ قوم نہیں۔ یہ احمقانہ خیالات ہیں؟"

ریاض کے 'انٹر کام' پر چھوٹا سا بلب روشن ہوا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر سوئچ آن کیا تو اس کی سیکرٹری کی آواز آئی:

"پروفیسر شریف تشریف لائے ہیں۔"

"پانچ منٹ۔" ریاض نے جلدی سے کہا اور سوئچ آف کر دیا۔ پھر اس نے جھک کر میز کی نچلی دراز سے کاغذوں کا ایک پلندہ، جس پر گرد کی ہلکی سی تہہ جمی تھی، نکالا اور میز پر رکھ دیا۔ جب وہ بولا تو اس کی آواز میں ہلکی سی اکتاہٹ تھی:

"آج سے ٹھیک ایک برس پہلے ہم اس مسئلے پر بحث کر چکے ہیں، تمھیں یاد ہو گا۔" اس نے کہا: "اب اسے دوہرانے سے کوئی فائدہ نہیں، تمھارے مضمون،" اس نے پلندے کی طرف اشارہ کیا: "ایک سال سے میرے پاس پڑے ہیں اور میں انھیں چھاپنے کی جُرأت نہیں کر سکا۔ مجھے ادب سے زیادہ واقفیت نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ اچھا ادب ہو، مگر یہ اچھی جرنلزم نہیں، میں جانتا ہوں۔ تمھارے پاس ٹیلنٹ ہے شوکت، میں مانتا ہوں۔ مگر تمھیں بزنس کی کوئی سمجھ نہیں۔ میں تم پر کوئی الزام نہیں لگا رہا، صرف اپنی پوزیشن واضح کر رہا ہوں۔ پبلک جو کچھ مانگتی ہے ہم اسے وہی کچھ مہیا کرنے پر پابند ہیں۔ جرنلزم اسے ہی کہتے ہیں، دنیا بھر میں۔"

"ریاض،" وہ ایک دم گڑگڑا اُٹھا: "مجھے ایک چانس دو۔ صرف ایک۔ مجھے یقین ہے کہ میں جرنلزم میں انقلاب لا سکتا ہوں۔ مجھے بزنس کی سمجھ نہیں ہے، مگر میں پبلک کو سمجھتا ہوں۔ پبلک اتنی بُری نہیں جتنی ہم نے بنا رکھی ہے۔ پبلک کی عادات کو ہم لوگ ہی بناتے اور بگاڑتے ہیں۔ آج نہیں تو چھ ماہ کے بعد، ایک سال کے بعد پھر میری وہی ریڈرشپ ہو گی جو پہلے کبھی تھی۔ میں اس بات کی گارنٹی دیتا ہوں۔"

"ایک بات بتاؤ شوکی۔" ریاض نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا: "یہ دیوانگی آخر کس نے تمھارے دل میں ڈالی ہے؟"

"دیوانگی؟"

"یہ آرٹ وارٹ کا چکر۔"

"اس بات کو چھوڑو۔"

"یہ اچھا بھلا لکھتے لکھتے ایک دم تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ ڈھنگ سے کچھ لکھ کر ہی نہیں دیتے؟"

"تمھیں پتا ہے ریاض کہ ہماری جرنلزم کو اس وقت تھوڑے سے تخیل کی کس قدر ضرورت ہے؟ کہ آج کی عوامی زندگی کی رپورٹنگ میں اور سٹاک ایکسچینج رپورٹ میں کوئی فرق نہیں رہا؟ کہ ہم نے رائے عامہ کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے؟"

ریاض خاموشی سے پائپ بھرتا رہا۔

"میں کوئی بھاری معاوضہ نہیں مانگتا۔ میں اپنے کیریئر کو بالکل نئے سرے سے شروع کرنے پر راضی ہوں۔ تم آہستہ آہستہ میری قیمت بڑھا سکتے ہو۔ بہت آہستہ آہستہ ریاض۔ مجھے ایک چانس دو۔"

"میں یہ رسک نہیں لے سکتا بھئی۔" وہ اچانک اُکتا کر بولا: "ایسا مواد پبلک کو مہیا کر کے ہم بزنس میں نہیں ٹھہر سکتے۔ میں دو پیچے اور خرید رہا ہوں، کچھ اور بھی فیچر بڑھا رہا ہوں۔ تمھارے لیے ایسے ایسے دیوانے تجربے نہیں کر سکتا۔ آج مارکیٹ میں کمپیٹیشن کتنا ہے۔ ایک بار پیپر بیٹھ جائے تو برسوں کوئی نہیں پوچھتا۔ تمھارے سامنے کئی مثالیں ہیں۔"

"تم پچھلی باتوں کو نہیں بھولے ریاض۔" وہ بھڑک اُٹھا، پھر فوراً ہی کرسی پر آگے ہو کر بیٹھ گیا اور ملتجیانہ لہجے میں بولا: "مگر ریاض، کبھی ہم —— ہم کبھی دوست بھی تھے۔ یاد ہے؟ میں نے تین راتیں جاگ کر تمھارے لیے وہ نوٹ میگزین میں لکھا تھا۔ یاد ہے؟ میں کئی ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جنھیں آج بھی وہ نوٹ حرف بہ حرف یاد ہے۔ مجھے آج بھی وہ دن اچھی طرح سے یاد ہیں، ابھی جیسے کل ہی کی بات ہے کہ تمھارا کیتانی کا چکر چلا تھا اور تم میرے پاس آئے تھے کہ 'شوکی، پالیٹکس چل پڑی ہے، اوپر کچھ لوگ اشرف کو سپورٹ کر رہے ہیں۔' تو میں نے کہا تھا: 'کوئی بات نہیں ریاض، ایسا ہے تو ہم بھی پالیٹکس چلائیں گے۔' اور پھر میں نے میگزین میں اور ٹیم میں اور اندر اور باہر —— یاد ہے؟ میں نے۔ ۔ ۔"

"شوکت میرا خیال ہے تم تھوڑے سے دیوانے ہوتے جا رہے ہو۔" ریاض کا چہرہ دبے ہوئے غصّے سے لال ہو گیا۔ "میری بات سنو۔ میں تمھیں کچھ ایڈوانس دے دیتا ہوں۔ کچھ عرصے کے لیے شہر سے باہر کسی خاموش مقام پر چلے جاؤ۔ اپنی صحت کا خیال کرو اور ٹھنڈے دل سے اپنے کام کے بارے میں سوچو۔" اس نے جیب سے سیاہ، نفیس چمڑے کا بھاری بٹوہ نکالا۔ پھر اس میں سے سو سو کے دس نوٹ گن کر نکالے اور انھیں میز کے شیشے پر رکھ کر اس کی طرف دھکیل دیا۔ پھر اس نے چونک کر اس کے سُرخ ہوتے ہوئے چہرے اور کانپتے ہوئے ہونٹوں کو دیکھا اور جلدی سے بولا: "کچھ اور مت سمجھو —— یہ ایڈوانس۔ ۔ ۔"

شوکت کے ہونٹوں سے اُبلتی ہوئی گالی نکلی اور وہ ایک جھٹکے سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اسی تیزی سے ریاض نے 'انٹرکام' کا سوئچ آن کیا اور بولا: "پروفیسر صاحب کو آنے دو۔"

"یس سر" اس کی سیکرٹری کی آواز آئی۔ پھر ریاض اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے بولا:
"میرے دوست مجھ سے بغیر اپوائنٹمنٹ کے بھی مل سکتے ہیں، مگر جن سے میری اپوائنٹمنٹ ہو ان سے ملنا میں ضروری سمجھتا ہوں۔"

دروازہ کھلا اور ادھیڑ عمر کا پروفیسر اندر داخل ہوا۔ اس کے پیچھے پیچھے جمیلہ تھی۔ اسے دیکھ کر ریاض ایک لحظے کے لیے چونکا، پھر بے خبر بن گیا اور ہاتھ پھیلا کر پروفیسر کی طرف بڑھا۔
"آئیے پروفیسر صاحب، آئیے۔"
شوکت چند منٹ تک اسی طرح مٹھیاں کسے، دانت پیسے، آنکھیں خون کیے، جیسے جست بھرنے کے لیے تیار، کھڑا رہا۔ پھر جمیلہ کی انگلیوں کو اپنے بازو پر محسوس کر کے یکلخت ڈھیلا پڑ گیا، جیسے بہت سارا خون اس کے بدن سے شرشر کرتا ہوا نکل گیا ہو۔ اس کی آنکھیں ماند پڑ گئیں اور وہ سر جھکا کر جمیلہ کے پیچھے پیچھے ریاض کے دفتر سے نکل آیا۔
باقی کا رستہ انھوں نے خاموشی سے طے کیا۔ بس میں بیٹھا وہ ٹھیری ہوئی نظروں سے باہر کے اڑتے ہوئے منظر کو دیکھتا رہا۔ فلیٹ میں پہنچ کر وہ سیدھا چارپائی پر بیٹھ گیا۔ جمیلہ کھڑکی میں کھڑی سڑک پر بھاگتی ہوئی موٹر گاڑیوں کو دیکھتی رہی۔ پھر وہ اس کے پاس چارپائی پر آ کر بیٹھ گئی۔

اس نے خاموشی اور تندی سے کئی بار اس کو چوما، پھر اس کی کمر پر ہاتھ دھرے دھرے لیٹ گیا۔
بعد میں وہ دیر تک چارپائی کے پاس کھڑی اسے نیند میں گہرے سانس لیتے ہوئے دیکھتی رہی۔ اس کی گدلے شیشے کی سی آنکھیں نیم وا تھیں اور وہ منہ کھولے بے خبر سو رہا تھا، اور اس کا سنگ مرمر کا سا سفید اور نازک اور قوی بدن، گول گول ابھرے ہوئے شانوں والا اور لمبے لمبے پتلے بازوؤں والا اور سنہرے بالوں سے ڈھکے ہوئے فراخ سینے والا اور ہموار پیٹ اور تنگ کولہوں والا اور پھڑکتے ہوئے مضبوط پٹھوں والا اور گٹھیلی دار گول رانوں والا اور لمبی پنڈلیوں والا، مغرور اور محبوب بدن بے دم ہوا پڑا تھا۔
وہ چارپائی کو پکڑ کر زمین پر بیٹھ گئی اور آہستہ آہستہ رونے لگی۔
کچھ دیر کے بعد اس نے اٹھ کر دیوار پر لٹکتے ہوئے شیشے میں اپنے بالوں اور چہرے کو درست کیا اور آہستہ سے فلیٹ کا دروازہ بھیڑ کر باہر نکل گئی۔

جب وہ اٹھا تو دھوپ ڈھل رہی تھی۔ اس کے ماتھے پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے ابھر آئے تھے۔ ایک بڑی سی سبز رنگ کی مکھی روشن دان کے شیشوں پر مستقل سر مار رہی تھی۔ وہ سیدھا لیٹا اس کے پروں کی یکساں اداس بھنبھناہٹ کو سنتا اور کمرے میں پھیلے ہوئے سہ پہر کے اجالے کو دیکھتا رہا۔ پھر وہ اٹھ کر کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ نیچے سڑک پر موٹر گاڑیاں نیلے دھوئیں کے غبار چھوڑتی ہوئی اڑی جا رہی تھیں۔ فٹ پاتھ پر لوگ تیز تیز چل رہے تھے۔ کبھی کبھی وہ دو دو سے ایک دوسرے کو پہچان کر ہاتھ ہلاتے اور بے دلی سے ہنس کر گزر جاتے۔ ایک بھاری بدن کی بڑھیا ایک بچے کو انگلی سے لگائے اسے ہجوم سے بچاتی ہوئی کبھی اس سے اور کبھی اپنے آپ سے باتیں کرتی ہوئی گزر رہی تھی۔ ایک بس آ کر رکی۔ اترنے والے چھلانگیں لگا لگا کر اترے اور اپنے اپنے راستوں پر بڑھ گئے۔ چڑھنے والوں نے لائن بنائی، پھر ان میں یکلخت کھلبلی مچ گئی اور وہ ایک دوسرے کو دھکیلتے، کوستے اور پھلانگتے ہوئے بس میں سوار ہونے لگے۔ ایک گداگر عورت، جو باری باری ہر ایک کے آگے ہاتھ پھیلا رہی تھی، ان کے نرغے میں آ گئی اور دھکے کھانے لگی۔ ایک کتا بے خیالی سے سڑک پار کرنے لگا۔ پھر بس شور مچاتی اور دھوئیں کے بادل اڑاتی ہوئی چل پڑی۔ اس کے منہ میں پیلی بدمزگی پھیلنے لگی۔
"پیسہ!" وہ انتہائی بددلی سے بولا: "پیسہ!!"

پھر وہ چند لوگوں کو چونکتے اور غور سے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پاکر کھڑکی سے ہٹ آیا۔ اس نے بدمزگی سے اپنے آپ پر نظر ڈالی اور کپڑے پہننے لگا۔ پھر وہ فلیٹ کا دروازہ کھلا چھوڑ کر باہر نکل آیا۔

فٹ پاتھ پر گداگر عورت نے اس کے آگے ہاتھ پھیلایا۔ ڈھلتی ہوئی زرد دھوپ میں فلیٹوں کی عمارتوں کے سائے سڑک کے آر پار لیٹے ہوئے تھے۔ زرد ساری پہنے ایک جوان عورت لہرا کر چلتی ہوئی اس کے پاس سے گزری جو آنکھوں کو بڑی بھلی لگی۔ پھر ٹھیری ہوئی نظروں میں حرکت پیدا ہوئی اور اس نے رُک کر، پیچھے مڑکر اس عورت کو دیکھا جو چھوٹے چھوٹے قدم دھرتی، بازو ہلاتی، بڑی حیا سے سینہ اٹھائے، کمر لہراتی ہوئی ماضی کی مانند پرے چلی جا رہی تھی اور جی کو بڑی ہی اچھی لگ رہی تھی۔ جب وہ اپنے فلیٹ میں گھس گئی تو وہ پھر منہ اٹھا کر ایک طرف کو چلنے لگا۔ ہاں، چند سال تک وہ بہت ہی خوش رہا تھا، اس نے سوچا۔ جمال کو پالینے کے بعد چند سال تک اسے ہوش ہی آیا تھا۔ اپنے آپ کو اس کے قابل ثابت کرنے کے لیے اس سے جو بھی ہو سکا اس نے کیا تھا۔ اس نے مبالغہ آمیز سنسنی خیز رپورٹنگ کی بہترین شکل ایجاد کی تھی اور ملک بھر میں مشہور ہو گیا تھا۔ اس کا روزانہ کالم ملک کے سب سے بڑے اخبار میں چھپتا تھا اور اس کی مجموعی ریڈر شپ ایک لاکھ کے تخمینے میں تھی۔ بڑے بڑے عالی شان ایڈیٹر ہاتھ پھیلائے اس کے پیچھے پیچھے پھرتے تھے اور وہ سیدھے منہ ان سے بات نہ کرتا تھا۔ اس وقت وہ ایک شاندار فلیٹ میں رہتے تھے جسے جمال نے قدیم سپینش فرنیچر اور قرمزی رنگ کی دبیز انگلش وِلٹن کی ڈیری سے آراستہ کیا تھا جس کے کچن میں چھ فٹ اونچا تین فٹ چوڑا ریفریجریٹر تھا اور جمال بڑی شان سے سٹول پر بیٹھ کر بجلی کے چولھے پر سٹین لیس سٹیل کے برتنوں میں کھانا پکاتی تھی (ایک سال کے مختصر عرصے میں یہ سب کیسے ہوا ہو گیا! ؟) جس کے سفید ٹیلیفون کی گھنٹی دن رات بجا کرتی تھی اور وہ ڈرائنگ ٹیبل پر جھکا، ریسیور اٹھا کر بڑے اعتماد سے، بڑے مصروفیت کے لہجے میں بات کیا کرتا تھا۔ ہاں، چند سال تک وہ بہت خوش رہا تھا۔ اس لیے کہ یہ سب کچھ وہ جمال کی خاطر کر رہا تھا، جمال ——— (ایک بہت پرانا، جگمگاتا ہوا منظر اس کی آنکھوں میں اُبھرا: اپریل کے آخری دن تھے اور بہار کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ فائنل کے امتحان سے فارغ ہو کر جمال نے اپنے گھر پر سب دوستوں کو چائے کی دعوت دی تھی۔ ان کے باغ میں بلند قامت سفیدے کے درخت پُرسکوت کھڑے تھے اور سنہری سہ پہر پہ بدلتے ہوئے موسم کا جادو چپ چاپ چل چکا تھا۔ اور اندر وہ دوستوں کے جھرمٹ میں بڑے اطمینان سے چل پھر رہی تھی۔ اپنے بڑے سے ڈرائنگ روم کے جس کونے میں وہ پہنچتی "جمال ——— جمال" کی مانوس آوازیں اُبھرتیں اور نوجوان مسرور قہقہے بلند ہوتے اور یوں اس خاص مقام پہ اس کی موجودگی کی ہر ایک کو خبر ہوتی۔ ایک ایک لڑکے کو، جو اس روز اس تقریب پہ مدعو تھا، اس بات کا علم تھا کہ وہ شوکت کی تھی اور شوکت اس کا تھا مگر اس کے باوجود حسد کا جذبہ ناپید تھا۔ وہ سب اسی بے راز ہنسی میں گھلے ہوئے تھے جو جمال کا حصہ تھی اور مکمل طور پر خوش اور مطمئن تھے، اس لیے کہ جب وہ چلتی تھی تو کمرے کی ساری آرائش ہوا کی طرح اس کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی معلوم ہوتی تھی اور جب وہ کسی کے سامنے رُک کر کوئی معمولی سی بات کرتی تھی تو اس شخص کے پاس جیسے زندگی کا سارا سہج اور سبھاؤ چلا آتا تھا اور اپنے ساتھ کاملیت کا وہ احساس لاتا تھا جو دل میں سرور اور ٹھیراؤ پیدا کرتا ہے، اس لیے کہ وہ ایک ایسی لڑکی تھی جسے اپنی شخصیت کی تکمیل کے لیے کسی مرد سے محبت کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ صرف مرد اس سے بات کر کے، اس سے دوستی کا دم بھر کے اپنی تکمیل کرتے تھے۔ آخیر اپریل کی اس زریں سہ پہر کو چائے کی پیالی ہاتھ میں تھامے، کھڑکی کے پاس اکیلے کھڑے کھڑے اس نے حیرت سے اس سارے منظر کو دیکھا تھا اور اس پر وہ لمحہ آیا تھا ——— وہ بے مثال اور لافانی لمحہ جب میں اس نے پہلی بار اس لڑکی کے وجود کی اصل موسیقی کو محسوس کیا تھا، اس کی اصل مٹی کو، اس کے تار و پود کی اصل بُنتر کو جسے بجلی کے ایک چمکارے میں دیکھ لیا تھا اور اس نے سوچا تھا کہ وہ ان لڑکیوں میں سے تھی جو نوجوانوں کے خوابوں میں بسا کرتی ہیں اور کبھی کبھار ہی دیکھنے میں آتی ہیں، اور جب دیکھنے میں

آتی ہیں تو چاہے دور ہوں چاہے قریب ہوں چاہے کسی اور کی ملکیت ہوں اپنی طبیعت کے تپاک سے اور اپنے جذبے کی حرارت سے اور اپنی اندرونی دمک سے اور دل سوزی سے اور اپنے ذہن کی بنیادی سادگی کی وجہ سے عمر بھر کی یاد بن جاتی ہیں۔ وہ عورتیں جو درحقیقت کسی ایک کی ملکیت نہیں ہوتیں بلکہ دُنیا بھر کے مردوں کی مجموعی جمالیاتی جائیداد ہوتی ہیں —— وہ جگمگاتا ہوا لمحہ آج بھی اس کے ذہن میں روشن تھا) —— یہ سب کچھ وہ جمال کی خاطر کر رہا تھا جو اب اس کی بیوی تھی اور وہ دُنیا کا خوش قسمت ترین شخص تھا۔

اسی زمانے میں ریاض کہیں سے شہر میں آن وارد ہوا تھا۔ وہ بنگال کے دورے سے لوٹا تو اس نے ریاض کو اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے پایا۔ وہ پرانے دوستوں کی طرح، سب کچھ بھول بھلا کر، تپاک اور گرمجوشی سے ملے۔ اس نے دیکھا کہ ریاض اب کافی سنجیدہ ہو چکا تھا اور اس کے لب و لہجہ میں ہلکی سی اُداسی کی جھلک تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ ایک روزنامہ خرید رہا ہے اور اس میں تازہ خون ڈال کر اسے شہر کا سب سے بڑا اخبار بنا دینا چاہتا ہے، جس کے لیے اسے شوکت کی مدد کی بھی شاید ضرورت پڑے گی۔ اس نے اسے ہر ممکن تعاون کا یقین دلایا اور دیر تک پُرانے وقتوں کی باتیں کرتے رہے۔ اس کے بعد اس نے باقاعدگی سے ریاض کے اخبار کے لیے لکھنا شروع کر دیا۔ چنانچہ ایک ہی سال کے اندر اندر وہ شہر کے تین بڑے روزناموں میں شمار کیا جانے لگا۔ اب ریاض نے اخبارات کی ایک لڑی بنانے کا فیصلہ کیا اور آغاز کے طور پر ایک ہفت روزہ اور ایک پندرہ روزہ پرچہ نکالا۔ یہ دونوں پرچے بھی بڑے کامیاب ثابت ہوئے۔ ان دنوں میں ان دونوں پر ایک بار پھر دلوں کی ہمسائیگی کا وہ مختصر سا دَور آیا تھا جو بہت پہلے کی یاد دلاتا تھا۔ ہاں، چند سال تک وہ بہت ہی خوش رہا تھا۔

مگر ان دنوں میں ہی فضا کے سنہرے زرد رنگ میں ہلکے نیلے رنگ کی آمیزش شروع ہو گئی تھی۔ گو ان دنوں میں اسے پتا بھی نہ چلا تھا، مگر اب یاد کرتا تھا تو بڑا صاف یاد آتا تھا —— وہ وجود کے ثابت و سالم ہونے کا ایک طرح کا احساس، وہ ساری شخصیت کے یک جا او مکمل اور بھرے پُرے ہونے کا احساس جو لڑکپن میں کبھی وضو کر کے نماز پڑھنے کے بعد (نماز کے دوران میں نہیں، بعد میں) ہوا کرتا تھا اور اس وقت تک رہتا تھا جب تک کہ وضو کسی نہ کسی طرح ٹوٹ نہ جاتا تھا اور جو اوائلِ جوانی کے زمانے میں اس وقت اور صرف اس وقت ہوتا تھا جب کہ وہ کہانی لکھتا تھا۔ اور بخیر و خوبی اسے ختم کر لیتا تھا، وہ وجود کے ثابت و سالم ہونے کا احساس جو بدن میں بڑا سکون اور بڑی قوت پیدا کرتا تھا اب نہیں رہا تھا۔ اور وہ ہمیشہ اسے ملتوی کرتا آیا تھا۔ وہ کامیابی کے راستے پر تیزی سے بڑھتا جا رہا تھا، اور کبھی کبھی جب دل کے اس بوجھ کو محسوس کر کے ٹھٹک کر رک جاتا اور اخبار کی رپورٹ کو ادھورا چھوڑ کر قلم میز پر رکھ دیتا اور کرسی سے ٹیک لگا کر سینے کو صاف کرنے کی خاطر اس سنہرے زرد رنگ کو یاد کرتا اور اس نادر و نایاب احساس کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے کہانی لکھنے کا ارادہ کرتا تو فوراً اسے (غیر شعوری طور پر) جرنلزم میں اپنی اونچی (چنانچہ اتنی ہی نازک) حیثیت کا اور اپنے اعلیٰ معیارِ زندگی کا خیال آجاتا اور ساتھ ہی اسے وقت کی کمی کا احساس ہوتا اور وہ ہمیشہ ٹھنڈی سانس بھر کر کہتا: "اچھا، اس کے بعد سہی"۔ اور قلم اٹھا کر رپورٹ پر جھک جاتا۔ یوں ہمیشہ وہ اس کام کو کسی انجانے مستقبل پر اٹھا کر رکھتا رہا تھا۔ کتنی ہی بار، کتنے ہی ایسے چمکتے دمکتے ہوئے روشن خیالات کو اس نے ذہن کے کونوں کھدروں میں دبا دیا تھا، اس خیال سے کہ مستقبل قریب میں معقول مالی فراغت حاصل کر لینے کے بعد جب وہ اس قابلِ لذت کام کو چھوڑ دے گا (یا بہت کم کر دے گا) اور اسے بہت سا فالتو وقت ملے گا تو وہ دل جمعی اور سکون کے ساتھ اپنے ان سارے ٹمٹماتے ہوئے روشن ستاروں کو ایک خوبصورت لڑی میں پرو دے گا اور اس کھوئے ہوئے حیات بخش احساس کو دوبارہ حاصل

کرلے گا۔ وہ وقت کبھی نہ آیا تھا۔

وہ اپنی اس دیوانی دوڑ کے چکر میں (جیسے کسی سحر کے زیر اثر) کبھی بھی نہ تھم سکا تھا اور اس کے ذہن کے وہ روشن کونے آہستہ آہستہ بجھتے گئے تھے۔ حتیٰ کہ ایک روز قلم گھِستے گھِستے وہ ایک لحظے کے لیے، جیسے صرف دم لینے کو، رکا تھا اور پھر نہ چل سکا تھا —— جیسے کہ انجن اپنے رواں رکھنے والے تیل کے ختم ہو جانے کے بعد بھی اپنی گرمی میں کچھ دیر تک رگڑ کھاتا ہوا چلتا رہتا ہے مگر جب بند کیا جاتا ہے تو یکلخت جہاں کا تہاں جام ہو جاتا ہے اور پھر نہیں چل پاتا —— اس وقت اس نے دہل کر اپنے اردگرد نظر دوڑائی تھی اور چاروں طرف سے اس گہرے گدلے نیلے رنگ کو اُمڈتے ہوئے دیکھ کر دفعتاً اسے اس بات کا احساس ہوا تھا کہ وہ دل کو بلکتا رکھنے والا سنہرا زرد رنگ اب قطعی طور پر زمانۂ ماضی بن چکا تھا۔

اس کے بعد وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر تین روز تک قلم ہاتھ میں پکڑے میز پر پھیلے ہوئے سفید کاغذوں پر نظر جمائے بیٹھا رہا تھا اور ایک لفظ تک نہ لکھ پایا تھا۔ اس نے اپنے ذہن کا کونہ کونہ چھان مارا تھا مگر کوڑے کرکٹ کے اس ڈھیر سے اسے زندگی کے رس کا قطرہ تک دستیاب نہ ہو سکا تھا۔ پھر کہانی کی تلاش سے عاجز آ کر اس نے کہا تھا: "اچھا تو میں جرنلزم کو آرٹ بناؤں گا۔" اس وقت سے اس کی گراوٹ شروع ہوئی تھی۔

سکری ی ی ی چ کر کے ایک تیز رفتار کار کو بریکیں لگیں اور سٹیئرنگ وہیل پر بیٹھے ہوئے خوش پوش نوجوان نے سر باہر نکال کر بے ضرر سی گالی دی وہ سر اٹھا کر شرمندگی سے ہنسا اور بھاگ کر سڑک پار کر گیا۔ اب سورج غروب ہو چکا تھا۔ فٹ پاتھ پر ابھی تک لڑکے کرکٹ کھیل رہے تھے۔ وہ چلتا چلتا رک گیا اور نظریں اٹھا کر افق پر دیکھنے لگا۔ اس شہر کی شام ہمیشہ اس کے دل کو بڑی اچھی لگی تھی یہ ماضی کی ان لمبی لمبی، ہولے ہولے رنگ بدلنے والی شاموں کی طرح کی شام نہ تھی۔ یہاں جب تک سورج غروب نہ ہوتا تھا دن بڑا اجلا اور روشن کھڑا رہتا تھا، اور جونہی سورج ڈوبتا تھا ایک عجیب و غریب، ناقابلِ بیان قسم کا رنگ —— گلابی اور سُرخ اور آتشی اور نیلی نیلی لہروں والا کاسنی —— یک بیک سارے آسمان پر پھیل جاتا تھا اور رات صرف چند منٹ دُور ہوتی تھی۔ ان چند منٹوں میں شہر کی ساری اُبلتی ہوئی آبادی کی حرکت تھم جاتی تھی (یا کہ صرف تھمتی ہوئی محسوس ہوتی تھی؟) اور سڑکوں کے کنارے بجلی کے بلبوں کی قطاریں دم بھر میں جل اٹھتی تھیں اور موٹر گاڑیوں کی بتیاں جلنے اور بجھنے لگتی تھیں اور دیکھتے ہی دیکھتے شہر بھر کا رنگ و روپ بدل جاتا تھا، یہاں تک کہ لوگوں کی آوازوں میں اور ان کی چال ڈھال میں اور ٹریفک کے شور تک میں غروب سے پہلے اور غروب کے بعد کا فرق محسوس کیا جا سکتا تھا۔ یہ چند منٹ وہ حدِ فاصل تھے جو دو مختلف شہروں کو ایک دوسرے سے جدا کرتے تھے۔ وہ 'نومینز لینڈ' تھے جس پر کھڑے ہو کر اس شہر کی مخصوص، مستقل، اندرونی دھڑکن کو محسوس کیا جا سکتا تھا۔ وقت کے اسی مقام پر، رات کے کنارے پر کھڑے ہو کر بارہا اس نے اس آبادی کی تیز و تند، بے رحم اور اُداس کر دینے والی تال کو سُنا تھا اور اس کی سرد مہری کو اپنی ہڈیوں میں اترتے ہوئے اور دل کی سانس کو مختصر ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ حتیٰ کہ یہ موسیقی اب اس کے لہو میں دوڑنے لگی تھی۔ اب وہ انھیں میں سے ایک تھا۔ اس نے جانی پہچانی، لاتعلق نظریں چاروں طرف پھینکیں۔ کرکٹ کی ایک گیند سَن سے اس کے کان کے ایک انچ کے فاصلے پر سے گزری۔ وہ جبلّی طور پر اپنے سر کو بچانے کے لیے جھکا۔ لڑکوں نے بلّے ہوا میں پھینک کر خوشی کا ایک نعرہ لگایا۔ وہ ان سے بچتا بچاتا ہوا چل پڑا۔ آبادی کی رفتار ابھی تھمی ہوئی تھی۔ یکبارگی اس کے سر پر بجلی کے قمقموں کی قطار کی قطار دُور تک روشن ہو گئی۔ وہ سہم کر دائیں بازو کی ایک لین میں، جہاں کارپوریشن کی بتیاں ابھی نہیں جلی تھیں، داخل ہوا۔ یہ نیم تاریک لین سنسان پڑی تھی اور کوئی بندہ بشر دکھائی نہ دیتا تھا۔ صرف سمندری ہوا شاں شاں کرتی ہوئی چل رہی تھی اور ردی اخباروں کے ورق اس کی ٹانگوں سے لپٹتے ہوئے، اس کے آگے آگے دُور دُور تک اُڑے جا رہے تھے۔

دو رویہ فلیٹوں میں ایک ایک کر کے بتیاں روشن ہو رہی تھیں۔ ایک دو منزلہ فلیٹ کی روشن کھڑکی میں سُرخ پردہ پھڑ پھڑا رہا تھا اور اندر سے ریڈیو کے بجنے کی آواز آرہی تھی۔ بنگ کراسبی "ہندوستان" گا رہا تھا۔ وہ کھڑکی کے نیچے کھڑا ہو کر ماضی کے اس نغمے کو سننے لگا۔ کھڑکی میں ایک عورت نمودار ہوئی۔ اس نے جھک کر باہر جھانکا، پھر اندر کسی سے کوئی بات کی اور ہلکا سا قہقہہ لگا کر ہنسی۔ کارپوریشن کی بتیاں بھک کر کے جل اُٹھیں اور ساری لین روشن ہو گئی۔ وہ آگے چل پڑا۔ اب رات پڑ رہی تھی اور شہر کی اصل دھڑکن ——— اپنی مستقل جگہ پر ——— واپس بیک گراؤنڈ میں پہنچ چکی تھی۔ موٹر گاڑیاں چکا چوند پیدا کرنے والی بتیاں آنکھوں میں ڈالتی فراٹے سے گزرتی جا رہی تھیں۔ کوئی کوئی گاڑی اندر سے روشن تھی۔ منہ میں سگار دابے، شارک سکن کے جیکٹ پہنے تنومند مرد سٹیرنگ وہیل پر بیٹھے تھے۔ بازو میں ادھیڑ عمر عورتیں زرتار ساریاں پہنے بیٹھی طمانیت سے باہر دیکھ رہی تھیں۔ پچھلی سیٹوں پر نوعمر لڑکیاں اور لڑکے بڑے دھیان سے کومکس پڑھنے میں مصروف تھے۔ خوش شکل، خوش پوش اور صحت مند کنبے اپنی اپنی 'انکم بریکٹ' والے کنبوں سے ملاقات کرنے، ان کے ساتھ کھانا کھانے، یا ان کے ہمراہ پکچر پر جانے کے لیے اُڑے جا رہے تھے۔ وہ دیر تک سڑک کے کنارے رکا ٹریفک کے تھمنے کا انتظار کرتا رہا، پھر گھبرا کر چل پڑا۔ آگے بانکے بدنوں والے نوجوانوں کے گروہ (تنگ پتلونوں میں بیٹیوں پہ ہاتھ۔) جگہ جگہ کھڑے راہ جاتی لڑکیوں سے ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ خوش نما جسموں اور تنگ لباسوں والی نوعمر لڑکیاں لب چھپائے، پیٹ میں ہنستی ہوئی لہرا کر پاس سے نکلی جاتی تھیں۔ یہ منظر بھی اس کے دل کو بڑا اچھا لگا اور وہ رُک کر انھیں دیکھنے لگا۔ سامنے بڑی بڑی دکانیں تھیں جن میں لوگ ہجوم در ہجوم داخل ہو رہے تھے نکل رہے تھے۔ ایک کتابوں کی دُکان تھی جس میں کبھی کبھار کوئی جا نکلتا اور جیبوں میں ہاتھ ڈال کر لاتعلق انداز میں چلنے پھرنے لگتا، جیسے عجائب گھر میں گھوم رہا ہو۔ ٹریفک آہستہ آہستہ دھیما ہونے لگا۔ وہ دوڑ کر سڑک پار کر گیا۔ اب فٹ پاتھ پر اس کے آگے اور پیچھے ایک اژدہام تھا۔ اس ہجوم میں طالب علم تھے جو دن بھر روزی کمانے کے بعد اب نائٹ سکولوں کو آ اور جا رہے تھے، اور بڑی پینے والے غلیظ لکھ پتی تھے جو اپنے اپنے سٹاکوں کو سیل کرانے کے بعد اب پھر ——— 'سالا' اور 'گھپلا' اور 'بھاؤ' اور 'بازار' اور 'تیز' اور 'مندا' کرتے ہوئے ——— اسی کی باتیں کر رہے تھے (یہ اس شہر کی مسخرے پن کی زبان تھی جو سانس کی طرح اس کے بدن میں چلتی تھی، جسے سُن کر ایک ایسے مردہ پنجر کے ڈھانچے کا تصور آتا تھا جو یک بیک مردار خور گدھوں کو جھٹک کر اُٹھ کھڑا ہوا اور آبادی میں آ نکلے اور زور زور سے ہنہنانا شروع کر دے اور جسے سُن کر آبادی کا خون سوکھ جائے)، اور عورتیں تھیں جو پلاسٹک کے چمکدار پرس جھلاتی، اپنے بے تاثر، خوبصورت چہرے اُٹھائے خرید و فروخت کرتی پھر رہی تھیں، اور انٹلکچوئل تھے جو پھیری لگانے والوں کی طرح اپنا ذہن کندھوں پر اٹھائے پھرتے تھے، اور چھوٹے چھوٹے اہلکار تھے جو زندگی کی بے حرمتی کے اس قدر عادی ہو چکے تھے کہ ایک ایک پان کھا کر ساری ساری شام وقت ضایع کرتے پھرتے تھے، اور رکشا والے گدیوں پر اُٹھے ہوئے، ہینڈلوں پر جھکے ہوئے سائیکل چلائے جا رہے تھے اور بڈھی امریکن ٹورسٹ عورتیں انھیں دیکھ دیکھ کر محظوظ ہو رہی تھیں، اور گداگر نیچے بھیک مانگ رہے تھے، اور یہ رواں دواں، گری پڑی مخلوق مُنہ کھولے، آنکھیں بند کیے، وقفے وقفے پر تڑپ کرتی ہوئی، مورکھوں کی طرح جیبوں میں ہاتھ ڈالے سکے کھنکھناتی ہوئی، بے خبری سے ہنستی ہوئی ادھر سے اُدھر آ جا رہی تھی۔ وہ چاروں طرف نظر دوڑاتا، جھینپ جھینپ کر ہنستا ہوا، انسانی تعلقات کے ظلم کی کیپٹیل حروف میں لکھی ہوئی اس ان پڑھی داستان سے آنکھ چراتا، بچتا بچاتا ہوا نکلتا گیا۔ رستے میں بہت سی روشن اور نیم روشن جگہیں آئیں۔ ایک نیم روشن جگہ پر اس نے ایک پان والے کو تن تنہا اپنی دکان میں بیٹھے، سر جھکائے پان لگاتے دیکھا اور اس کے ریڈیو پر ایک بہت پرانی اور مانوس دھن سنی جو یاد کی مانند اس کا تعاقب کرنے لگی۔ اس نے بار بار ذہن پر زور دے کر اس

پُرنور دھن کو یاد کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ چلتے چلتے اب وہ کھلے کھلے بنگلوں والے پُرفضا علاقے میں آنکلا تھا جس کی سڑکوں پر اندھے لیمپ دُور دور جل رہے تھے۔ بنگلوں کے سر سبز لان برقی قمقموں کی روشنی میں آرام سے لیٹے سانس لے رہے تھے۔ دروازوں پر رنگین پردے سکون سے پھڑپھڑا رہے تھے۔ اندر ان کے مکین بیٹھے تھے: سرکاری عہدیدار جو گورنمنٹ کے برسرِ اقتدار ارکان کی ذاتی زندگی کے مسائل پر گفتگو کر رہے تھے، ٹیلیفون پر سنیما کی سیٹیں بُک کرا رہے تھے اور اپنے مہمانوں سے ملک کی معاشی بدحالی کا گلہ کر رہے تھے۔ اور بڑے بڑے صنعت کار جو اپنے مزدوروں کی ہڑتال پر غم و غصے کا اظہار کر رہے تھے اور اپنی کھڑکیوں سے سرکاری عہدیداروں کے بنگلوں کو تاک رہے تھے۔ ان کی جوان ہوتی ہوئی دوسری نسل چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں ہی سڑکوں پر سرگرداں تھی۔ خنکی کی ترش خوشبو دار باڑوں کے سائے میں سگرٹوں کے کش لگائے جا رہے تھے اور سڑکوں پر پوری رفتار سے سکوٹر دوڑائے جا رہے تھے۔ چلتے چلتے ایک جگہ بزرگ کر اس نے ایک بار پھر ذہن پر زور دے کر مستقل پیچھا کرتی ہوئی اس دھن کو یاد کرنے کی کوشش کی مگر اس کا مقام ماضی اس کی گرفت میں نہ آنا تھا نہ آیا۔ دو سکوٹر دوڑ لگاتے ہوئے زن سے اس کے پاس سے گزر گئے۔ اس نے پُرحسرت نظروں سے ان کا تعاقب کیا اور دل کے پل کو اس کی آنکھوں میں وہ ناچتی ہوئی چمک لوٹ آئی اور اس کا بازو بے اختیار عہد کے انداز میں ان کے پیچھے اُٹھ گیا اور وہ بہت آہستہ سے، تقریباً نرمی سے بولا: "زندہ باد۔" وہ چلا چلا کر، سب کو سنا کر اس ماتمی سفر میں ان سنہری جوانیوں کو آشیرواد دینا چاہتا تھا مگر ابھی ابھی اسے پتا چلا تھا کہ اس کا دل مر چکا ہے۔ دل جو بڑی لمبی اور اونچی اُڑان والا، بڑا ہی شہپر اور جری پرندہ تھا۔

جب وہ اپنے فلیٹ کا دروازہ کھول کر چپکے سے اندر داخل ہوا تو اس کا بچہ زمین پر بیٹھا ایک پتلی سی کتابچے کے ورق اُلٹ رہا تھا۔ کچن سے برتنوں کے بجنے کی اِکا دُکا آوازیں آ رہی تھیں۔ اسے دیکھ کر بچے کا چہرہ کھِل اُٹھا اور وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر بولا: "آبا۔"

"گڈو۔" اس نے پیار سے پکارا۔ پھر وہ اس کے پاس بیٹھ گیا: "کیا کر رہے ہو؟"

"پڑھ رہا ہوں۔"

"ڈی ڈل ڈی ڈل ڈی ڈل ڈو۔" اس نے کہا۔

"ڈی ڈل ڈی ڈل ڈی ڈل ڈو۔" بچے نے شرارت سے آنکھیں چمکاتے ہوئے دوہرائے۔

"ڈو ڈل ڈو ڈل ڈو ڈل ڈاہ۔"

"ڈو ڈل ڈو ڈل ڈو ڈل ڈاہ۔"

دونوں کھِلکھلا کر ہنس پڑے۔ جمال کچن کے دروازے سے جھانک کر مسکرائی اور واپس چلی گئی۔

"کیا کر رہے ہو بیٹے؟" اس نے پوچھا۔

"ایک بار کہا ہے پڑھ رہا ہوں۔"

"ارے! یہ پڑھنے کب سے لگے ہو؟"

"یہ انکل نے دی ہے۔" بچہ کتاب اس کی ناک کے نیچے ٹھونس کر بولا۔

"کس نے؟"

"انکل ریاض نے۔"

اس نے کتاب کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا۔ اس کی جلد پر لکھا تھا: "بچّوں کے لیے زرّیں اقوال۔"
"ہا ہا۔" وہ ورق اُلٹنے لگا۔
"ہا ہا۔" بچّے نے نقل اُتاری اور بازو اس کی گردن میں حمائل کر کے جھولنے لگا: "میں اس کو پڑھ لیتا ہوں۔"
"ارے واہ۔ آپ کو الف بے تو ابھی آتی نہیں۔"
"میں اس کو پڑھ لیتا ہوں۔" بچّے نے سختی سے کہا۔
"اچھا پڑھو۔"
"یہ ہے: 'ہمیشہ سچ بولو'۔"
"ارے!" وہ چونک پڑا: "یہ آپ نے پڑھنا کب سے شروع کیا بھئی؟"
"یہ انکل ریاض نے لے کر دی ہے۔"
"ہا ہا۔" اس نے کتاب فرش پر رکھ دی: "آپ کو الف بے تو ابھی آتی نہیں۔"
"میں اس کو پڑھ لیتا ہوں پڑھ لیتا ہوں پڑھ لیتا ہوں۔"
"شوکی،" جمال کچن کے دروازے پر نمودار ہوئی: "گڈو کا ذہن بڑا ہی اچھا ہے۔"
"اچھا؟"
"ہاں۔" وہ اس کے پاس آ کر زمین پر بیٹھ گئی: "میں نے ایک بار بس بتایا ہے اور اسے ازبر ہو گیا ہے۔"
"ہا ہا۔"
"گڈو، ابا کو پڑھ کر سناؤ۔"
"یہ ہے: 'ہمیشہ سچ بولو'۔" بچّے نے کہا۔
"ہا ہا۔"
"یہ ہے: 'محنت سے کام کرو'۔"
"ہا ہا۔" اس نے پیار کے مارے جھک کر اپنے بچّے کو ماتھے پر چوما: "ڈوڈل ڈوڈل ڈاہ۔"
"ڈوڈل ڈوڈل ڈاہ۔" بچّے نے دوہرایا۔
"ڈمی ڈل ڈی ڈل ڈو۔"
"ڈمی ڈل ڈی ڈل ڈو۔"
دونوں قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔ اس نے 'ڈوڈل ڈوڈل' کی گردان کرتے ہوئے بچّے کے گدگدی کرنی شروع کر دی۔ بچّہ ہنستا ہوا فرش پر قلابازیاں کھانے لگا۔ لڑھکتا لڑھکتا وہ دور تک چلا گیا۔ دیوار کے پاس پہنچ کر اس کا ہاتھ ایک ٹوٹے ہوئے کھلونے پر پڑا۔ وہ اسے اُٹھا کر کچھ دیر تک خاموشی سے دیکھتا رہا، پھر چلّا اُٹھا:
"ابا میرا جہاز ٹوٹ گیا۔"
"ارے یہ کیسے ٹوٹ گیا؟"
"بس ٹوٹ گیا۔" بچّے نے کہا: "ابا ہمیں جہاز بنا کر دو۔"
"جہاز بنا کر دیں؟"
"ہمیں جہاز بنا کر دیں۔"

"اچھا" اس نے کتاب سے ورق پھاڑ کر جہاز بنانا شروع کیا۔
"ابا!" بچہ چیخا: "اس کا نہیں، اخبار کا!"
"اخبار کا!" وہ جہاز بناتا رہا۔
"ابا آپ نے ہمارا 'ہمیشہ سچ بولو' پھاڑ دیا!"
اس نے جہاز بنا کر دو انگلیوں میں پکڑا اور منہ سے 'زوم' کی آواز نکال کر زور سے ہوا میں پھینکا۔
"ابا ہم کو دیں!" بچہ ہاتھ پھیلا کر اس کے پیچھے بھاگا۔ جہاز کھڑکی کے راستے تیرتا ہوا نیچے سڑک کی طرف پرواز کر گیا۔ بچے نے خوشی سے تالی بجائی۔ وہ دوسرا ورق پھاڑ کر جہاز بنانے لگا۔
"ابا اس کا نہیں!" بچہ چیخا: "ابا آپ نے ہمارا 'محنت سے کام کرو' پھاڑ دیا!"
"ارے ہاں یار!" وہ اکتا کر بولا: "ہم نے بھی پڑھا تھا!" اور جہاز بناتا رہا۔
"ہم کو دو —— ابا ہم کو دو!" بچہ چلایا۔ پھر اس نے باپ کے ہاتھ سے جہاز لے کر اسے دو انگلیوں میں پکڑا اور منہ سے 'زوم —— زوم' کی آوازیں نکال نکال کر اسے کمرے میں اڑانے اور تالیاں بجانے لگا۔
جمال، جو اس اثنا میں واپس کچن میں جا چکی تھی، دوبارہ دروازے پر نمودار ہوئی اور بولی: "شوکی کھانا تیار ہے!"
"ارے صبح کی رہو فاختہ!" وہ بولا: "مجھے بھوک لگ رہی تھی!"
اس نے خاموشی اور تندہی سے کھانا کھایا۔ کھانا ختم کرنے کے تھوڑی ہی دیر بعد بچہ ماں کی گود میں پڑا پڑا سو گیا۔
جب وہ بتیاں بجھا کر سونے کے لیے لیٹے تو کمرے میں سخت حبس ہو رہا تھا اور کئی پتنگے ادھر ادھر تاریکی میں دیواروں اور کھڑکیوں کے شیشوں پر سر مار رہے تھے۔
"نہیں شوکی!" پھر جمال کی آواز آئی: "اوں ہنک!"
"میری فاختہ —— میری ننھی سی فاختہ!"
"ہائے شوکی —— تمہیں کیا ہو گیا ہے؟"
"میری جان فاختہ!" وہ خوشامد کے لہجے میں بولا: "میری جان فاختہ!"
"خدایا!" اس نے زاری کی: "خدایا!!"

اگلے روز سویرے وہ ریاض کے ڈرائنگ روم میں بیٹھی تھی۔ اس کے سامنے ریاض، سفید فلالین کی پتلون اور زرد پولو شرٹ پہنے، صوفے پر نیم دراز پچھلے ایک گھنٹے سے مستقل ٹیلیفون پر اپنے آفس سے بات کر رہا تھا۔ گڈو اکیلا اکیلا برآمدوں میں پھرتا ہوا آ کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔
"امی!" وہ بولا: "میں سڑک پر چلا جاؤں؟"
"نہیں!"
"امی!" تھوڑی دیر بعد اس نے پھر پوچھا: "میں سڑک پر چلا جاؤں؟"
"نہیں گڈو!" وہ سختی سے بولی: "آپ سڑک پر نہیں جا سکتے!"
وہ صوفے پر بیٹھا زور زور سے ٹانگیں ہلانے لگا۔ ریاض نے رسیور رکھ دیا اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔
"ہم اخبار نویسوں کی بھی عجیب زندگی ہے!" وہ بولا: "اتوار کے روز بھی چین نہیں ملتا!"

"مجھے پتا ہے۔" وہ ہنسی: "میں نے ایک اخبار نویس سے شادی کی ہے۔"

ریاض نے گہری، اُداس نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ جھجک کر ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔ دیواروں پر بڑی بڑی فریم شدہ پینٹنگز کے درمیان پرانے پرانے گروپ فوٹو لٹکے تھے۔ چاروں طرف میزوں پر ریاض کی ان گنت ٹرافیاں اور چھوٹے بڑے کپ، جن کا روغن اب اُترتا جا رہا تھا۔ بے ترتیبی سے رکھے ہوئے تھے۔ کھڑکیوں کے سبز پردے اکٹھے کر کے پیتل کے چھلّوں میں پھنسا دیے گئے تھے اور خوش گوار سمندری ہوا کمرے کے آر پار چل رہی تھی۔ یہ اتوار کا روز تھا۔ (صبح اُٹھ کر اس نے دو چار بار شوکت کو جگانے کی کوشش کی تھی، پھر گڈو کو ناشتہ کرا کے، فلیٹ کا دروازہ آہستہ سے بھیڑ کر یہاں چلی آئی تھی۔)

اب باہر گھاس کے قطعوں پر دھوپ پھیل چکی تھی اور فٹ پاتھ پر لڑکے کرکٹ کھیل رہے تھے۔ ("امی میں سڑک پر چلا جاؤں؟" گڈو نے تیسری بار پوچھا۔) وہ اس کے گھر میں پہلی بار داخل ہوئی تھی، اس نے سوچا۔ صرف ایک مرتبہ پہلے، جب ریاض نیا نیا اس شہر میں آیا تھا اور وہ اپنے کالج سے (جہاں اس نے محض دفع الوقتی کی خاطر کچھ دیر کے لیے نوکری کر لی تھی) واپسی پر بس کا انتظار کر رہی تھی تو ریاض کی سبز رنگ کی بیوک اس کے برابر آ کھڑی ہوئی تھی۔ اندر وہ دونوں کہنیاں سٹیئرنگ پر رکھے عجیب پُرحسرت نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"ہلو ریاض۔" وہ خوشی سے بولی تھی۔ (ایک زمانے میں وہ کتنی خوش رہی تھی، اس نے یاد کیا۔)

"کیسی ہو جاں؟" ریاض نے پوچھا تھا۔ اور اس کے لہجے کے حزن کو محسوس کر کے اس کا دل بھر آیا تھا۔ پھر جب اس نے کہا تھا: "چلو تمھیں چھوڑ آؤں۔" تو وہ چپکے سے موٹر کا دروازہ کھول کر اس کے ساتھ بیٹھ گئی تھی، اور جب رستے میں اس نے یہ کہہ کر "چلو تمھیں اپنا گھر دکھاؤں۔" گاڑی اپنے گھر کی طرف موڑ دی تھی تو بھی وہ کچھ نہ بولی تھی۔ پھر وہاں پہنچ کر وہ اسے اپنے بڑے سے، جہاز نما مکان کے وسیع و عریض لان اور نفاست سے کٹی ہوئی باڑیں اور گلاب کے پودے دکھاتا پھرا تھا۔ (اپنے لاپروا، بااختیار انداز میں، بچوں کی سی بڑائی کے لہجے میں جو نو دولتے طبقے کے غرور سے یکسر مبرّا تھا بہرحال، اس نے یاد کیا۔) پھر اس کے اصرار پر وہ اسے اس کے گھر چھوڑ آیا تھا۔ آج تن تنہا، گڈو کو انگلی سے لگائے اس کے گھر میں داخل ہوتے ہوئے اسے بڑا عجیب سا لگا تھا۔

"شوکت آیا تھا۔" ریاض نے کہا۔

"کب؟"

"کل۔"

ٹیلیفون کی گھنٹی پھر زور زور سے بجنے لگی۔ چند سیکنڈ تک وہ تھکی ہوئی نظروں سے اس سرد، بے روح آلے کو دیکھتا اور اس کی تیز و تند آواز کو سنتا رہا، پھر میکانکی طور پر ریسیور اٹھا کر بولا: "ہلو۔"

اپنی چھوٹی چھوٹی مونچھوں پر اُنگلی پھیرتا ہوا وہ دوسری طرف سے آتی ہوئی آواز کو سُنتا رہا، پھر تیزی سے بول اُٹھا:

"خواجہ صاحب سے کہو، 'سپورٹس مین' کو آج شام کے پلین میں سیٹ ریزرو کرا دیں اور اس کے لیے پیسوں کا بندوبست کر دیں۔ آج اسے ہر حالت میں چلے جانا چاہیے۔ اور انور سے کہو منسٹری آف انفارمیشن سے نمبر ٹو زیرو سیون کے بارے میں مکمل رپورٹ حاصل کر کے چار بجے تک مجھے پہنچا دے۔ اور وہ آرٹیکل تیار ہو گیا؟ ٹھیک ہے۔ پریس میں جانے سے پہلے میں ایک نظر اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔ اور چیمبر آف کامرس والی تقریر ——— ایں؟ اچھا اچھا،

مگر اب چار بجے تک مجھ کو مت ڈسٹرب کرو۔ اور آپریٹر سے بھی بول دو کہ چار بجے تک میں 'آؤٹ' ہوں، سب کالز کو روک کر رکھے۔ اوکے۔" اس نے ریسیور پٹخ دیا۔

پھر ایک لحظہ رکنے کے بعد صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر بولا: "میں نے اس کی ہر ممکن مدد کرنے کی کوشش کی ہے جمال، مگر وہ اپنی بات پر اڑا ہوا ہے۔ کسی کی بات ہی نہیں سنتا۔ ایک دم سنگل ٹریک مائنڈ ہوتا جا رہا ہے جرنلزم بڑا نازک بزنس ہے۔ اس کے چند بنیادی اصول ہوتے ہیں، تمھیں پتا ہی ہے۔ ان کے ساتھ کھیلا کرنے کی میں اسے اجازت نہیں دے سکتا۔"

"انکل،" بچے نے جیب سے کتاب نکال کر بڑھائی: "ہمیں جہاز بنا کر دیں۔"

"ارے، یہ آپ نے پھاڑ دی؟"

"آپا نے اس کے جہاز بنا دیے۔" بچہ معصومیت سے بولا۔

"ہا ہا۔" وہ کتاب لے کر اس کے ورق الٹنے لگا: "اس کو پڑھتے ہیں بیٹے۔"

"ہمیں جہاز بنا کر دیں۔" بچے نے ضد کی۔

"اس کو پھاڑتے نہیں بیٹے۔ اسے پڑھتے ہیں۔" وہ نرمی سے بولا۔

"پھر؟"

"پھر پڑھ کر بڑے آدمی بنتے ہیں۔"

"نہیں ہمیں جہاز بنا کر دیں۔" بچے نے رونی آواز میں دوہرایا۔

ٹیلیفون کی گھنٹی پھر بج اٹھی۔ اس نے جھنجھلا کر فون اٹھایا اور تیزی سے بولا: "ہلو۔" پھر ایک سیکنڈ کے بعد پرتپاک لہجے میں: "اخاہ ——— کرنل صاحب ہیں۔ یہ آپ کہاں غائب ہو گئے تھے جناب؟ پوچھتے پوچھتے ہمارا دم نکل گیا۔" ریسیور کے اوپر سے اس نے جمال سے نظر ملا کر منہ بنایا اور جھلاہٹ سے کندھے اچکائے۔ پھر صوفے پر نیم دراز ہو کر بڑے شگفتہ لہجے میں باتیں کرنے لگا۔

پچھلے ایک گھنٹے میں وہ اسی طرح (اپنے لاپروا، بااختیار اور شگفتہ لہجے میں) اپنے چیف ایڈیٹر، چیف رپورٹر، پریس سپرنٹنڈنٹ اور کوئی آدھی درجن سب ایڈیٹروں سے بات کر چکا تھا۔ اس کے علاوہ بیچ بیچ میں اس نے کئی بار اپنی سیکرٹری کو مختلف ہدایات دی تھیں اور ہر بار اسے سختی سے تنبیہ کی تھی کہ اب چار بجے تک اس کو ڈسٹرب نہ کیا جائے۔ جمال نے اس سارے عرصے میں پہلی بار غور سے اسے دیکھا اور دہل کر رہ گئی۔ بے آرامی کی وجہ سے اس کی آنکھوں کے گرد گہرے سیاہ حلقے پڑ گئے تھے اور اس کا جسم نمایاں طور پر دبلا ہوتا جا رہا تھا۔ ٹیلیفون پر باتیں کرتے ہوئے وہ پائپ بھرتا جا رہا تھا۔ پائپ سلگاتے ہوئے اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا اور اس کی ایک ٹانگ مستقل ہلے جا رہی تھی۔ وہ اپنی ابلتی ہوئی اعصابی قوت سے مجبور تھا اور ایک وقت میں کئی کئی کام کرنا چاہتا تھا۔ اس کی کنپٹیوں کے بال تقریباً سفید ہو چکے تھے اور اس کے جسم کی تیز، مضطرب حرکات کے باوجود اس کے چہرے سے مستقل تھکن اور ناطاقتی مترشح تھی۔ یہ شخص ——— ایک لمحے کے لیے جمال نے آنکھیں بند کر کے سوچا ——— یہ شخص ٹریک پر یوں دوڑا کرتا تھا جیسے جنگل میں چیتا دوڑتا ہے۔

ہاں ——— اس نے یاد کیا ——— ریاض احمد زبیری بڑا ہی شاندار آدمی تھا۔ وہ دن، جب پہلی بار اس نے ریاض کا نوٹس لیا، اس کے ذہن پر بڑا گہرا نقش تھا۔ جاڑوں کے دن تھے۔ وہ یونیورسٹی گراؤنڈ کے ساتھ ساتھ چلی جا رہی تھی کہ اچانک اس کی نظر ایک لڑکے پر پڑی جو اونی ٹریک سوٹ میں ملبوس، سپائک پہنے دوڑ کی پریکٹس کر رہا تھا۔ وہ

ٹکٹکی کر رک گئی۔ پھر اس نے کئی بار حیرت سے آنکھوں کو جھپک کر اسے دیکھا اور دیکھتی رہ گئی۔ ایسے گریس فل سٹائل سے اس نے آج تک کسی کو دوڑتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ اس لڑکے کے پاؤں زمین پر لگتے ہوئے دکھائی ہی نہ دیتے تھے اور اس کی ٹانگیں جیسے ہوا ہی ہوا میں الگ پرلگ لگاتی ہوئی پوری رفتار سے بدن کو اڑائے لیے جا رہی تھی۔ اسے دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے ابھی، اسی لمحے یہ بدن زمین کو بالکل ہی چھوڑ دے گا اور بازو پھیلا کر اسی آسانی اور تیزی کے ساتھ ہوا میں اڑنا شروع کر دے گا۔ اس کے بازوؤں کی، پشت کی، کندھوں کی، گردن کی، سر کی، ٹانگوں کی اپنی اپنی حرکت جیسے سارے بدن کی ایک اندرونی تال کے ساتھ بندھی ہوئی تھی۔ اس کے سارے بدن کی مجموعی حرکت میں ایسا مکمل آہنگ تھا جیسا ایک سمفنی میں ہوتا ہے۔ چار سو چالیس گز کے گول ٹریک پر اس اکیلے لڑکے کی دوڑ ایک عظیم الشان سمفنی کی گونج تھی۔

جب وہ اچھی طرح سے 'وارم اپ' ہو چکا تو اس نے ٹریک سوٹ اتار کر ایک طرف رکھ دیا۔ نیچے صرف سیاہ سلک کے انڈرویئر میں اس کا گٹھا ہوا سفید جسم سہ پہر کی دھوپ میں چمکنے لگا۔ وہ کتنی ہی دیر تک آنکھیں جھپکتی ہوئی کھڑی اسے دیکھتی رہی اور وہ سر گرائے چکر پہ چکر لگائے گیا۔

اس کے بعد کتنی ہی بار اس کی آنکھوں کے سامنے اس چمکدار خوبصورت جسم نے بڑے بڑے معرکے سر کیے۔ سائیڈ لائینز پر دم بخود کھڑے کھڑے، یا جوش سے چلا چلا کر تالیاں پیٹتے ہوئے اس نے اسے ہاکی کے میدان میں اپنے جسم پر مکمل کنٹرول کا مظاہرہ کرتے ہوئے دیکھا۔ اس کا 'باڈی ڈاج' ملک بھر کے کھلاڑیوں میں مشہور تھا۔ جب وہ گیند لے کر نکلتا تو دس دس پندرہ پندرہ گز کے فاصلے پر مقابل کے کھلاڑی پلٹ پلٹ کر گرنے لگتے۔ اسے اپنے جسم پر یوگیوں کا سا کنٹرول حاصل تھا۔ کیمپس پر وہ ہر دم اس کی نظروں کے سامنے رہتا۔ وہ ایک ہی وقت میں ساری جگہوں پر حاضر و ناظر معلوم ہوتا۔ اس کی یہی ابلتی ہوئی اعصابی قوت تھی جس نے اس کی شخصیت میں بلا کی کشش پیدا کر دی تھی۔ آہستہ آہستہ وہ دل ہی دل میں اس کی گرویدہ ہوتی گئی۔ (اس کی اسی گرویدگی نے لمبے عرصے تک اسے ایک جان لیوا کشمکش میں مبتلا رکھا تھا۔ وہ ان دو مردوں کے درمیان جیسے ہوا میں معلق کھڑی رہی تھی، کھڑی رہی تھی حتیٰ کہ عورت کی مخصوص چھٹی حس نے اسے بتا یا تھا کہ وہ مکمل ہم آہنگی، جو ایک عورت اور مرد کے درمیان ہو سکتی ہے، صرف شوکت کے ساتھ ممکن تھی۔ شوکت ——— جو ریاض کی طرح شاندار نہ تھا مگر جس کی کشش قریب جانے پر محسوس کی جا سکتی تھی؛ جس میں قدرتی ذہانت کی آہستہ آہستہ اٹھنے والی، ہمیشہ جلنے والی ایک دمک تھی جو کہیں اندر سے ان دیکھی، طاقتور شعاؤں کی طرح نکلتی رہتی تھی اور جو قریب آنے والے ہر شخص میں خیر و عافیت کا عجیب سا احساس پیدا کرتی تھی؛ وہ جو ریاض کے مقابلے میں زندگی کی بڑی بڑی اہم اور سنجیدہ باتوں کا اہل تھا ——— اس نے یاد کیا ——— جس کے جسم کی وہ مدھم، قدرتی باس تھی جسے محسوس کر کے آج بھی اس کا بدن سلگ اٹھتا تھا ——— خدایا!)

ریاض ٹیلیفون سے فارغ ہو کر سیدھا ہو بیٹھا اور جمائی کو روکنے کی کوشش کرنے لگا۔

"گڈو و و و ۔" پھر اس نے آواز دی۔

بچہ، جو اس کی ٹرافیوں کا ملاحظہ کر رہا تھا، ہاتھ پھیلا کر اس کی طرف بھاگا: "انکل ہمیں جہاز بنا کر دیں۔"

"آیئے آیئے ——— ارررر یہاں بیٹھ جایئے ارررر یہاں ہمارے پاس۔ شاباش۔"

"انکل جہاز ———"

"آپ پہلے اس کو پڑھیں۔" اس نے کتاب بچے کے ہاتھ میں پکڑا دی: "پھر ہم آپ کو سچ مچ کا جہاز لے کر دیں گے۔"

"سچ مچ کا جہاز؟"

Scanned by CamScanner

"ہاں۔" اس نے تیزی سے جمال کو دیکھا: "میں ایک ٹو سیٹر پلین خرید رہا ہوں۔"

"کس لیے؟" جمال نے پوچھا۔

"کس لیے؟" وہ بولا: "اُڑانے کے لیے۔"

"اُڑا لیتے ہو؟"

"میرے پاس لائسنس ہے بھئی۔" وہ بولا: "کل ملا کر میری آٹھ سو گھنٹے کی فلائنگ بنتی ہے۔"

جمال نے ابرو اُٹھا کر داد دی۔

"پھر میں تمھیں آسمان کی سیر کراؤں گا۔ ہیں؟" وہ ہنسا۔

وہ سامنے دیوار پر دیکھتی رہی۔

"یہ میں نے پارسال خریدی تھی۔" وہ بولا۔

"پرنٹ ہے؟"

"پرنٹ ہے؟ میں نے آج تک یہاں کوئی پرنٹ نہیں لٹکایا۔ یہ سب۔" اس نے ہاتھ پھیلایا: "سب اوریجنل ہیں۔"

"اوہ ———"

"اب میں یہاں میورلز بنوا رہا ہوں۔" اس نے سامنے کی دیوار کی طرف اشارہ کیا۔ پھر وہ اسے بے خیالی سے دیوار پر گھورتے ہوئے دیکھ کر اُٹھ کھڑا ہوا: "تم نے میرا مکان دیکھا ہے؟ آؤ تمھیں دکھاؤں۔"

"اوہ ———" وہ ہنسی: "بڑا اچھا مکان ہے۔"

"تم نے دیکھا کب ہے بھئی۔ آؤ میرے ساتھ۔"

"انکل جہاز ———" بچے نے کہا مگر وہ دونوں ساتھ ساتھ دروازے سے باہر جا چکے تھے۔

"یہ بینکوئٹ ہال ہے۔" ریاض نے کہا۔ یہ ایک بہت بڑا مستطیل کمرہ تھا جس کے فرش کی سیاہ اور سفید ٹائلوں پر پاؤں پھسلا جاتا تھا۔ وسط میں سیاہ، چمکدار لکڑی کی بھاری پایوں والی میز، زرد سلک کی چادروں سے ڈھکی ہوئی میزیں بچھی تھیں جن پر چمکدار چاندی کے بڑے بڑے پیالے اور دوسرے آرائشی برتن رکھے تھے۔ دیواروں کے ساتھ سرخ اور سیاہ رنگ کے صوفے بچھے تھے جن کے آگے چھوٹی چھوٹی گول میزیں پڑی تھیں۔ چاروں طرف اونچی اونچی، چھت تک پہنچتی ہوئی پلیٹ گلاس جڑی کھڑکیاں تھیں جن کے آگے سبز رنگ بھاری سلک کے گھنی سلوٹوں والے پردے لٹک رہے تھے۔ کھڑکیوں کے بیچ بیچ دیواروں پر بڑی بڑی سنہری فریم شدہ تصویریں لگی تھیں۔ چھت کے عین وسط میں بہت بڑا، شیشے کی ہزاروں بتیوں والا فانوس لٹک رہا تھا۔

"یہ فانوس،" ریاض نے کہا: "میں نے چیکوسلواکیہ سے منگوایا ہے۔" اس نے کھٹ سے بٹن دبایا اور سارا ہال بقعۂ نور بن گیا۔ جمال کی آنکھیں چندھیا گئیں۔

"دنیا بھر میں صرف چیکوسلواکیہ میں کٹ گلاس کا کام اتنا عمدہ ہوتا ہے۔" ریاض کہہ رہا تھا۔ خیرہ آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے اس نے ریاض کے پیچھے پیچھے ہال کا فرش پار کیا اور اگلے کمرے میں داخل ہوئی۔

"یہ کاک ٹیل لاؤنج ہے۔" ریاض نے بتایا۔ اندر داخل ہوتے ہی ان کے آدھے آدھے پاؤں قالین میں دھنس گئے۔ اس کمرے میں سارا قدیم سپینش فرنیچر تھا اور کھڑکیوں پر قرمزی ولوٹین کے بھاری پردے چھت سے لے کر فرش تک لٹک رہے تھے۔ دائیں طرف کی ساری دیوار کے ساتھ ساتھ اخروٹ کی لکڑی کا بار تھا جس کے آگے اونچے اونچے

گھومنے والے سٹول پڑے تھے۔ کاؤنٹر کے ایک طرف سیاہ پتھر کا بہت بڑا فرشی لیمپ کھڑا تھا۔

"سپینش فرنیچر تمھیں پسند ہے نا؟" ریاض کہہ رہا تھا: "یہ سارا سپین سے برآمد کیا گیا ہے۔ اور یہ ولوٹین"؛ اس نے ہاتھ بڑھا کر پردے کو چھوا۔

ایک تنگ سے کوریڈور میں سے گزرتے ہوئے ریاض نے سرسری طور پر ایک دروازہ کھولا: "یہ باتھ روم ہے" اس نے کہا۔ غسل خانہ اچھے بھلے کمرے کے سائز کا تھا جس کے کونے میں بجلی کا واٹر ہیٹر نصب تھا۔ اس کا فرش اور آدھی آدھی دیواریں ہلکی سبز ٹائلوں کی تھیں اور فرش کے وسط میں سُرخ پتھر کا، ایک چھوٹے سے سوئمنگ پول کے سائز کا ٹب زمین کے اندر نصب کیا گیا تھا۔ میڈیسن کیبنٹ پر بیسیوں چھوٹی بڑی شیشیاں رکھی تھیں اور دونوں جانب قدِآدم آئینے لگے تھے۔ واش بیسن اور ٹب کی ٹونٹیاں سونے کے رنگ کی تھیں۔ ریاض نے اندر جا کر ساری ٹونٹیاں کھول دیں اور ٹھنڈا اور گرم پانی شر شر بہنے لگا۔ وہ جمال کی طرف دیکھ کر آہستہ سے ہنسا اور باہر نکل آیا۔

کوریڈور کو عبور کر کے وہ ریاض کی سٹڈی میں داخل ہوئے۔ یہ نسبتاً چھوٹا کمرہ تھا جس میں اخروٹ کی لکڑی کے شیلف چھت تک کتابوں سے پُر تھے۔ ایک بڑا سا چمڑے کا صوفہ میز کے پاس بچھا تھا۔ صوفے کے پیچھے زرد رنگ کے شیڈ والا فرشی لیمپ روشن تھا۔ ایک کونے میں میز پر فونوگراف پڑا تھا۔ پاس ہی ریکارڈوں سے لدی ہوئی ایک بہت بڑی کیبنٹ تھی۔ چند ریکارڈ میز پر بکھرے تھے۔ کھڑکیوں اور دروازوں پر بھاری بھاری پردے لٹک رہے تھے جنھوں نے باہر کی دُنیا کو یکسر روک رکھا تھا۔ اس کمرے میں مکمل سناٹا تھا۔ جمال آہستہ سے میز کے کونے پر بیٹھ گئی۔

"کبھی پڑھتی بھی ہیں؟" اس نے کتابوں کی طرف اشارہ کر کے خوش دلی سے کہا۔

"بابا" ریاض نے جا کر سٹڈی کا دوسرا دروازہ، جو خواب گاہ میں کھلتا تھا، کھول دیا: "یہ بیڈروم ہے"

اس کمرے کے فرش پر قدم رکھتے ہی ان کے پاؤں سارے کے سارے قالین میں دھنس گئے۔ یہاں سب چیزیں نیلگوں شیڈ کی تھیں، جیسے شام پڑی ہوتی ہے۔ لمبی لمبی گہری سلوٹوں والے پردے اور ٹیبل لیمپوں کے شیڈ اور لمبے چوڑے بستر پر پھیلی ہوئی چادریں اور تپائی پر پڑا ہوا ٹیلیفون اور کرسی پر پھینکا ہوا نائٹ سوٹ اور نفاست سے جوڑ کر رکھے ہوئے مخملیں سلیپر اور اخباروں رسالوں کے فولڈر اور فرش پر بچھا ہوا قالین —— سب کا شیڈ گہری شام کا سا نیلگوں تھا۔

"یہ قالین دو سو برس پرانا ہے۔" ریاض کہہ رہا تھا: "میں کابل کے قالین سازوں کے بازار میں گھوم رہا تھا کہ اچانک اس پر نظر پڑ گئی۔ اس کی پوری ہسٹری کی کتاب اس کے ساتھ تھی۔ دو سو برس پیشتر یہ بخارا کے قالین سازوں نے بنایا تھا۔ پھر یہ کہاں کہاں گیا اور کن کن ہاتھوں سے نکلا؟ یہ سب اس میں درج تھا۔ ایک لاکھ بیس ہزار افغانی روپے اس کی قیمت تھی۔ تقریباً تیس ہزار روپے بنتے ہیں۔ . . .

"دو سو برس، ذرا سوچو! اور یہ ابھی تک ویسے کا ویسا ہے۔ دیکھو"۔ اس نے کہا: "پاؤں نکال کر دیکھو" اور اپنا پیر جوتے سے نکال کر اس پر پھیرنے لگا: "دیکھو ——" اس نے دہرایا۔ پھر وہ گھٹنے ٹیک کر زمین پر بیٹھ گیا اور اس کا پاؤں جوتے سے نکالنے لگا۔

جمال نے اپنے چھوٹے سے، دبلے پتلے پاؤں کو دُور تک قالین میں دھنستے ہوئے دیکھا اور وہ جھاگ سی کیفیت اس کے دل کو بڑی اچھی معلوم ہوئی۔ چند لمحظے تک وہ پاؤں کو وہیں رکھے کھڑی رہی اور مخملیں پشم اس کی جلد پر ہلکی ہلکی گدگدی کرتی رہی: "دو سو برس پہلے" ریاض کی آواز جیسے کہیں دُور سے آرہی تھی: "ذرا سوچو! بخارا، سمرقند ——"

دنیا میں کیسی کیسی عجیب و غریب جگہیں ہیں، اس نے سوچا۔ دفعتاً اس نے اپنے آپ کو دو سو برس پہلے کے زمانے میں سمرقند و بخارا کے شاہی محلوں میں کھڑا ہوا پایا۔ اسے محسوس ہوا کہ جیسے وہ کسی شاہی تقریب میں شرکت کرنے کے لیے تیار ہو رہی ہے اور خادم گھٹنے ٹیکے، نظریں جھکائے، جوتا ہاتھ میں اُٹھائے اس کے حکم کا منتظر بیٹھا ہے اور وہ ان سارے نیم تاریک، پُراسرار محلوں کی اور ان کے بیش بہا ساز و سامان کی اور درجنوں مودّب خادموں کی مالک ہے اور ایک انگلی کے اشارے سے کیا سے کیا کر سکتی ہے۔ کئی طویل لمحوں تک وہ ایک سکتے کے عالم میں بے حس و حرکت کھڑی رہی اور ریاض اسی طرح بیٹھا نظریں اٹھائے حیرت سے اسے دیکھتا رہا۔ پھر یکلخت اس کا سفر ختم ہو گیا اور وہ سارے قدیم زمانوں، اور ان کے سارے نیم تاریک، پُراسرار جذبوں کو طے کر کے واپس آ گئی اور اس ہولے ہولے سر اُٹھاتی، گدگدی کرتی ہوئی جھاگ سی پشم کے اوپر اس کا تلوہ آہستہ آہستہ کپکپانے لگا۔ اس نے سہم کر ریاض کو دیکھا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"ریاض ——" اس نے بند ہوتے ہوئے گلے سے کہا۔

"چلو اب تمھیں سوئمنگ پول دکھاؤں۔" وہ لاپروائی سے اُٹھ کر چل پڑا۔

"بس کرو ریاض ——" وہ چیخی: "خدا کے لیے . . ." پھر اس نے جلدی سے جوتا پہنا اور اُلٹے پاؤں بھاگ کھڑی ہوئی۔ ریاض اس کے پیچھے لپکا۔ ڈرائنگ روم میں پہنچ کر وہ ٹھٹک کر رُک گئی۔

"جمال،" ریاض نے پوچھا: "تمھاری طبیعت ٹھیک ہے نہ ہے؟"

"ٹھیک ہے ریاض۔" وہ آنسو خشک کر کے مسکرائی: "تمھارا مکان بڑا خوبصورت ہے۔" اس نے دل میں ہلکی سی شرمندگی محسوس کی۔

ریاض اُداسی سے ہنسا: "میں نے مُلک مُلک گھوم کر وہاں کی بہترین چیزیں جمع کی ہیں جمال، وہاں کے بہترین آدمیوں کے برابر بیٹھا ہوں اور دُنیا کی خوبصورت ترین عورتوں سے ملا ہوں، اور تم نے ——" وہ ایک لحظے کو رُکا: "تم نے آج تک مجھے ہاتھ تک لگا کر نہیں دیکھا۔ جیسے میں کوئی اچھوت ہوں ——" آخری لفظ کانپتا ہوا اس کے ہونٹوں سے نکلا اور وہ اپنے جذبات کو چھپانے کے لیے ایک دم پلٹ کر دیوار کے ساتھ پڑی چھوٹی سی میز کے برابر جا کھڑا ہوا اور لرزتی ہوئی انگلیوں سے راکھ دانی گھمانے لگا۔ جمال نے بے خیالی سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ باہر برآمدے میں گڈو منہ سے 'زوم —— زوم' کی آوازیں نکالتا ہوا اپنی کتاب کو ہوا میں اُڑاتا پھر رہا تھا۔ کمرے کے آر پار چلتی ہوئی ہوا میں حدت آ چلی تھی۔ نٹ پاتھ پر ابھی تک لڑکے کرکٹ کھیل رہے تھے۔ ریاض کی پولو شرٹ، جو کبھی اس کے جسم پر پھنس کر آتی تھی، اب ڈھیلی ڈھالی اس کی پشت پر لٹک رہی تھی۔ پیچھے سے دیکھنے پر وہ پتلی سی گردن اور اُبھری ہوئی کندھوں کی ہڈیوں والا نوعمر لڑکا دکھائی دیتا تھا۔ اس وقت وہاں کھڑے کھڑے اسے دیکھتے ہوئے جمال کے دل میں اس کے لیے بے پناہ رنج پیدا ہوا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کے برابر جا کھڑی ہوئی۔ وہ دونوں ہاتھ میز پر رکھ کر ذرا سا جھکا، ٹکٹکی باندھے دیوار پر ایک چھوٹی سی تصویر کو، جس پر اس سے پہلے جمال کی نظر نہ پڑی تھی، گھور رہا تھا۔ اب جمال نے دل کر اس تصویر کو دیکھا۔ اس چھوٹی سی پرانی تصویر میں دونوں دوست، شوکت اور ریاض، یونیورسٹی کی کسی عمارت کے برآمدے میں کھڑے تھے۔ دونوں نے ایک سی سفید پتلونیں اور نیلی سلک کی آدھے بازوؤں والی قمیضیں پہن رکھی تھیں اور ایک دوسرے کی گردن میں بازو ڈالے کھڑے کھلکھلا کر ہنس رہے تھے۔ برآمدے کی سیڑھیوں پر رکھے ہوئے گملوں میں بے شمار پھول کھلے ہوئے تھے۔ یہ بہار کا موسم تھا۔ اس کے دل میں درد کی ایک تیز رَو چلی اور سارے بدن کو کاٹتی ہوئی نکل گئی۔ زندگی میں ان دو مردوں سے اس کی نسبت رہی تھی۔ ایک سے اس نے محبت کی تھی اور دوسرے کو عزیز دوست کی طرح چاہا تھا، اور بالآخر دونوں کو وقت نے ضایع کر دیا تھا۔

اب بہار کا موسم اور ہنستے ہوئے نوجوان پھولوں کا زمانہ صرف اس چھوٹے سے بروما ئیڈ پیپر پر منجمد ہو کر رہ گیا تھا اور یاد دلاتا تھا کہ زندگی میں اس نے بہت کچھ پایا تھا مگر بہت زیادہ پانے کی خواہش کی تھی۔ اس نے ریاض کے کپکپاتے ہوئے کندھے پر سر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں اور اس کے دل نے رو کر کہا: "تم کہاں ہو شو کی —— اب تم کہاں ہو؟"

وہ ریستوراں کے ہال میں بیٹھا ساحل کا نظارہ کر رہا تھا۔ ابھی ابھی وہ کھانے سے فارغ ہو کر بیٹھا تھا اور بڈھا بیرا جو اس کا دوست تھا، اس کے آگے سے برتن لے کر گیا تھا۔ ("اب سو مت جانا یہیں پر بابو۔" وہ میز صاف کرتے ہوئے خوش دلی سے بولا تھا اور اس نے جواب دیا تھا: "بس ذرا ہی دیر میں یہاں ٹانگیں پھیلا کر سونے والا ہوں، تم دیکھتے رہو۔" اور بڈھا بے دانت کا منہ کھول کر ہنس دیا تھا۔) اب آسودگی کے ان چند لمحوں میں وہ خوشی سے میز پر انگلیاں بجاتا ہوا باہر سطح سمندر پر ڈولتے ہوئے بگلوں کو دیکھ رہا تھا۔ ہال میں بڑی رونق تھی۔ لوگ ایک ساتھ کھانا کھانے اور باتیں کرنے میں مشغول تھے۔ ایک عجیب سا خواب آلود، دھیما دھیما شور چاروں طرف سے اُٹھ رہا تھا۔ اس نے یکے بعد دیگرے کئی ایک لمبی لمبی جمائیاں لیں۔ اب اسے نیند آ رہی تھی۔

پھر اس وقت ایک عجیب واقعہ ہوا۔ سمندری بگلوں کی ٹولی کی ٹولی پھڑپھڑا کر اُڑی اور پانی کے قطرے موتیوں کی طرح دھوپ میں چمکتے ہوئے ان کے پروں سے اُڑ اُڑ کر سطحِ آب پر گرنے لگے۔ پھر یکایک ان میں کھلبلی مچ گئی۔ اس نے ایک پرندہ دیکھا جو ان کے گرداگرد چکر لگا رہا تھا اور اس ساری افراتفری کا سبب معلوم ہوتا تھا۔ یہ باز کی قسم کا پرندہ تھا جو اس علاقے میں پہلے اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا: 'یہ کہاں سے آیا ہے!' اس نے اچنبھے سے سوچا۔ پھر اچانک اس پرندے نے پر سمیٹ کر گولی کی رفتار سے ہوا میں ایک غوطہ لگایا اور بگلوں کی ٹولی پر جھپٹتا ہوا نکل گیا۔ نازک بدن آبی جانور اپنی چھوٹی چھوٹی آوازوں میں شور مچا مچا کر پاگلوں کی طرح ادھر اُدھر اُڑنے لگے۔ پرندہ پلٹ کر پھر ان پر جھپٹا اور دوسری طرف نکل گیا۔ اتنے فاصلے پر ہونے کے باوجود اس نے صاف طور پر اس کے جھپٹتے ہوئے تیز رفتار سنہری پروں کو اور تیز شکاری آنکھوں کو دیکھا اور اس کے چہرے پہ رنگ اور آنکھوں میں وہ ناچتی ہوئی چمک لوٹ آئی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ ہر دم یورش کرتی ہوئی سبزی مائل زہریلی نیلگوں دھند جیسے دھوپ میں بخارات بن کر اُڑ گئی اور پیچھے سفید رتیلا ساحل اور جھاگ اُڑاتا ہوا سمندر اور ہر طرف پھیلی ہوئی روشن دھوپ اور وسیع و عریض اُجلا آسمان رہ گیا اور فضا کے سنہرے زرد رنگ میں ایک ایک شے بڑی واضح اور روشن اپنی اپنی جگہ پر عین ٹھیک ٹھاک نظر آنے لگی اور اس کا دل جیسے ایک دم ہلکا ہو گیا۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ساری نقدی نکالی اور اسے میز پر رکھ دیا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ اب بگلے کہیں غائب ہو چکے تھے اور پرندہ پلٹنا جھپٹنا چھوڑ کر آسمان پر فتح کے چکر لگا رہا تھا —— "یہ سب تمھارے ہیں۔" وہ بڈھے بیرے کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر خوشی سے بولا: "اب میں جاتا ہوں۔" —— جب وہ ہال کے دروازے سے باہر آیا تو پرندہ اپنے بڑے بڑے پنکھ پھیلائے بڑی آزادی اور لاپروائی سے گہرے پانیوں کی طرف پرواز کر رہا تھا۔ وہ اس پر نظریں جمائے سحر زدہ سا اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔

پھر ڈائننگ ہال میں بیٹھے ہوئے سب مرد و عورت اُٹھ اُٹھ کر دروازوں اور کھڑکیوں پر جمع ہونے لگے۔ خوفزدہ ہاتھوں سے دیواروں اور کھڑکیوں کو تھام کر انہوں نے اسے گھٹنوں گھٹنوں، کمر کمر پانی میں اُترتے ہوئے دیکھا اور دیر تک دم سادھے کھڑے رہے۔

"یا اللہ ——" پھر کسی نے دہشت زدہ آواز میں کہا۔ ہال میں کہیں ایک پلیٹ کے گر کر ٹوٹنے کی آواز بلند ہوئی۔ سب پھر کا سناٹا شدید ہو گیا —— دم بخود ہجوم میں ایک عورت چپکے چپکے سسکیاں لے کر رونے لگی۔

پھول کا بدن
مہاجرین
جلاوطن
ندی
سمندر
دھوپ
رات